ماہنامہ

فاران

کراچی

جلد نمبر:- ۱۳

شمارہ نمبر:- ۳

ایڈیٹر:- ماہر القادری

ماہ جون ۱۹۶۱ سنہ عیسوی

ترتیب

سالانہ چھ روپے

فی پرچہ:- ۵۰ پیسے

مقام اشاعت

دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی

پرنٹر پبلشر:- مسرور حسین

مطبوعہ:- مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

نقشِ اوّل

ہر مسلمان "کتاب و سنت" کے دین میں قطعی حجت ہونے پر ایمان رکھتا ہے اور کتاب و سنت کے احترام و عقیدت سے مسلمانوں کے سینے بحمداللہ معمور ہیں، مگر جہاں تک عمل کا تعلق ہے، ہم میں کتنے ہیں جو کتاب و سنت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں!! ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشوں نے ہم مسلمانوں کو اتنا اُلجھا دیا ہے کہ پوری ملت کی ملت آخرت فراموش بن کر رہ گئی ہے ہر کوئی اپنی دنیا بنانے کے لئے تگ و دو کر رہا ہے اور ہر طرف بڑے شوق اور چاؤ کے ساتھ کھلے خزانے ہوائے نفس کے صنمِ اکبر پوجا کی جا رہی ہے۔

کوئی شک نہیں عمل کا ایمان کے ساتھ بڑا ہی گہرا ربط اور قریبی تعلق ہے مگر ہم اس معاملہ میں خوارج کی طرح متشدد نہیں ہیں، ایک مسلمان سے بہ تقاضائے بشریت بھول چوک ہو ہی جاتی ہے بلکہ بڑے سے بڑا گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے شرک کے سوا ہر گناہ کی مغفرت کی اُمید دلائی ہے، توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، خلوصِ دل کے ساتھ اظہارِ ندامت اور انابت و توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ کا چشمۂ مغفرت صغائر و کبائر سب کو دھو دیتا ہے۔

لیکن

جب قلب پر زین کا اتنا زنگ چڑھ جائے کہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں امتیاز کرنے کی حس ہی سرے سے مردہ ہو جائے یہاں تک کہ نفس کی خواہش سچ مچ "الٰہ" بن جائے تو ایسی صورت میں اس بُت پرستی کا ایمان کے ساتھ کیا زندگی بھر نباہ ہو سکتا ہے؟

عقیدہ و کردار اور فکر و عمل کی اس خرابی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم مسلمان دین کے اصل ماخذ "کتاب و سنت" کے فہمِ صحیح سے بہت دور ہو گئے ہیں، ہمارے عوام تذکرۂ غوثیہ، قصص الانبیاء اور میلادِ اکبر جیسی کتابوں میں اُلجھے ہوئے ہیں اور ہمارے کتنے خواص ہیں جن کو "انا الحق" اور "قم باذنی" جیسی خطرناک شطحیات کی تاویل و تصویب اور فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ کو عرفان و روحانیت کا سرچشمہ ثابت کر دکھانے سے شغف رہا ہے!

اللہ تعالیٰ کے فضل سے لاکھوں مسلمانوں کے سینوں میں قرآن کریم محفوظ ہے، اور قرآن کریم کی اس سینہ بہ سینہ حفاظت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے، ہم مسلمان اپنی تمام بے عملیوں کے باوجود قرآنِ کریم کی تلاوت سے غافل نہیں رہے، اللہ کی کتاب سے اتنا تعلق بھی قابلِ ستائش ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ جو مسلمان قرآن کریم کی تلاوت اُس کے معنیٰ سمجھ کر نہیں کر سکتے، اُن کے لئے قرآن کا پڑھنا اور نہ پڑھنا برابر ہے! قرآنِ کریم کی تلاوت بھی باعثِ ثواب ہے اور اُس کا سماع بھی موجبِ اجر ہے۔

لیکن

اس پر ہم زور دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سمجھ کر پڑھنے ہی کی کوشش کرنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو محض تلاوت کے لئے نہیں بلکہ تلاوت کے ساتھ سمجھنے، سوچنے اور عمل کرنے کے لئے نازل فرمایا تھا، ٹیلیگرام، ریلوے کی بلٹی، دفتر کا کوئی سرکلر انگریزی میں ہوتا ہے تو انگریزی زبان نہ جاننے والے، دوسروں کے پاس جا کر اُس کو پڑھواتے ہیں اور اُس کے مفہوم

و معنی سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، کیا قرآنِ کریم کی آیتیں، ٹیلیگرام، بلٹی اور دفتری سرکلر کے برابر بھی ہمارے لئے کارآمد اور مفید نہیں ہیں کہ ہم اُن کے معنی جاننے اور سمجھنے کی سرے سے کوشش ہی نہ کریں، اور قرآن کے بارے میں صدیاں اسی جہل و لاعلمی کے عالم میں گزر جائیں ——— اور پھر قرآن کی تلاوت کا بھی یہ انداز ہو کہ نہ تو جنت کی نعمتوں کے ذکر پر دل میں مسرت کی لہر پیدا ہو اور نہ جہنم کے عذاب کے بیان پر خشیت کی کیفیت طاری ہو، نہ پلکیں نم ہوں نہ دل کو جنبش ہو، نہ چہرہ تمتمائے نہ تیوروں سے بیم و رجا کی کوئی کیفیت ظاہر ہو، صدیاں گزر چکی ہیں کہ ہم مسلمان قرآن کریم کے گراموفون بننے پر قناعت کئے ہوئے ہیں اور اپنی اس حالت پر مطمئن ہیں۔

قرآن کریم کے مفہوم و معنی کی دُوری نے یہ روزِ بد دکھایا ہے کہ مسلمانوں میں عقیدہ کی طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن میں سے بعض خرابیاں، کھلی ہوئی گمراہی بلکہ "شرک" کی حد تک پہونچی ہوئی ہیں۔

قرآن کے معنی اور مفہوم کو سمجھ کر تلاوت کرنے سے قلب میں یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے "کُن فیکون" پر یقین عہدِ الست پر یقین، حشر و نشر پر یقین، قیامت اور سزا و جزا پر یقین حضرت عیسٰی علیہ السلام کی باپ کے بغیر معجزانہ ولادت ہو یا آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کا واقعہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج ہو یا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھڑکتی ہوئی آگ کے سرد ہو جانے کا قرآنی بیان، اس قسم کے کسی واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کو سمجھ کر تلاوت کرنے والے کے دل میں شک پیدا نہیں ہوگا۔

جبر و قدر اور خیر و شر کے موضوع پر اہلِ علمِ کلام کے درمیان کیسے کیسے معرکے رہے ہیں، مگر قرآنی فہم اس موضوع کے مباحث میں اُلجھنے اور بحث کرنے سے اجتناب کرے گی کہ جس اللہ نے خود کو "علیٰ کل شیءٍ قدیر" فرمایا ہے، وہی یہ فرماتا ہے کہ انسانوں کے اعمال پر محاسبہ بھی کیا جائے گا اللہ تعالیٰ کے ان دونوں قولوں میں نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کسی قسم کا کوئی ابہام اور ذو معنویت ہے! دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں! اللہ تعالیٰ کے کسی ارشاد کی حکمت اور قول کی کُنہ سمجھ میں نہیں آتی تو یہ ہماری فہم کا نقص ہے، جو بندہ اپنے آقا اور مالک کے حکم میں چون و چرا اور موشگافیاں کرتا ہے اُس کی بندگی خام اور نا پختہ ہے، بندہ کا فرض اپنے آقا کے حکم پر پورے اطمینان و یقین اور انشراحِ قلب کے ساتھ آمنا و صدقنا کہنا اور اُس پر عمل کرنا ہے۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کے دُکھ درد کو دور نہیں کر سکتا، وہی قاضی الحاجات اور مُشکل کُشا ہے! وہی سب کا داتا اور پالن ہار ہے، کائنات کے کارخانہ کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ اور حکمتِ بالغہ کسی کی مدد اور شرکت کے بغیر چلا رہی ہے، قرآن کریم میں کہیں بھی اس کا ذکر اور اشارہ تک نہیں ہے کہ کسی ولی نے وفات پائے ہوئے نبی کی رُوح سے استغاثہ کیا ہو۔ قرآنِ کریم کی دعاؤں میں کسی کے وسیلہ اور حُرمت کے بغیر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کی تلقین فرمائی گئی ہے، اس لئے قرآن کریم میں غور و تدبر کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی مقدس روح سے استغاثہ کرے گا اور نہ کسی ولی اور نبی کے نام کی دہائی دے گا!

پچھلی امتوں کو عقیدت کے غلو نے تباہ کیا کہ انھوں نے "مجاز و عطا" کے پردے میں اپنے بزرگوں، نبیوں اور ولیوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا ڈالا۔ قرآنِ کریم شرک و بدعت کے اس فلسفہ کی نفی و تردید کرتا ہے، قرآنِ کریم میں تفکر و تدبر کرنے والا انبیاء کرام کی بشریت کے بارے میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں کر سکتا، وہ انبیاء کرام کو مرتبہ کے اعتبار سے تمام انسانوں

افضل و برگزیدہ تسلیم کرے گا مگر جہاں تک "انسانی نوع" کا تعلق ہے وہ نبیوں اور رسولوں کو بھی اسی نوع کے افراد میں شامل اور شمار کرے گا، اور اُن کو بشر کہتے ہوئے کسی قسم کی جھجک اور ہچکچاہٹ اُس کے اندر پیدا نہ ہوگی کہ خود قرآنِ کریم کسی قسم کے ذرہ برابر اشتباہ وابہام کے بغیر انبیاء کرام کی بشریت کا اعلان کرتا ہے!

قرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ جہاں تک عصمت کی تنزیہہ کامل کا تعلق ہے، ایسی عصمت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے، انبیاء کرام کوئی شک نہیں معصوم ہوتے ہیں مگر کبھی کبھار سہو و نسیان اُن سے سرزد ہو سکتا ہے، انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے ہیں، اُس کے ہم نشین، ندیم اور مشیر و مددگار نہیں ہیں، اور نہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے رتبہ میں اُنیس بیس کا فرق ہے، عبد اور معبود کے رتبہ اور درجہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ مشابہت، مناسبت اور مماثلت بھی نہیں ہے! سبحان اللہ عما یصفون۔

انبیاء کرام اپنے تمام مجد و شرف عزت و مکرمت اور عصمت و تقدیس کے باوجود بندے تھے اور بندہ کا صاحب احتیاج ہونا لازمی اور ضروری ہے اس لئے انبیاء کرام اور مرسلین عظام بھی اللہ تعالیٰ کے محتاج اور اُس بارگاہ کے فقیر تھے بندگی کا جتنا عجز انھوں نے پیش کیا ہے، اتنا عجز کوئی دوسرا پیش نہیں کر سکتا، ہر آن اللہ تعالیٰ کی خشیت قلب پر طاری اور عبد شکور کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ عبادت کی سعی اور شغف و انہماک!

آغازِ انسانیت کے بعد جس پہلے حادثہ کا قرآنِ کریم میں ذکر ہے وہ حضرت آدم علیہ السلام کو شیطان کے بہکانے کا قصہ ہے، اگر حضرت آدم کو علم غیب ہوتا اور وہ دلوں کے بھید جانتے ہوتے تو ابلیس بھلا اُن کو دھوکا دے سکتا تھا، یہ واقعہ اور دوسرے انبیاء کرام کے متعدد واقعات جن کی قرآن کریم خبر دیتا ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ ہم نے بعض نبیوں کے حالات تم کو بتا دیئے ہیں، اور بعض کے نہیں بتائے ان پر جس کی نظر ہوگی وہ بھلا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا رسول کے غیب داں ہونے کو درست تسلیم کرتا ہے!

قبروں سے فیض و استفادہ اگر دین میں مطلوب و مستحسن ہوتا تو قرآنِ کریم میں اس کا کہیں تو ذکر آتا، قرآن کریم کسی نبی اور رسول کی قبر تک کی نشان دہی نہیں کرتا، وفات پائے ہوؤں کے لئے دعائے مغفرت اور حصولِ عبرت کے واسطے قبروں کی سیدھی سادی زیارت کو لوگوں نے جن خطرناکیوں اور کھلی ہوئی زیادتیوں تک پہونچا دیا ہے، وہ نتیجہ ہے قرآن کریم کے مفہوم و منشاء سے دوری اور بے پروائی کا!

قبریں اگر دینی اور دنیوی فیض و استفادہ کا ذریعہ ہوتیں، تو کم سے کم مکہ معظمہ میں جو انبیاء کرام دفن ہیں اُن کی قبروں کی قرآن پاک یا حدیث رسول میں نشاندہی کی جاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشفِ قبور کے معجزے یا وحی کے ذریعہ انبیاء کرام کی قبروں کے مٹے ہوئے نشانات کو اُبھارتے، اُن پر قبے اور گنبد بنائے جاتے وہاں چراغاں ہوتا اور سال کے سال عرس اور فاتحہ خوانی ہوا کرتی، قرآن و سنت سے "قبور" کے بارے میں اس فلسفہ اور نظام کی ذرہ برابر تائید نہیں ہوتی، اسلام کا توحید شناس مزاج ان بدعات و خرافات کو گوارا نہیں کر سکتا ——— قبروں پر جو شاندار گنبد اور قبے بنائے گئے ہیں، عرس و چراغاں اور عود و گل کے مصارف کے لئے جو جاگیریں دی گئی ہیں اور جو روزینے مقرر کئے گئے ہیں، یہ بادشاہوں کی نکالی ہوئی بدعتیں ہیں! افسوس ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ان "سئیات" کو مسلمانوں نے "حسنات" سمجھ لیا ہے کوئی خدا کا بندہ انہیں کتاب و سنت اور اسوہ صحابہ کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ اس پر وہابیت اور بے دینی کی پھبتی چست کرتے ہیں، مسلمان اگر قرآن کریم میں فکر و تدبر کریں تو اُن پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ کتنی ناپسندیدہ رسمیں ہیں جن کو "دین" سمجھ لیا گیا ہے ——— قرآنی فکر قبروں کی آرائش و تعمیر سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتی۔

تاج محل ہو یا ہمایوں اور جہانگیر کے مقبرے، قرآنی فکر اس اسراف کو گوارا نہیں کر سکتی کہ قبروں کی تعمیر پر لاکھوں اور کروڑوں روپیہ صرف کیا جائے، تعمیر قبور کے منصوبے اور پلان قرآن کریم کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہیں۔

قرآن کریم میں غور و فکر کرنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بارے میں "منصوص" ہونے کا عقیدہ رکھے گا ——— یہ کہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ معیارِ حق ہے اور حضورؐ کی اطاعت سے باہر ہونا، اللہ کے دین کے دائرے سے باہر ہونا ہے، یہ کہنا کہ حضورؐ کی دنیوی حیات تک آپ کی اطاعت فرض تھی، وفات پا جانے کے بعد اس اطاعت کا حکم بھی ختم ہو گیا ——— (معاذ اللہ) یہ عقیدہ صریحی کفر ہے۔ جو کوئی قرآن فہمی کے دعوے کے ساتھ اس کفریہ عقیدہ کو پیش کرتا ہے اس کے قلب پر شیطان اس بری طرح چھایا ہوا ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ سے اسے ہدایت کے بجائے ضلالت میسر آتی ہے۔

قرآن کریم ہی یہ بتاتا ہے کہ نزاعی مسائل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ قرآن کریم کے اسی حکم کے عین مطابق جمہور امت کا یہ عقیدہ ہے کہ "کتاب و سنت" دین کا اصل ماخذ اور اساس ہیں اور کتاب اللہ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی دین میں حجت ہے!

قرآن کریم کی ہدایت کے تحت کتاب و سنت کو دین میں حجت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو معیارِ حق تسلیم کرنے کے بعد، ہر بڑے سے بڑے بزرگ کے قول و عمل کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے، اور جس کے بھی قول و عمل کی کتاب و سنت سے تائید و مطابقت نہ ہوتی ہو اسے چھوڑنے میں دین کا ذرہ برابر زیان و ضرر نہیں ہے ———!

کتاب و سنت اور حاملین کتاب و سنت یعنی وحی الٰہی کے مخاطبین اول، صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اسوہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ اور رسول کے بعد کسی شخص کو بھی یہ دینی منصب نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی رائے یا اجتہاد پر "نص" کی طرح عمل کیا جائے اور کسی مجتہد کے اجتہاد پر کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کو ترجیح دینے سے دین و ایمان کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ایمان کی پختگی کا یہ ثبوت ہے کہ جس کسی کے قول و اجتہاد کو کتاب و سنت کے مطابق اور اقرب پائے، اُسی کو اختیار کرے! فقہی مسائل میں تقلید نہ شرک ہے نہ واجب ہے، فقہ کے ائمہ اور مجتہدین کے تفقہ پر اعتماد کا نام تقلید ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی مجتہد کے اجتہاد کو چھوڑ کر دوسرے امام و مجتہد کے اجتہاد کو تسلیم کرنے سے "دائرۂ تقلید سے باہر ہونے کا گناہ سرزد ہوتا ہے، ایسا کرنا کتاب و سنت کی رُو سے نہ کوئی گناہ ہے اور نہ دین و ایمان کے نقصان کا موجب ہے۔

اولیاء اللہ سے عداوت کی جو وعید حدیث نبویؐ میں آئی ہے، اُس کی زندہ مثال روافض ہیں جو جمہور صحابہ سے اور خوارج ہیں جو حضرت علی اور چند صحابہ سے عداوت رکھتے ہیں اور ان نفوس قدسیہ کو (خاک بدہن گستاخ) گمراہ سمجھتے ہیں! علمی طور پر کسی فقیہ، محدث اور صوفی و مشائخ سے اختلاف کرنے پر "عداوت اولیاء" کی وعید کا انطباق نہیں ہو سکتا! حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے متعدد مسائل میں جو اُن کے قابلِ فخر شاگردوں نے اختلاف کیا تھا تو یہ اختلاف امام ابو حنیفہ سے دشمنی نہ تھی بلکہ دین کی خیر خواہی تھی، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو "وحدت الوجود" کے فلسفہ کو رد فرمایا تھا تو اس کو جو کوئی صوفیاء اور اولیاء کی عداوت سے تشبیہ دیتا ہے وہ عقیدت کے اُس غلو میں مبتلا ہے، جس کو دین میں ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے، جس کسی خدا کے نیک بندے نے یہ کہا کہ صوفیا کے اشغال اور رسموں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، تو اس نے اس حقیقت کا اظہار کر کے اولیاء اللہ کے ساتھ نہ تو ذرہ برابر زیادتی کی اور نہ اُن کے رتبہ کو گھٹایا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد حضرت سلطان نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کمال درجہ کی عقیدت

رکھتے تھے مگر سماع میں اپنے شیخ کی تقلید نہیں کرتے تھے کہ ان کی تحقیق میں قوالی و سماع اور رقص و حال کی کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہ سے تائید و مطابقت نہیں ہوتی تھی، بزرگانِ دین سے عقیدت اور حسنِ ظن ہی رکھنا چاہیئے لیکن کتاب و سنّت کے تحفظ کی غیرت اور ایمانی جرأت پر اس عقیدت نے غلبہ پالیا، تو پھر طرح طرح کی مغزتوں کو ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

——— پس ———

"انا الحق" ہو، "احمد بے میم" کی نکتہ آرائی ہو، وحدت الوجود کی موشگافیاں ہوں، "تصورِ شیخ" ہو، "غوث" اور "قیوم" کے القاب و مناصب ہوں۔ طریقت کے شجروں کے پڑھے جانے کا معمول ہو، قبروں پر اعتکاف ہو، ختم بخاری ہو یا اسی قبیل کے دوسرے افسانے اور لطائف ہوں، اُن پر نکیر کرنا "کتاب و سنّت" کی بہت بڑی خیر خواہی ہے، اس ایمانی جرأت کا مظاہرہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور اس سلسلہ کو جاری رہنا چاہیئے — اظہارِ حق نہ کسی سے عداوت ہے اور نہ اس کو دل آزاری کہا جا سکتا ہے۔

اظہارِ حق بہت سے خطروں کو دعوت دیتا ہے، سچی بات کہنے والے کو سب سے پہلے اپنی شخصیت اور مقبولیت کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس کی تعریفیں کرنے والے، اپنے مسلک کے خلاف باتیں سُن کر، گالیاں دینے لگتے ہیں! اس آتشیں امتحان سے ہمیں بھی گزرنا پڑ رہا ہے، مگر اپنی تمام بداعمالیوں اور نفس کی دراز دستیوں کے باوجود جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں، اُس کے اظہار سے کوئی خوف یا ہماری ذات و شخصیت کا کوئی بڑے سے بڑا نقصان ہمیں باز نہیں رکھ سکتا ——— اللہ تعالیٰ ہمیں اظہارِ حق کی ایسی توفیق عطا فرمائے جو ملت کے لئے اور دین کے لئے ہر حیثیت سے مفید ہو!

ماہر القادری

۳۱ مئی ۱۹۶۷

ماہر القادری

اقبال

کارواں خواب میں تھا بانگِ درا سے پہلے
ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے

اللہ اللہ! ترا قافلۂ نطق و کلام
بالِ جبریل کے سائے میں ہوا گرم خرام

تو کبھی شعلۂ رقصاں، کبھی رفتارِ نسیم
موجِ کوثر ترے اشعار کہیں ضربِ کلیم

اک نئی طرز، نئے باب کا آغاز کیا
شکوہ اللہ تعالیٰ سے بصد ناز کیا

حسن والفت کے فسانوں میں ہوس شامل تھی
تو نے تقدیس عطا کی انھیں عصمت بخشی

چہرۂ فکر و معانی کو نکھارا تو نے
زلفِ دوشیزۂ اردو کو سنوارا تو نے

نفسِ گرم سے غنچوں کی گرہ کھولی ہے
شبنمِ گل میں محبت کی شکر گھولی ہے

تیرے افکار کی گرمی سے ہے آہن بھی گداز
تیری حکمت، ترے پیغام کی ہو عمر دراز

تو نے ہر گام پہ کچھ نقشِ وفا چھوڑے ہیں
تو نے تہذیبِ فرنگی کے صنم توڑے ہیں

می چکد کوثر و تسنیم ز گویائی تو
شعر خود گشت طلب گار و تمنائی تو

تیرے شعروں میں کہیں معرکۂ بدرؓ و حنینؓ
کہیں ایمانِ براہیمؑ، کہیں عزمِ حسینؓ

اس لئے ہے تری اک اک مجھے بات قبول
تیرا سرمایۂ دانش تھا فقط عشقِ رسولؐ

تو کہ لندن کی بھی راتوں میں سحر خیز رہا
غیر ماحول میں خود دار و کم آمیز رہا

اس قدر خوفِ خدا، سوزِ دروں، جذبۂ حق
بھیگ جاتے تھے ترے اشک سے قرآں کے ورق

علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ
کس نزاکت سے ہم آغوش کئے شیشہ و سنگ

فکرِ افسردہ کو پرواز عطا کی تو نے
لبِ خاموش کو آواز عطا کی تو نے

تسکین قریشی

نوائے تسکین

ہر چند تمنا و طلب کچھ بھی نہیں ہے!
بے چین ہے دل اور سبب کچھ بھی نہیں ہے

سب ٹوٹ گئے زندگی دل کے سہارے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ اب کچھ بھی نہیں ہے

ساقی ترے پیمانے میں کیا کچھ نہیں لیکن
جب ہو نہ کوئی سوزِ طلب کچھ بھی نہیں ہے

٭ مجو حضرت جگر کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہو کر

بے نور اگر دل ہو تو کیسی رہ و منزل — یہ شوقِ سفر، جوشِ طلب کچھ بھی نہیں ہے
محفل سے الگ شاہدِ محفل کی طرف دیکھ — جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب کچھ بھی نہیں ہے

پایانِ طلب یہ ہے کہ تسکینِ طلب اپنی
جز حسرتِ توفیقِ طلب کچھ بھی نہیں ہے

———•••———

عروج زیدی بدایونی

افکارِ عروج

مری طرح بھی کوئی وقفِ اضطراب نہ ہو — وہ سامنے ہوں مگر دیکھنے کی تاب نہ ہو
امیدوارِ کرم ! شاکیٔ عتاب نہ ہو — اسی غبار کے پردے میں آفتاب نہ ہو
شباب کیا ہے اگر مستیٔ شباب نہ ہو — رگوں میں خون تو ہو خون میں شراب نہ ہو
ترے حضور بہ عنوانِ شوق لایا ہوں — وہ اک سوال جو شرمندۂ جواب نہ ہو
تجھے بھلانے کی تدبیر کر رہا ہوں میں — خدا کرے مری تدبیر کامیاب نہ ہو
ہمارے حسنِ نظر سے ہے اعتبارِ جمال — جمال کیا ہے اگر حسنِ انتخاب نہ ہو
فضا میں گونج رہی ہے صدا "میں تیرا ہوں" — یہ بازگشت کی آواز ہی جواب نہ ہو
ہزاروں ٹھوکریں کھا کر ملا ہے کوچۂ دوست — اب اس کے بعد کوئی اور انقلاب نہ ہو

اگر نگاہِ محبت ہو پاک باز عروج!
تو حسن پر کوئی پابندیٔ نقاب نہ ہو

———•••———

محمود سرحدی

مطائبات

پکارنے کا قرینہ ہیں سوچتا ہی رہا — حسین ہے کہ حسینہ میں سوچتا ہی رہا
دمِ وداع نمی سی تھی ان کے آنچل پہ — یہ اشک ہیں کہ پسینہ میں سوچتا ہی رہا

———•••———

ترجمہ :۔ عبدالحمید صدیقی (ایم ۔ اے)

رُوحِ انتخاب !

آپ سے قبل کہ میں ایمان باللہ کی عقلی توجیہات پر بحث کروں، یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا ایمان میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہے ، ذاتی تجربے پر مبنی اعتقادات کو بے وقعتی کی نگاہوں سے دیکھنا ، اُنہیں غیر عقلی سمجھنا کوئی مستحسن اقدام نہیں کیوں کہ ایسے اقدامات سے سائنٹیفک طریقِ فکر کی بے وقعتی ہوتی ہے ، بلکہ ایسے اعتقادات کو فوق الاستدلال اور فوق العقل قرار دینا چاہیئے ۔۔۔۔ !

اگرچہ ابتدائی سالوں میں خدا تعالےٰ کے بارے میں میرا علم سراسر تعقل پر موقوف تھا لیکن اب خود میرا دل اس ذات کے وجود کی گواہی دینے لگا ہے اور اس نے عقلی واستدلالی شواہد کو میری نظر میں غیر اہم بنا دیا ہے ، مشاہدے سے لطف اندوز نہ ہونے والوں کے لئے یہ تجربات ناقابلِ یقین بلکہ ناقابلِ فہم ہوں تو ہوں ، لیکن مشاہدے سے متمتع افراد انہیں بالکل معقول خیال کرتے ہیں ۔ میں نے یہ معلوم کیا ہے کہ مسیح کا خدا ہی صرف ایسی ذات ہے جو انسانی رُوح کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے ۔

آگسٹین کے بقول :۔

”تو نے ہمیں اپنے لئے تخلیق کیا ہے ۔ ہماری رُوحیں اُس وقت تک
بے قرار رہتی ہیں جب تک تیرا وصل انہیں سکون سے آشنا نہ کر دے“

اب اختصار کے ساتھ میرے اعتقادات کی عقلی واستدلالی بنیادوں کا بیان بھی سُن لیجے ۔ میں شروع میں ایک سادہ سی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں ، وہ یہ کہ ہر خاکہ ایک خاکہ ساز ، ہر نقشہ ایک نقشہ ساز اور ہر منصوبہ ایک منصوبہ ساز کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے اور یہ بہت ہی سادہ سی حقیقت ہے ، جس کی تائید انجینیری کے تجربات نے بھی کی ہے ۔ سالہا سال کا تجربہ جو مشینوں اور بجلی کے مختلف کاموں کی منصوبہ بندی کی بنا پر مجھے حاصل ہوا ہے مجھے اس امر پر مجبور کر دیتا ہے کہ جہاں کہیں عمدہ نقشہ ، خاکہ یا منصوبہ دیکھنے میں آئے ، اس کی تعریف و تحسین کی جائے ۔ اس پس منظر کے ہوتے ہوئے میرے لئے یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ ہمارے ارد گرد جو خوب صورت نقشہ یا منصوبہ موجود ہے وہ کسی نقشہ ساز اور منصوبہ ساز کے بغیر ہی عالمِ وجود میں آگیا ہو ۔ یہ دلیل پرانی تو ہے لیکن جدید سائنس نے اس کو از سر نو قوت اور تازگی عطا کی ہے ۔

ایک انجینیر ربط و تنظیم کی تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکتا ، وہ ان مشکلات کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے جو کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آتی ہیں ۔ وہی منصوبے کے حسن کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے کیوں کہ اُسے خود ایسے کام سے سابقہ پیش آتا ہے

چند سال پیشتر مجھے بجلی سے کام کرنے والی ایک ایسی مشین کا خاکہ بنانا تھا جو سُرعت کے ساتھ مساوات کے مشکل سوالات حل کر سکتے ۔ یہ مشکل مسئلہ ایک ایسی خود کار مشین کی ایجاد سے حل کر دیا گیا جواب تک بیل ٹیلیفون لیبارٹریز اور ... [illegible] کے دفتر میں کام دے رہی ہے ۔ اس مشین پر سال دو سال کام کرنے کے بعد اور اس کی مدد سے خاکہ سازی و منصوبہ سازی کے مسائل حل کرنے

کے بلیے میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسی عمدہ مشین ایک کارفرما ذہن اور منصوبہ ساز کے بغیر وجود میں آسکتی ہے۔

ہمارے ارد گرد ربط و تنظیم و منصوبہ سازی کا وسیع نمونہ کائنات کی صورت میں پھیلا ہوا ہے جو ہر پابندی سے آزاد بھی ہے اور ایک دوسرے سے مربوط بھی، اور میرے ایجاد کردہ "کہربائی دماغ" سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اگر میری تیار کردہ کہربائی مشین کو ایک موجد و مدبر کی ضرورت تھی، تو میری جسمانی مشین جس میں نباتیاتی، طبیعاتی اور کیمیاوی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں، بطریق اولیٰ ایک بہترین خاکہ ساز اور منصوبہ ساز کی محتاج ہے۔

نقشہ، منصوبہ، انتظام جو نام بھی اس کو دے دیا جائے، دو ہی اسباب سے معرضِ وجود میں آتا ہے، اتفاق سے یا منصوبہ بندی سے۔ اس کے نظم و ربط میں جتنی زیادہ پیچیدگی ہوگی، اتنا ہی بحیثیت اتفاق کا عمل دخل اس میں کم ہوگا۔ ہم جس طرح کے منصوبے اور تنظیم کے درمیان اپنے آپ کو محصور پاتے ہیں، وہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں چھوڑتا کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں۔

دوسرا نکتہ جو یہاں بیان کیا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ کائنات کی منصوبہ بندی کے لئے ایک ایسا منصوبہ ساز درکار ہے جو فوق الفطرت ہو۔ میرا ایمان ہے کہ خدا فوق الفطرت ہے کیوں کہ ماہر طبیعات کی حیثیت سے مجھے ایک فوق الفطرت "علتِ اولیٰ" پر لازمی طور پر ایمان لانا پڑتا ہے، میرا فلسفہ مجھے فوق الفطرت پر اس لئے یقین کرنا سکھاتا ہے کہ وہ طبیعی حواس مدرکہ سے محسوس نہیں کیا جاسکتا اور اس لئے اس کا انکار کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جدید طبیعات نے مجھے بتایا ہے کہ فطرت خود اپنی تنظیم سے قاصر ہے۔

سر اسحاق نیوٹن نے دریافت کیا تھا کہ کائنات ربط و تنظیم سے ہٹ کر بے ربطی اور بد نظمی کی طرف جا رہی ہے اور ایک مساوی درجۂ حرارت کی طرف بڑھ رہی ہے اور انہی تصورات کی بنا پر اسے ایک تنظیم کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ حرارت کے مطالعے نے اس احساس کو یقین کی حد تک پہنچا دیا۔ اسی مطالعہ کی بدولت اس نے میسر آنے والی طاقت اور غیر میسر طاقت کے مابین امتیاز کیا ہے اور اس بات کا کھوج لگایا ہے کہ ہر تبدیلی میں حرارت کی ایک خاص مقدار غیر میسر حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن غیر میسر حالت سے میسر حالت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

بولٹزمین اس خاص پہلو سے دلچسپی لینے لگا اور اس نے ماہر ریاضی کی تمام صلاحیتوں کو کام میں لا کر بتایا کہ اس طرح کے تغیرات سے طبیعاتی طور پر ایک بے ربطی اور بد نظمی کے وجود کا احساس ہوتا ہے جہاں تک حرارت کا تعلق ہے میسر طاقت کا غیر میسر حالت میں منقلب ہونا مادے کے ذرات میں عدم ربط و تنظیم کا کافی ثبوت بن جاتا ہے۔ سہل ترین لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اس مشہور سائنس دان کے نظریے کا مطلب یہ ہے کہ فطرت خود بخود تدبیر و منصوبہ سازی نہیں کر سکتی، کیوں کہ ہر تبدیلی کے وقت ایک منصوبہ میں کمی آجانے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ ربط و تنظیم سادہ کی نسبت پیچیدہ اور پیچیدہ تر تو ہو سکتی ہے، لیکن کسی دوسری جگہ بے ربطی و بد نظمی پیدا کرنے کے بعد۔

یہ کائنات تنظیم و ربط کا بہت بڑا مجموعہ ہے، اس لئے ایک ایسی "علتِ اولیٰ" کی ضرورت ہے، جو مذکورہ بالا قانون تبدیلی سے متاثر نہ ہو اور وہ ہی فوق الفطرت ذات ہے اور وہی خدا ہے۔　　(کلاڈ، ایم ہیتھ دے، انجینیر)

دوسروں کی نظر میں!

> "نظریۂ پاکستان نمبر" پر ملک کے ہر گوشے سے ہمیں بیسیوں خطوط موصول ہوئے۔ الحمد للہ کہ اپنی چند خامیوں کے باوجود یہ نمبر بہت کامیاب رہا۔ چند آراء ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔
>
> ایڈیٹر (چراغ راہ)

جسٹس محمد شریف، صدر آئین کمیشن پاکستان

"چراغ راہ کا نظریۂ پاکستان نمبر موصول ہوا، شکریہ قبول فرمائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا پرچہ آئین کمیشن کے تعمیری کام میں ممد ثابت ہوگا۔"

قدرت اللہ شہاب، جنرل سیکرٹری ٹو صدر پاکستان

"اس نمبر کا ابھی پورا مطالعہ تو نہیں کر پایا لیکن مضامین کے تنوع کے اعتبار سے یہ شمارہ کافی ہمہ گیر نظر آتا ہے۔"

ڈاکٹر سید عبد اللہ، صدر شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور

"اس نمبر کے مطالعہ سے مجھے بڑی مسرت ہوئی، آپ نے بہت عمدہ معلومات افزا اور نتیجہ خیز نمبر نکالا ہے۔ میں اس کوشش پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر جاوید اقبال، بار ایٹ لا (لاہور)

"دل چاہتا ہے کہ آپ کی اس جد و جہد اور مخلصانہ کوشش پر آپ کو مبارک باد دوں۔ شمارہ شروع سے لے کر آخر تک پڑھنے کے لائق ہے۔ انشاء اللہ اس سے ضرور استفادہ حاصل کروں گا۔"

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

"آپ کی بلند ہمتی کی داد دیتا ہوں کہ خاص نمبروں کی شکل میں ایسی محققانہ ضخیم تصانیف مرتب کر دیتے ہیں۔"

ماہر القادری مدیر فاران کراچی

"ماہنامہ چراغ راہ" کے نظریہ پاکستان نمبر" کا بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔ اس کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی اس کی بہت دھوم تھی۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ شمارہ خاص توقع سے بڑھ کر کام یاب نکلا۔ مضامین میں تنوع بھی ہے، گہرائی اور بلندی بھی ہے، پھر سب سے بڑھ کر مقصد کی افادیت! ایک سے ایک بڑھ کر مضمون! لکھنے والوں میں بہت سے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ہر مضمون نگار علم و ادب کے اعتبار سے کسی نہ کسی قابل لحاظ خصوصیت کا حامل ہے۔ پاک و ہند کے شاید ہی کسی رسالہ اور اخبار کو اتنے بلند پایہ مضامین نگار میسر آئے ہوں۔ مضامین کی ترتیب میں بھی بڑا سلیقہ اور خوش ذوقی پائی جاتی ہے۔ بعض مستشرقین کے مضامین کے تراجم بھی اس میں شامل ہیں۔ جہاں جہاں ان حضرات کے قلم نے اسلام کے بارے میں نیش زنی کی ہے جناب خورشید احمد نے ہاتھ کے ہاتھ اس کا ازالہ بلکہ مداوا بھی کر دیا ہے!

"نظریہ پاکستان نمبر" کام یاب ترین دینی پیش کش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مرتبین کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ نمبر شائع کر کے دین کی، ملت کی اور پاکستان کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے! یہ بہت بڑا تعمیری کام ہے جو ان کی کوشش سے پورا ہوا ہے!

(فاران۔ فروری ۱۹۶۱ء)

م۔ش۔ ایڈیٹر اقدام۔ لاہور

"اس اشاعت کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اسلامی نظریہ کی تشریح و توضیح ہے اور اس میں نظریہ پاکستان کی فکری اور نظری بنیادوں کو شرح و بسط سے پیش کرنے کی کام یاب کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں وہ مقالات ترتیب دیئے گئے جن کا تعلق ہماری تاریخ سے ہے۔ ان مقالات میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر قیام پاکستان تک کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ ہمارے ماضی کا آئینہ ہے اور اس میں تحریک پاکستان کے تمام اہم پہلوؤں کو قوم کے سامنے ایک بار پھر پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں "پاکستان اور اسلامی نظریہ" کے موضوع پر ایک مذاکرہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ملک اور بیرونی ملک کے چوٹی کے اہل قلم حضرات نے حصہ لیا ہے۔ آخری حصہ تاریخی دستاویزات پر مشتمل ہے اس میں وہ تحریریں پیش کی گئی ہیں جنھوں نے اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا تھا۔

لاریب یہ پرچہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس کے مطالعے سے ہماری نئی نسل جو بد قسمتی سے پاکستان کی جدوجہد سے کماحقہ واقف نہیں اپنے رہنماؤں کی عظیم قربانیوں کی صحیح تصویر دیکھ سکتی ہے۔"

(اقدام۔ ۸ر جنوری ۱۹۶۱ء)

ترجمان القرآن۔ لاہور

"ماہنامہ "چراغ راہ" کا یہ خاص نمبر اپنے سابقہ نمبروں کی طرح سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین میں خاصا تنوع ہے لیکن ان سب میں یہ چیز ضرور مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ پاکستان کا اساسی تخیل صرف اسلام ہی ہے......

ہماری نظر میں

فقہ السنّہ از: - محمد عاصم، ضخامت ۴۰۸ صفحات، سفید چکنا کاغذ، جلی کتابت، مجلد، رنگین گرد پوش،
قیمت: - آٹھ روپے، ملنے کا پتہ: - مکتبہ چراغ راہ، کراچی -

اس گرانقدر کتاب پر فاضل مصنف و مرتب نے جو مقدمہ لکھا ہے، اُس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔
"متن میں وہ مسائل دیئے گئے ہیں، جن پر حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور جمہور اہل حدیث کا اتفاق ہے، یا پھر کم از کم ان مذاہب خمسہ کی اکثریت کا ان پر اتفاق ہے، اور مذاہب کا اختلاف، اگر کوئی ہے، تو اس کی تفصیل حاشیہ میں دے دی گئی ہے"

"جن مسائل میں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ اور اہل حدیث علماء کا مسلک الگ الگ ہے، ان کا ذکر متن پر نوٹ دے کر حاشیہ میں کیا گیا ہے"

"ہر مسئلہ میں ہر مسلک کے متعلق یہ کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن اور حدیث سے اس کی بنیاد کا ذکر کیا جائے بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ اگر دوسرے مسلک والوں کی بنیاد کسی دوسری آیت یا حدیث پر ہے، تو یہ اختلاف کیوں ہے اور دونوں قسم کی آیتوں اور حدیثوں کے متعلق ہر ایک کی کیا رائے ہے؟"

"ہر مسئلہ میں تمام مذاہب کے نقل کرنے سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کے موجودہ مسلکوں سے ہٹا کر انہیں کسی خاص مسلک کی طرف دعوت دی جائے، بلکہ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے، خواہ وہ کسی مسلک سے تعلق رکھنے والے ہوں جہاں اپنا مسلک اور اس کا ماخذ معلوم کریں وہاں انہیں دوسرے مسالک اور اُن کے ماخذ کا بھی علم ہو تاکہ اس طرح ان کے دلوں میں فراخی اور رواداری پیدا ہو کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں میں جو جمود، تعصب اور تنگ نظری اس وقت پائی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص صرف اپنے ہی مسلک کو جانتا اور کچھ نہ کچھ اُسی کے مسائل سے واقفیت رکھتا ہے، اس لئے وہ غیر شعوری طور پر اپنے ماسوا دیگر تمام فقہی مسلکوں کو بے بنیاد خیال کرتا اور بسا اوقات ان کے ماننے والوں کی نیتوں تک پر حملہ کر جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیتی"۔

"فقہ کے بہت سے مسائل میں سلف کے درمیان اختلافات پائے گئے ہیں، لیکن اول تو اس قسم کے مسائل کی تعداد جیسا کہ آپ کو یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوگا، ان مسائل کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے، جن میں تمام یا اکثر ائمہ سلف کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے"

"پھر یہ اختلافات ہرگز اصولوں اور بنیادوں میں نہیں بلکہ فروع اور جزئیات میں ہیں، اور وہ بھی زیادہ تر ان جزئیات میں، جن کی بنیاد قرآن یا حدیث پر نہیں بلکہ ائمہ کے اجتہاد و قیاس پر ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں اختلافات کا پایا جانا نہ تعجب انگیز ہے اور نہ عقل و فطرت کے خلاف ہے۔۔۔"

"باقی رہے ان مسائل کے اختلافات جن کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث پر ہے، تو ان کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ ائمہ کے درمیان حدیث کے حجت ہونے میں اختلاف تھا۔ بلکہ اُن کی وجہ یا تو حدیث کی روایت میں یا اس سے استدلال میں اختلاف تھا۔ کسی حدیث کے صحیح ہونے کے باوجود ائمہ کے درمیان جس طرح کے اختلافات پائے گئے ہیں، اسی طرح کے اختلافات قرآن کی متعدد آیات کے معنی میں بھی پائے گئے ہیں، اور جس طرح احادیث کے متعلق ناسخ و منسوخ کا اختلاف پایا گیا ہے، اسی طرح کا اختلاف قرآن کی متعدد آیات کے متعلق بھی پایا گیا ہے، حالانکہ قرآن کے قطعی، یقینی اور قابل حجت ہونے میں اختلاف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت اصولوں میں اتفاق و اتحاد اور فروعی مسائل میں رواداری اور وسعت میں ہے، فروعی مسائل کی دین میں ہرگز یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان میں اختلاف کی بنا پر مسلمان آپس میں نفرت کریں، اختلاف کو مخالفت کی شکل دے کر، ایک دوسرے کو بد نیت، فاسق اور گمراہ قرار دیں اور ایسے مستقل گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جائیں کہ انہیں اپنے متفق علیہ اصولوں کے بچاؤ اور قائم کرنے کا ہوش تک نہ رہے۔۔۔"

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں کیا ہو گا؟ یہ کتاب کس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اور اس تالیف کی افادی حیثیت کیا ہے؟

مولانا محمد عاصم اس کتاب کی تصنیف و تالیف پر پوری اُمت کی جانب سے تشکر و امتنان کے مستحق ہیں، مقصد کس قدر نیک ہے، نگاہ کتنی عمیق و نازک اور دور رس ہے، مطالعہ کتنا وسیع ہے، فکر کس درجہ صائب اور سنجیدہ ہے! پھر کمال یہ ہے کہ جزئی مسائل کے اختلافات میں جس تشریح و محاکمہ سے کام لیا ہے، اس میں اُن کے قلم کا، طبیعت و مزاج کا اور فکر و عقیدہ کا جھکاؤ یا میلان کسی خاص فقہی مسلک کی طرف نہیں پایا جاتا، کہیں جذباتیت نہیں! کسی کی جانب داری نہیں!

کوئی شک نہیں کہ فقہی مسالک جزئی اور فروعی اختلافات کے سبب وجود میں آئے، یہ اختلافات فطرت و عقل کے مطابق تھے، دنیا کا کوئی مذہب، مسلک اور مکتبہ فکر جزئیات میں اختلافات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، مگر ان جزئی اختلافات کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے تمام فقہی مکاتب فکر کے درمیان رواداری، وسعت، اخوت اور اتحاد پایا جاتا تھا لیکن افسوس ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، ان اختلافات میں مخالفت کا رنگ پیدا ہوتا چلا گیا، اور آخر کار نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ یہ فقہی مسالک فرقے سے بن گئے! تقلید کی ضرورت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر تقلید کے جمود نے اجتہادِ فکر کو اور تقلید کی شدت اور عصبیت نے اُمت کے اتحاد کو متاثر کیا، ہم نے احناف کی زبان سے جب کبھی یہ سُنا ہے کہ "ہمارے ائمہ یہ کہتے ہیں" تو خدا جانتا ہے کہ دل کو دُکھ ہوا ہے کہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام تیمیہ اور امام ابن قیم بھی "ہمارے ہی ہیں، کوئی غیر نہیں ہیں۔ یہی وہ گروہی عصبیت ہے جو نمازوں میں رفع یدین دیکھ کر اور "آمین بالجہر" سُن کر ترکش ابرو اور جبیں بر جبیں ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ غالی اہل حدیث اور متعصب غیر مقلدین ہیں، جن کے علماء منبروں پر خطبہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری جماعت "ناجی" ہے، باقی تمام جماعتیں "ناری" ہیں! استغفر اللہ!

"فقہ السنہ" کے مطالعہ سے اس قسم کی تمام عصبیتوں اور شدتوں میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اور جزئی اختلافات کی کنہ سمجھ میں آتی ہے! جناب محمد عاصم صاحب کی نگارش میں زبان و ادب کی شوخی و رنگینی کی جگہ جو سنجیدگی اور ثقاہت پائی جاتی

ہے وہ "فقہ السنہ" جیسی فقہی کتاب کے لئے موزوں تھی بلکہ مقدر کردی گئی تھی!

"فقہ السنہ" کی یہ پہلی جلد طہارت و صلوٰۃ کے مسائل پر مشتمل ہے، دوسرے حصہ میں جنائز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دعا کے مسائل بیان ہونگے، اللہ تعالیٰ مصنف اور ناشرین کو اس کتاب کی تصنیف و اشاعت پر دارین میں اجر و ثواب عطا فرمائے گا کہ یہ کتاب دینی اتحاد و اخوت کی مثبت کوشش ہے!

ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ

مترجمین :- مولوی محمد علی لُطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی، ضخامت ۲۶۴ صفحات بڑا سائز، قیمت سات روپے بارہ آنہ،

ملنے کا پتہ :- پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، ۱۲ - میری روڈ، کراچی ۳

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پاک و ہند کے مسلمانوں میں معروف ہی نہیں محترم و محبوب بھی ہے اُن کی ذات کو مجمع البحرین کہا جائے، تو یہ مبالغہ نہیں حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے، اتنی جامع اور کمالات کے اعتبار سے متنوع شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے نامور باپ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے علوم کے وارث اور صحیح جانشین تھے بلکہ بعض باتوں میں تو ان کا رنگ اور زیادہ نکھرا ہوا تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات اُن کے کسی مُرید نے، جس کا نام معلوم نہ ہوسکا، قلمبند کئے تھے جس کا آغاز ۱۲۳۳ھ ہجری سے ہوا تھا۔ ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء میں اس کتاب کو سب سے پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ نے چھاپا، اور پھر ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء میں مولوی عظمت الٰہی بن مولوی محمد ہاشم کا اُردو ترجمہ مطبع ہاشمی میرٹھ نے شائع کیا! یہ اُردو ترجمہ غلطیوں کا مجموعہ تھا، اس ترجمہ کی ترتیب اور اغلاط کی تصحیح کا کام مولوی محمد علی قریشی لُطفی اور مُفتی انتظام اللہ شہابی نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ انجام دیا، جہاں ضرورت محسوس کی، وہاں مختصر حواشی[1] کا اضافہ بھی کردیا اور کتاب کے آغاز میں صاحب ملفوظات کے سوانح حیات بھی جمع کردیئے۔

اس کتاب پر پیش لفظ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر معین الحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں مترجمین لکھتے ہیں :-

> "..... غرضکہ ملفوظات میں گوناگوں مسائل و احکام زیر بحث آئے ہیں۔ بعض مقامات قابل توجہ ہیں، کہیں کہیں موضوع اور ضعیف روایات سے استدلال کیا گیا ہے، شاہ صاحب کی ممتاز شخصیت اور علمی حیثیت بالخصوص علم حدیث پر عبور اور مہارت کے پیش نظر یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ یہ شاہ صاحب کے ملفوظات کے جزو ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامع ملفوظات نے مکمل احتیاط سے کام نہیں لیا، یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی قول کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکا....."

فاضل مترجمین نے "ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ" کے بارے میں جرأت کرکے محتاط اور عقیدت مندانہ انداز میں جس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ "بعض مقامات قابلِ توجہ ہیں"۔ قریب قریب یہی حال دوسرے صاحبانِ ارشاد و تصوف کے ملفوظات کا ہے! ان بزرگوں کے ملفوظات کے بعض اجزاء نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں اور مسلمانوں میں عقیدہ و عمل کی نہ جانے کتنی خرابیوں کے ذمہ دار یہی ملفوظات

[1] صفحہ ۹۸ کے حاشیہ پر تفسیر مظہری کو مرزا مظہر جان جاناں شہید کی تصنیف بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ تفسیر حضرت شاہ ثناء اللہ پانی پتی کی لکھی ہوئی ہے۔

ہیں، کاش! ان ملفوظات کے جمع کرنے والے بے سند اور کمزور باتوں کو حذف کر دیتے، اور اپنے بزرگوں کی کہی ہوئی اچھی باتوں کو پیش کرتے، جو کتاب و سنت کے مطابق ہوتیں اور جن کے مطالعہ سے ذہن خلجان میں مبتلا نہ ہوتے۔

"فرمایا، مشکل اور سختی کے وقت کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے، وہ یہ ہے کہ پونے چار سیر گیہوں کا آٹا، پونے چار سیر بکری کا گوشت، اس کے نصف گھی لیوے اور پیاز اور دہی وغیرہ ملاکر بہت اچھی طرح تیار کرکے آدھ آدھ سیر کے سات حصے کرکے، سات آدمیوں کو جو صالح اور متقی ہوں، دیدیوے، خواہ خود کھالیں، یا اپنی طرف سے کسی آدمی کو دیدیویں اور ایک روز پہلے سے کسی کتے کی دعوت کردیں، اگر آجاوے تو بہتر، ورنہ جو کتا ملے اس کو باقی کھانا کھلا دیویں۔۔۔" (ص ۵۸)

"حل مشکل اور ردِ بلا کے لئے جو "خاص طریقہ" تلقین فرمایا گیا ہے یہ کتنا عجیب و غریب ہے؟ خاص طور سے یہ جزء کہ "ایک دن پہلے کتے کی دعوت کردی جائے"!

"۔۔۔۔ اب برہان الدین ابوالخیر کی قبر کی خاک میں یہ تاثیر ہے کہ جو کوئی کھاتا ہے، اس کا حافظہ اور ذہن اچھا ہو جاتا ہے۔" (ص ۶۱)

حالانکہ شرعی اعتبار سے "مٹی کھانا" جائز نہیں ہے اور پھر عقیدت کے ساتھ حصولِ فیض و تاثیر کے لئے کسی بزرگ کی قبر کی مٹی کا کھانا تو دین و ایمان کا ضرر ہے۔

"۔۔۔۔ پھر ایک مرید کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا، کہ عارفوں کی محفل و مجلس بھی تم نے دیکھی اور سُنی کہ اس میں یہ ہوتا ہے، حتّٰی کہ بہروپیوں کے تماشہ میں عجیب عجیب حالات اور حضرت حق مجدہ کے مظاہر قدرت کا مشاہدہ کیا، اور بھانڈوں کے تماشوں میں پیروں کا اتباع اور پری پیکروں کے حُسن و جمال پر رقص کرنے والوں کی محفلوں میں ذات و صفات اور کیفیات دیکھیں۔۔۔" (ص ۶۳، ۶۴)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جیسے عالم کتاب و سُنّت کی زبان سے ایسی باتیں سُن کر حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، استغفراللہ! "تصوّف" کا یہی وہ مزاج ہے، جو بڑے سے بڑے عالم اور زاہد و متقی کو اس قسم کی باتوں میں اُلجھا دیتا ہے، جن کو دین میں ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے۔

"بطور تذکرہ کے فرمایا کہ شیخ اکبر کا قول ہے کہ الصوفی لا مذھب لہ، ایک مرید نے عرض کیا کہ یہ قول بظاہر مذہب کے اختیار کرنے کے بارے میں ہے، یا پھر یہ قول تاویل کا محتاج ہے، فرمایا کہ اس میں بڑی گنجائش ہے، اس لئے کہ صوفی سے اس مقام پر وہ صوفی مُراد ہے کہ جو وحدت الوجود کا معتقد ہے، ایسا شخص ہر جگہ وحدت کے پردے میں حق کا ہی ظہور دیکھتا ہے، اور حق و باطل میں، باطل کو بھی وہ حق ہی سمجھتا ہے۔۔۔" (ص ۶۷)

حق حق ہے اور باطل باطل ہے، کتاب و سُنّت میں کسی ایسے "مقام و حال" کا ذکر نہیں آیا، جہاں حق و باطل کا امتیاز مٹ جائے، جو کوئی "باطل کو حق سمجھتا ہے" وہ ہوائے نفس میں مبتلا ہے، شیخ اکبر ہوں یا کوئی اور بزرگ ہوں، ان کی شطحیات کی تاویل کے لئے

دینی قدروں میں ہیرا پھیری نہیں کی جاسکتی۔

"چوتھی قسم کی اصلاح، انبیاء و اولیاء، ائمۂ اہل بیت عظام کی ارواح سے توسل حاصل کرنا ہے، کیوں کہ یہ بزرگ اس باب میں بڑی تاثیر رکھتے ہیں، اور دائمہ مستمرہ لازمہ قوت فائدہ حاصل کرتا ہے، جس سے عالم میں تصرف کیا جاسکتا ہے، جیسے کہ امراض کا سلب کرنا، درد کو تسکین دینا جمادات وحیوانات کو مسخر کرنا اور اس باب میں امداد حاصل کرنا، ان بزرگوں کی ارواح طیبہ سے .... اور اس میں مجرب و معمول وہ پانچ مبارک روحیں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدس، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روح مبارک، تیسری حضرت غوث الاعظم کی روح، حضرت بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ کی روح، پانچویں حضرت معین الدین چشتی کی روح ..." (ص ۱۵۰)

وہ لوگ جو مشرکانہ رسوم اور بدعات میں مبتلا ہیں، اُن کے اس خلاف شرع مسلک کو اسی قسم کے "ملفوظات" سے غذا اور سند ملتی ہے یا نہیں؟ "بزرگوں کی ارواح سے امداد حاصل کرنا" یہ عقیدہ توحید کے منافی ہے! غیرت توحید کا یہ تقاضا ہے کہ اس قسم کے مجربات و معمولات کے خلاف احتجاج کیا جائے!

"پھر معمولات سابق سے فارغ ہو کر کھانا و شیرینی وغیرہ جو موجود ہوتا ہے، اس پر نیاز کر کے تقسیم کرتے ہیں ..." (ص ۱۴۸)

"شیرینی اور کھانے پر یہ نیاز و فاتحہ کی رسم" کھلی ہوئی بدعت ہے حیرت ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہاں بھی ایسی باتیں ہوتی تھیں!!

ع پھر کسے رہنما کرے کوئی

"فرمایا کلام اللہ اور احادیث کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کو مرنے کے بعد ایک سال تک اپنے مکان اور اقارب واحباب سے تعلق باقی رہتا ہے ..." (ص ۱۵۴)

اس خصوص میں کلام اللہ کا حوالہ حیرت انگیز ہے!!

"فرمایا کہ علم کی خدمت حضرات صوفیائے نے بہت کی ہے، چنانچہ کاشی کی تاویلات مشہور ہیں اور اسی طرح شیخ روزبہان کے اشارات، چنانچہ سید عبدالوہاب بخاری جو سید جھجی رومی کے نام سے مشہور ہیں، اس موقع پر انھوں نے بہت خدمت کی ہے کہ تمام قرآن شریف کو آنحضرت ﷺ کی تعریف میں ثابت کیا ہے۔" (ص ۱۶۳)

"تمام قرآن شریف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و تعریف میں ثابت کرنا، دین کی خدمت نہیں بلکہ دین کی تحریف ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب سے تو ہم اس کی توقع رکھتے تھے کہ وہ قرآن کریم کی اس قسم کی "غلط اور بادِ ہوائی تفسیر" پر سخت گرفت فرمائیں گے، چہ جائیکہ اس کی تحسین کی جائے۔

"پھر فرمایا ایک دوسری بات ہے جس کو لوگ کم سمجھتے ہیں، تجلّی الٰہی جو اولیاء کرام کے ادب پر تو متمکن ہوتی ہے (جس سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں) اور بعض اوقات صرف اپنے کی

وجود پر نظر ہوتی ہے جیسے حضرت علی رضی نے فرمایا کہ میں نے ہی حضرت نوح کی کشتی کو ٹھیرایا تھا، اور میں ہی قیامت کا باعث ہوں، میں زندہ رہوں گا اور مجھے موت نہیں آئے گی۔۔۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایسی مخالف توحید باتیں کہہ ہی نہیں سکتے، یہ سبائیوں اور باطنیوں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، جو حضرت علی رض کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں، تعجب ہے کہ "تحفۂ اثنا عشریہ" کا مصنف ان باتوں میں ذرہ برابر کھٹک محسوس نہیں کرتا!

"پھر فرمایا کہ یہی حال قطبیت کا ہے پھر فرمایا کہ حضرات چشتیہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے جنازہ کے ساتھ قوال گاتے جاتے تھے"

سرو سیمنا بصحرا می روی | سخت بے مہری کہ بے ما می روی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو | تو کجا بہر تماشا می روی

"سلطان المشائخ کے جنازے میں حرکت پیدا ہوئی، ہاتھ بلند ہوئے، حضرت رکن عالم نے قوالوں کو گانے سے روک دیا، ہاتھوں کو تابوت کے اندر کر دیا، پھر خود آپ نے ہی جنازہ کی نماز پڑھائی" (ص ۲۰۷)

اس قسم کے قصوں کو "تصوف کی الف لیلہ" سمجھنا چاہیے!

"نیز ارشاد فرمایا کہ اڑنے والے جانور حرم کی چھت پر سے نہیں گزرتے۔ (ص ۱۹۹)

حالانکہ ہم نے حرم شریف کی چھت پر کبوتروں کو بیٹھے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے! قبروں کے گنبدوں سے پرندوں کا نہ گزرنا، کسی بزرگ کے عرس میں مکھی کا نہ پایا جانا، کسی مقدس شہر کے کتّوں کا شہر سے باہر جا کر رفع حاجت کرنا۔۔۔ یہ باتیں "توہمات" اور غلط قسم کی عقیدت کے سوا اور کیا ہیں، جو "خرقِ عادت اور عجائب پرستی" کے حیلے اور نکتے ڈھونڈتی ہے۔

ان "ملفوظات" کو ایک کشکول سمجھنا چاہیے جس میں تصوف، الٰہیات، فقہ، اخلاق، شعر و ادب۔۔۔ سبھی کچھ ملتا ہے! اس کتاب میں بہت سی ایسی باتیں بھی آگئی ہیں، جن سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے! بعض نازک مسائل کی شاہ صاحب نے گرہ کشائی بھی فرمائی ہے۔

"فرمایا حنفیہ کے نزدیک تو (برتن) ناپاک ہو چکے، جب دشواری ہو تو شافعی مذہب پر عمل کرے، کیوں کہ حق ائمہ اربعہ میں دائر ہے" (ص ۴۹)

حضرت شاہ صاحب نے بڑے کام کی بات فرمائی ہے، اگر فقہی مسائل میں اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو شریعت میں بہت کچھ توسع اور سہولت پیدا ہو سکتی ہے، اور اس طرح گروہی عصبیت کا بھی ازالہ ہو سکتا ہے۔

"فرمایا غازی الدین خاں کہ عمدہ شاعر تھا کہا کرتا تھا کہ جس شعر کے معنی پیدا نہ ہوتے ہوں اس کو تصوف میں لے جائیے، عمدہ معنی پیدا ہو جائیں گے واقعی سچ کہتا تھا، پھر چند اشعار کے معنی بھی بیان فرمائے۔۔۔" (ص ۵۲)

حضرت شاہ صاحب کی زبان سے غیر شعوری طور پر کتنی حق بات نکل گئی! تصوف کا ٹھیک یہی مزاج ہے کہ "بے معنی اور مہمل باتیں" صوفیانہ تاویلات کے ذریعہ "رموز و اسرار" بن جاتی ہیں۔

زندگی میں پہلی بار اس واقعہ کا علم ہوا کہ:۔

"..... حبشی لوگ ہاتھی کا گوشت بھی کھاتے ہیں، چنانچہ شاہ حبش کے باورچی خانہ میں دو تین ہاتھی روز ذبح کئے جاتے ہیں ....." (ص ۸۳)

فرمایا

"ساچق ترکی لفظ ہے جس کے معنی پری کے ہیں (ص ۱۱۶) "پارہ اور دھتورہ کی گولی بنا کر چراغ کے تیل میں ڈال کر چراغ روشن کرتے ہیں، اس ترکیب سے تمام کھٹمل مر جاتے ہیں یا اس جگہ سے باہر چلے جاتے ہیں (ص ۱۰۳)

"پشنک بلی کو اور طغون سفید بلی کو کہتے ہیں (ص ۱۶۳) شاہ عالمگیر کے حفظِ قرآن کی تاریخ کسی مورخ نے خوب کہی ہے۔

سنقرأک فلا تنسیٰ

۱۰۶۲ھ

اور حفظ کر لینے کی تاریخ "فی لوح محفوظ" ہے۔
۱۰۷۸ھ

"فرمایا حضرت اویس قرنی کی دنداں شکنی کا جو قصہ مشہور ہے غلط ہے (ص ۸۳)

حضرت شاہ صاحب فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ اُن کا ایک شعر اس کتاب میں ملتا ہے:۔

منکر مشو توفیضِ سحر را کہ بے بہار — گل می شود چراغ چو صبح از اُفق دمید

فرقہ ملاتیہ کا ذکر کرتے ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:۔

"مولانا روم اور حضرت شمس تبریز کا واقعہ بھی اسی طرح ہے کہ مولانا روم سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے اور حضرت شمس تبریز کھڑے ہوئے تھے ایک مسئلہ دریافت کر رہے تھے، ان سے بھی پوچھا غالباً مسئلہ توحید تھا، مولانا روم نے دیکھا کہ یہ آدمی اچھا معلوم ہوتا ہے اور حضرت شمس تبریز نے بھی ولایت کے زور سے مولانا روم کو پہچان لیا، ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دونوں گھر گئے، مولانا روم ان سے بہت خوش ہوئے اور ان کو مہمان رکھا شمس تبریز نے (امتحاناً) رات کو شراب کا مطالبہ کیا نیز فرمایا ایک عورت نامحرم بھی چاہیے، مولانا نے اپنے لڑکے اور لڑکی کو شراب لے کر حاضر کیا، شمس تبریز اس تعمیل حکم اور ضیافت کر بہت خوش ہوئے ...." (ص ۱۳۸)

ہمیں تو یہ باتیں خرافات اور یار لوگوں کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اور اگر یہ واقعات سچ مچ ظہور میں آئے تھے تو یہ تحسین نہیں ملامت و براءت کے مستحق ہیں! صوفیائے کے اس قسم کے واقعات ملفوظات اور تذکروں میں نقل کرنے کی بجائے مزبلوں میں بے دریغ پھینک دینے چاہئیں ـــــ توبہ!

"مولانا روم حضرت شمس تبریز کی شان میں فرماتے تھے، کہ کیا خوب یہ شعر کہا ہے۔

؎ باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

"کیا اچھی نعت کہی ہے، خدا کے ساتھ جو چاہو معاملہ کرو، لیکن محمد کے ساتھ سوچ سمجھ کر معاملہ کرنا" (ص ۱۳۸)

حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں زیادہ احترام، احتیاط و ادب اور ڈرنے کی مستحق ہے! اس مصرعہ میں جو "فکر" پائی جاتی ہے، وہ اسلامی فکر ہی نہیں ہے۔

ملفوظات شاہ عبدالعزیز" میں لالہ و گل کے ساتھ سانپ بچھو بھی لپٹے ہوئے ہیں، کاش! کوئی خدا کا نیک بندہ ان سانپ بچھوؤں سے اس گلدستہ کو پاک کر سکتا اور پھر انہیں منظرِ عام پر لاتا۔

حجۃ اللہ البازغہ (حصہ اول) از:- سید حبیب احمد عبداللہ الہاشمی، ضخامت ۳۰۴ صفحات، مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت: تین روپے،

ملنے کا پتہ:- سلطان حسین اینڈ سنز بندر روڈ، کراچی۔

"مسئلہ ایصال و ثواب" پر یہ کتاب اپنی نوعیت کی سب سے منفرد کتاب ہے، اس تصنیف کا مواد بڑی عرق ریزی اور تفحص کے ساتھ مرتب کیا ہے! قرآنی آیات اور احادیث سے استدلال کیا گیا ہے، اندازِ بیان سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک ہے۔ کسی پر طنز اور پھبتی نہیں، شروع سے لے کر آخر تک حقائق کے اظہار کا ایک ہی لب و لہجہ ہے۔

اس کتاب میں انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی نبی نے پچھلے نبیوں کی نہ فاتحہ دلائی اور نہ اُنکے نام کا کھانا پکا کر محتاجوں کو کھلایا، اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نبی خاص طور سے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لئے قرآن پڑھ کر بخشا اور نہ اُن کے لئے حج کرایا۔

> "یا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں جو ہزاروں انبیاء کی قبریں ہیں۔ آپ نے کسی نبی کی قبر کی زیارت کی، یا صحابہ کو حکم دیا ہے، صحابہ کرام کو اپنے اطراف عالم میں جو پھیلنے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی بشارتیں دی ہیں، اور اس میں خصوصیت کے ساتھ مصر شام، بیت المقدس، حکومتِ اسلامی میں داخل ہونے کی بشارتیں دیں، جہاں پر ہزار ہا انبیاء کے مزارات ہیں، خصوصاً حضرت خلیل اللہ کا مزار موجود ہے جو "ابو الانبیاء" ہیں، جو اہل کتاب یہودی اور نصرانیوں کا مرجع ہیں، کہیں آپ نے صحابہ سے یہ فرمایا کہ جب ابراہیم خلیل کے اور دوسرے انبیاء کے مزار پر پہونچو تو فاتحہ پڑھو، انکے وسیلے سے فتح و ظفر کی دعا اللہ تعالیٰ سے مانگو۔"

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، بنات، پھوپھیوں، خالاؤں، چچاؤں اور دوسرے رشتہ داروں اور مشہور صحابہ کرام کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ قرآن شریف پڑھ کر انہیں بخشا اور نہ اُن کے نام کا کھانا کھلایا۔۔۔۔ فرماتے ہیں:-

> "۔۔۔ ان دونوں احادیث سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد زندہ مردہ کے لئے نہ تو قرآن شریف پڑھنے کا حکم، نہ کھانا کھلانے، نہ فاتحہ وغیرہ کا بلکہ صرف طلب مغفرت کرنے کا اور یہ جتنی زیادہ ہو، اتنی ہی بہتر ہے۔"

مُردوں کے لئے ایصالِ ثواب کی جو رسمیں مسلمانوں میں رائج ہیں۔" اُن کی کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ سے تائید نہیں ہوتی" بلے

یہاں تک بڑھی کہ اس مسئلہ میں بعض مباحات نے مستحبات کا رنگ اختیار کرلیا اور رفتہ رفتہ یہ غلو فرائض و واجبات کی حد تک پہنچ گیا! کوئی خدا کا بندہ ان بدعات پر نکیر کرتا ہے تو اس پر "وہابیت" کی طنز کی جاتی ہے، ہندوؤں میں مُردوں کے نام پر جو "شرادھ" اور "تیرھویں" ہوتی ہے، اسی کی جھلک تیجے، دسویں اور چالیسویں میں بھی پائی جاتی ہے، صحابۂ کرام، تابعین عظام اور ائمۂ حدیث و فقہ ان رسموں سے ناواقف تھے! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دینِ خالص پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

صحیفۂ دل

از:۔ اقبال شوقی، ضخامت ۲۰۸ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت درج نہیں،
ملنے کا پتہ:۔ سلطان حسین اینڈ سنز مقابل مولوی مسافر خانہ، بندر روڈ، کراچی۔

جناب اقبال شوقی صاحب فکر شاعر ہیں، اصنافِ شاعری میں رباعی سے انہیں خاص شغف ہے، اُن کی رباعیوں کا یہ پہلا مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے، یہ رباعیاں حسب ذیل چار ابواب:۔

عرفاں، جذب و شوق، پندار، کیف و کم

پر مشتمل ہیں۔

اقبال شوقی کی رباعیوں میں حکمت و دانش کے ساتھ سوزِ دل بھی پایا جاتا ہے، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے امتزاج نے اُن کی رباعیوں کو پہلو دار بنا دیا ہے، چند منتخب رباعیاں:۔

اربابِ ہنر صنعت کامل سمجھے
خاصانِ وفا عشق کا حاصل سمجھے
ترتیب دیا کچھ اس طرح نغمۂ شوق
اہلِ عرفاں صحیفۂ دل سمجھے

دل شوق پرست، شوق نظارہ کوش
نظارہ نظر طلب، نظر دشمنِ ہوش
اللہ رے! وہ سپردگی کا عالم
مشہود بھی دنگ اور شاہد بھی خموش

ہر صبح کو برگِ گل پہ شبنم بن جائے
ہر شام کو تابِ زلف پر خم بن جائے
اک نغمۂ سرمدی کہ عالم پر محیط
اک کیف سپردگی کہ عالم بن جائے

مشاطگیٔ راز کہاں تک ہوگی
انساں کی تگ و تاز کہاں تک ہوگی
وجدان اگر راہنمائی نہ کرے
تخیل کی پرواز کہاں تک ہوگی

خود حسن کی آرزو ہے تو بھی میں بھی
اور عشق کی آبرو ہے تو بھی میں بھی
یہ پردۂ درمیاں اگر اٹھ جائے
اک آئینہ روبرو ہے تو بھی میں بھی

اعجازِ ادائے حسن کرشمہ کہیے
نیرنگیٔ حیرتِ تماشا کہیے
سمٹے تو کلی، پھیلے تو عالم بن جائے
اس جلوۂ رنگ رنگ کو کیا کہیے

مقصود کمالِ جستجو ہو جائے
انسان خود اپنی آرزو ہو جائے
بندوں کی نظر میں آبرو ہو کہ نہ ہو
خالق کی نظر میں آبرو ہو جائے

کیفیتِ غم میں کھو کے دیکھا ہم نے
اور اک وجنوں سمو کے دیکھا ہم نے
ہو جاتے ہیں اپنی ہی تجلی میں گم
سرگشتۂ شوق ہو کے دیکھا ہم نے

رخسار کہ تازہ غنچے مہکے مہکے
یہ ہونٹ کہ انگارے سے دہکے دہکے

سانچے میں ڈھلا ہوا بدن نشے چور
بن میں جیسے غزال بہکے بہکے

دلِ خوگرِ کیف ہائے ہو بھی نہ رہے
اور عشرتِ غم کی آرزو بھی نہ رہے

آجا کہ ابھی دید کی خواہاں ہے نگاہ
ممکن ہے کہ تیری جستجو بھی نہ رہے

ہر پھول دہکتا ہوا انگارہ ہے
ہر ذرہ دمکتا ہوا مہ پارہ ہے

یہ کوچۂ دوست ہے یہاں کی ہر شے
نظارہ طلب ہے، جانِ نظارہ ہے

رہتا ہوں خلاؤں میں ستارے کی طرح
جل بجھنا مرا کام شرارے کی طرح

یکساں ہے حضوری ہو کہ دوری اے دوست
پایا ہے مزاج میں نے پارے کی طرح

گردش میں ہوں روز و شب ستاروں کی طرح
بے رشتہ و سرگشتہ غباروں کی طرح

راہیں متعین ہیں نہ منزل اے دوست
سرگرم سفر ہوں آبشاروں کی طرح

تسکینِ نگاہ ڈھونڈتا ہوں ساقی
بے راہ ہوں راہ ڈھونڈتا ہوں ساقی

اس درجہ ہوں آشفتگیِ دل سے نڈھال
نشہ کی پناہ ڈھونڈتا ہوں ساقی!

ہر چیز میں پرتوِ خیال اے ساقی!
ہر شے میں ہے حسنِ لازوال اے ساقی

یہ رنگ یہ رس یہ نور و نغمہ یہ سرور
ادنیٰ سا کرشمۂ جمال اے ساقی!

ساغر بکف اک ماہ جبیں زہرہ نگاہ
ڈھلتی ہوئی شب اور وہ بھی شبِ ماہ

نیرنگِ نظر، تموجِ جلوۂ رنگ
پینا بھی گناہ ہے، نہ پینا بھی گناہ

دُوسرا رُخ :-

شرحِ دلِ بیقرار لے آیا ہوں
آئینۂ اعتبار لے آیا ہوں

سرمایۂ زندگی ہے یہ نقدِ ہنر
با نازش و افتخار لے آیا ہوں

لفظوں کو جوڑ دیا گیا ہے، رُباعی میں کوئی لُطف نہیں!

اپنی تو گزر جاتی ہے جیسے گزرے
اوروں کے مصائب نہیں دیکھے جاتے

میں بندۂ ناچیز ہوں لیکن یارب!
کر لیتے ہیں آپ یہ گوارا کیسے ــــ

اللہ تعالیٰ سے یہ مخاطبت کا انداز خدا پرستوں کو زیب نہیں دیتا۔

گلچیں بھی گل و غنچہ بھی گلزار بھی ہوں
بت گر بھی ہوں، بت بھی ہوں پرستار بھی ہوں

یہ پردۂ آب و گل ہے پوشاکِ جمیل!
جلوہ بھی ہوں، دیدہ بھی ہوں، دیدار بھی ہوں

یہ وہ "وحدت الوجود" ہے جو عجمی، ویدانتی اور غیر اسلامی ہے! دوسرے مصرعہ میں "پوشاکِ جمیل" کھٹکتا ہے، چوتھے مصرعہ میں "دیدہ" اچھا نہیں لگتا، یہ مصرعہ کاش یوں ہوتا ع

جلوہ بھی، نگاہ بھی ہوں، دیدار بھی ہوں

یہ حرف نہ یہ صوت نہ یہ نغمہ ہے
ذرہ ہے نہ پھول ہے مہ پارہ ہے

شاید دلِ حسرت آشنا واقف ہو
وسعت کدۂ دہر اک آئینہ ہے

زمانہ (دہر) کو صوت و نغمہ اور مہ پارہ کون کہتا ہے، جس کی تردید فرمائی گئی ہے، پھر دل کے ساتھ "حسرت آشنا" کی جو صفت لائی گئی ہے، اُس سے رباعی کی معنویت کا کیا ربط ہے؟ رباعی کا ماحصل یہ نکلا کہ دُنیا آئینہ قرار پائی، اس "دریافت" میں آخر نُدرت کیا ہے!

حاصل سے کم نہیں غمِ حاصل بھی　　نیرنگ نظر ہے پردۂ حائل بھی
بے واسطہ نظر بھی آسان نہیں　　حیرت زا ہے تصورِ کامل بھی

مفہوم میں خاصا الجھاؤ اور ابہام پایا جاتا ہے، چوتھا مصرعہ جسے بہت زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے تھا بہت کمزور ہے۔

اک عمر گزر گئی تمنا کرتے　　رودادِ کلیم پھر سے تازا کرتے
حیرانیٔ دائم ہے مقدر لیکن　　حیرانیٔ دائم کا تقاضا کرتے

آخر یہ بات کیا ہوئی؟

وابستۂ آلام خوشی رہتی ہے　　کس درجہ اُداس زندگی رہتی ہے
اے دوست! شرارِ آرزو کے باوصف　　اِک آگ سی سینے میں لگی رہتی ہے

شرار کا تو کام ہی چمکنا، گرمی پہونچانا اور آگ لگانا ہے، اس صورت میں "باوصف" کے بے موقعہ اور غلط استعمال نے پوری رُباعی کو بے وزن بنا دیا۔

اندیشوں میں اپنے مسکرالوں تو کہوں　　پہلے تجھے سینے سے لگا لوں تو کہوں
تو لازمۂ حیات ہے میرے لئے　　اظہار کی جرأتیں بڑھا لوں تو کہوں

اس قسم کی سطحی رُباعی بھلا مجموعۂ کلام میں شامل ہونے کے قابل تھی؟ چوتھا مصرعہ کس قدر بچکانہ ہے۔

یا ذوقِ نشاط کامرانی لے لے　　یا نظمِ قرار زندگانی لے لے
کیوں میرے دل و دماغ پر طاری ہے جمود　　بیتابیاں دیدے یا جوانی لے لے

"یا نظمِ قرار زندگانی لے لے" یہ کہاں کی زبان ہے! پھر "قرار زندگانی" کا نظم کیا ہوتا ہے؟ یہ عجیب طرح کی جوانی ہے جس نے دل و دماغ پر جمود طاری کر رکھا ہے!

اک کیفیت کہ اضطراری بھی ہے　　اک جذبہ کہ غیر اختیاری بھی ہے
رعنائیِ التفات مہمل یعنے　　انسان فرشتہ بھی مداری بھی ہے

انسان کے "مداری" ہونے کا شعر میں نہ ثبوت ملتا ہے اور نہ کوئی رمز و اشارہ! پھر "رعنائیِ التفات" کا رباعی کی معنویت سے کوئی جوڑ نہیں!

جنت کی تمنا نہ جہنم کا خیال　　مجھ کو نہ اجل کا ڈر نہ پیری کا خیال
ہے عہدِ جوانی کی مُسلّم عظمت　　کرتا ہوں پرستش جوانی و جمال

بے مزہ رُباعی"!! تیسرا مصرعہ کچھ اور ہونا چاہیئے تھا۔

شعلہ بہ نظر شرر بجاں آتش کش　　اک رندِ خراباتی و مے خانہ بدوش
ہر لغزشِ پا سے باخبر رہتا ہوں　　یہ عالمِ بے خودی بھی ہے، عالمِ ہوش

اگر کوئی شخص زمین کو جوتتا اور بوتا ہو تو کیا اسے "زمین کوش" کہہ سکتے ہیں؟ اس لئے "آتش کوش" کی ترکیب خاصی محل غور ہے۔
رباعی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یا تو کوئی حکمت کی بات کہی جائے یا کسی جذبہ کا سلیقہ کے ساتھ اظہار کیا جائے، اس رباعی میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔

دن کیف فزا رات سہانی میری ہے آج بساط زندگانی میری
اے دل کی دھڑکنو! بس اب رک جاؤ آمادہ بہ لغزش ہے جوانی میری

جوانی کی لغزش کے لئے دل کی دھڑکنوں سے رکنے کی آخر کیوں التجا کی جا رہی ہے! ہر بات کے کہنے کا کوئی نہ کوئی قرینہ اور معنوی ربط ہوتا ہے۔ کیا جوانی سے لغزش اس وقت ظہور میں آیا کرتی ہے، جب دل کی دھڑکنیں رک جائیں۔

اقبال اور حیدر آباد

از:۔ نظر حیدر آبادی، ضخامت ۲۳۲ صفحات (کاغذ، کتابت، طباعت، کاغذ، جلد سرورق ہر چیز خوب سے خوب تر، علامہ اقبال کی سہ رنگی تصویر کے ساتھ)

قیمت:۔ پانچ روپے، ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکاڈمی، پاکستان کراچی۔

جناب نظر حیدر آبادی ہماری زبان کے مقبول و معروف شاعر ہیں، موصوف سبزوار کے خانوادہ سادات سے تعلق رکھتے ہیں، مغلیہ عہد میں ان کے آبا و اجداد کو کاسگنج ضلع ایٹہ کے قریب کئی گاؤں جاگیر میں ملے تھے۔ نظر صاحب کے دادا سید کاظم علی باغ کو حضرت داغ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ باغ مرحوم کے کلام میں "داغ اسکول" کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، نظر کے دادا کے حقیقی چھوٹے بھائی نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم بھی داغ کے شاگرد تھے، مزاج تخلص تھا۔ ان کا مجموعہ کلام (کیفیات مزاج) شائع ہو چکا ہے، نظر صاحب کے والد جناب علی اختر بلند پایہ صاحب فکر شاعر تھے، نظر کو شعر و ادب ورثہ میں ملے ہیں، ان کی شاعری کا یہ رنگ:۔

بدلی جو چشم ساقی پیمانہ چھوڑ آیا
کس تشنگی میں کیسا میخانہ چھوڑ آیا

کتنا نکھرا ہوا ہے اور اس میں تغزل کا کیا رچاؤ پایا جاتا ہے۔
حیدر آباد دکن سے اقبال کا اور اقبال کی شاعری کے اثرات کا جو تعلق رہا ہے اور اہل دکن نے جس عقیدت و محبت کے اور کشادہ دلی کے ساتھ اقبال کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے، اس کی تفصیل اس کتاب (اقبال اور حیدر آباد) میں ملتی ہے۔ اس کتاب سے پہلے نظر حیدر آبادی کی کوئی اردو تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری، اس کتاب کو پڑھ کر اس کا انکشاف ہوا کہ نظر صاحب کی نثر بھی بڑی جاندار اور شگفتہ ہوتی ہے، پوری کتاب دلچسپ ہے، معلومات آفریں ہے اور لکھنے والے کی ذہانت کی آئینہ دار ہے! اقبال سے نظر کو غیر معمولی عقیدت ہے، اسی لئے اقبال کے کردار پر جہاں کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہے، اس کی انہوں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ مدافعت کی ہے۔ ایک نمونہ:۔

"موعظت اور عمل کی تلقین کے لئے ہر زمانہ میں کسی نہ کسی سعدی نے کسی نہ کسی بغداد کی تباہی پر آنسو بہائے اور مایوس دلوں میں امید کی کرن دوڑا دی، اقبال نے جس زمانے میں یہ فرض ادا کیا، اس وقت پوری ملت اسلامیہ سراپا بغداد کی تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی، اس مسلسل اندھیرے میں اقبال "جن کھوئے ہوؤں" کی جستجو میں نکلے تھے، انہیں جہاں کہیں

روشنی، کوئی کرن کسی نادر، کسی ظاہر شاہ کی کسی نواب بھوپال اور نظام دکن کی شکل میں نظر آتی تھی، وہ اسے دلیل راہ سمجھتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔"

پاکستان میں "رسم الخط" کا قضیہ نامرضیہ اگرچہ عوام کے احتجاج کے سبب دب گیا ہے مگر نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں یہ افسوسناک حادثہ کب پیش آ جائے کیوں کہ بقول اقبال :۔

صاحب نظراں! نشہ طاقت ہے خطرناک!

اس کتاب سے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی اور اقبال کی اصابت فکر و رائے کا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اُردو رسم الخط کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ۔

"رسم الخط کا قضیہ پاکستان میں پھر موضوع بحث بن گیا ہے، اس دعوت میں یہی مسئلہ زیر بحث آیا تھا، اور اس موضوع پر اقبال کے خیالات سے استفادہ کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہو گی، اقبال نے مولوی (عبدالحق) صاحب سے کہا تھا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مضمون کا ایک بیان شائع کریں کہ "ہم اُردو رسم الخط کبھی نہیں چھوڑیں گے"

صفحہ ۹۳ پر فارسی کا مشہور مصرعہ جو ضرب المثل بن چکا ہے، غلط درج ہو گیا ہے "ما" کی جگہ "من" چھپ گیا، اصل مصرعہ یوں ہے

؎ ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

(ص۱۸۴) "اپنے محیط میں آزاد رہنے کی جو جوت انھوں نے جلائی تھی"، روزمرہ "جوت جلانا" نہیں "جوت جگانا" ہے! صفحہ ۱۸۷ پر نظر صاحب کی نظم کا ایک بند ہے، جس کا پہلا مصرعہ ۔

بے اختیاریوں کا بہانہ بدل گیا

بہت کمزور ہے!

بزم اقبال (حیدرآباد) کے ایک خاص اجلاس کی روداد کا ایک اقتباس ہے :۔

"آج شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں پر صرف تشہیری پردے لگا دیئے گئے"

حیدرآباد دکن میں "ایڈورٹائزمنٹ" کو "تشہیر" بولتے اور لکھتے تھے حالانکہ "تشہیر" میں ذم پایا جاتا ہے اور تشہیر بُری شہرت کو کہتے ہیں، بادشاہوں کے دور میں بعض مجرموں کا منہ کالا کر کے گدھے پر انہیں نکالا جاتا تھا کہ لوگوں کو عبرت ہو اس فعل کو تشہیر کہتے تھے ۔

جناب نظر نے اس کتاب کے لئے جو مواد جمع کیا ہے، اس میں انہیں بڑی محنت اور تحقیق و جستجو کرنی پڑی ہے، یقین ہے کہ یہ کتاب عوام و خواص میں پسند کی جائے گی ۔

ذکر و فکر از :۔ سیدہ انیس فاطمہ (بریلوی) ضخامت ۷۲ صفحات، رنگین سرورق، قیمت :۔ بارہ آنے
ملنے کا پتہ :۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ناظم آباد، کراچی ۔

یہ کتاب ہلکے پھلکے اخلاقی اور ادبی شہ پاروں پر مشتمل ہے، سادہ زبان ہے اور سیدھا سادہ انداز فکر ہے، لکھنے والی کا خلوص ایک ایک حرف سے جھلکتا ہے! سیدہ انیس فاطمہ کے مشاہدات اور تجربات الفاظ کے قالب میں ڈھل کر اثر انگیز بن گئے ہیں! اس "قلم زدہ دور" میں اس قسم کی دینی و اخلاقی فکر غنیمت نہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے!

جیتا جاگتا اُردو ترجمہ تبصرہ کے ساتھ از:۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف (صدر شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی) ضخامت ۱۶۶ صفحات (خوب صورت اور پائدار جلد) قیمت، تین روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ اردو اکیڈمی سندھ، مولوی مسافر خانہ، بندر روڈ، کراچی۔

"حی بن یقظان" عربی ادب کی مشہور و مقبول کتاب ہے، جس کے لاطینی، انگریزی، فرانسیسی، اسپینی، جرمن، ڈچ اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں، ابن طفیل اس کتاب کا مصنف ہے، جس نے اسلامی فکر کو ایک دل چسپ قصہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے، عربی زبان و ادب کی اس شاہکار تصنیف کا اردو میں ترجمہ جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف نے کیا ہے، اور اُس پر تبصرہ بھی فرمایا ہے، اُردو ترجمہ زبان و ادب کے نقطہ نگاہ سے بہت خوب ہے!

اس کتاب کے دو۲ حصے ہیں، پہلے حصہ کے ابواب ہیں:۔

(۱) پیش لفظ (۲) تبصرہ اور (۳) ابن طفیل کا فکری تجزیہ۔

حصہ دوم ۔ (۴) ابن طفیل کے مقدمہ کا خلاصہ اور اصل قصہ:۔ حی بن یقظان' پر مشتمل ہے ۔ "تبصرہ" میں فاضل مترجم نے کتنی سچی بات کہی ہے:۔

"۔۔۔ وہ اسلام جو مخصوص اعمال اور روزمرہ کی عبادات کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک خاص اندازِ فکر ہے اور نظام کائنات میں انسان کے مرتبے اور مقصود حیات سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے، یہی نقطہ نظر اور اندازہ فکر وہ "فطرت" ہے جس کو لئے ہوئے ہر بچہ پیدا ہوتا ہے اور جس سے اس کا غیر اسلامی ماحول اس کو ہٹا دیتا ہے۔"

یہ کتاب انسان کی حوصلہ مندی، جذبہ جستجو اور سعی عمل کی فطری اور تدریجی کامیابی کی بہت دل چسپ داستان ہے اور "حی بن یقظان اگر ایک فرد انسان کی جدوجہد کی روداد نہ سہی تو انسانیت کے مجموعے کی ترقی کی داستان تو یقیناً ہے (ص ۳۶)

اس قصہ کا ہیرو حیّ سفر کی کامیابی کے بعد اہل جزیرہ کو نصیحت کرتا ہے:۔

"اس نے انہیں وصیت کی کہ جو کچھ وہ کرتے تھے، وہی پابندی کے ساتھ کئے جائیں، شرع کے احکام اور ظاہری اعمال کا خیال رکھیں، جو اُن کے لئے سود مند نہ ہو اس میں غور و خوض کم کریں اور متشابہات پر ایمان رکھیں اور اُنہیں مانیں، بدعتوں اور ہوائے نفسانی سے بچیں، سلف صالح کی پیروی کریں۔ نئی نئی پیدا کی ہوئی باتوں کو چھوڑیں، اُس نے انہیں یہ بھی ہدایت کی کہ او رجہاں تک ڈرایا جا سکتا تھا اس بارے میں ڈرایا بھی کہ عام لوگ جس طرح شریعت سے غفلت برتتے اور دنیا پر ٹوٹے پڑتے ہیں اس سے احتراز کریں ۔۔۔۔"

یہ رائے کتنی صائب، یہ فکر کس قدر مستقیم اور کتاب و سنّت کے مطابق ہے۔

"میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ترجمہ نص سے جتنا بھی ممکن ہو قریب ہو" (ص ب) "نص" کی جگہ "متن" لکھنا تھا "سچ پوچھیے تو حدیث و سنت کا انکار کسی مسلمان کے لئے بڑا ہی ناممکن ہے"۔ (ص ۱۵) "قطعاً ناممکن" کا محل تھا "عقائد کے بارے میں عقل و سمجھ سے کام لے کر۔۔۔" (ص ۲۱) "عقل اور سمجھ" لکھنا چاہیے تھا، عربی اور اردو کے لفظوں کے

درمیان واو عطف نہیں آتا۔

"لیکن اس نے دیکھا کہ وہ (یعنی حیوانات) سب کے سب صرف اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنی غذا حاصل کریں، اور کھانا، پینا، نکاح، سایہ اور گرمی جیسی خواہشات پوری کریں۔" (صـــ ۱۱۲)

اس جملہ کا ترجمہ پھیلا کر کرنا چاہیئے تھا، گرمی اور سایہ حیوانات کی کسی خواہش کا نام نہیں ہے، ہاں! گرمی سے فائدہ اٹھانا اور سایہ میں آرام کرنا، یہ حیوان کی خواہش ہے، پھر حیوانات کے بارے میں "نکاح" کی ترجمانی "مباشرت" ہونی چاہیئے۔

یہ کتاب کوئی شک نہیں اردو زبان وادب میں قابل قدر اضافہ ہے، قابل مترجم عربی کی دوسری شاہکار کتابیں بھی اسی نہج پر اردو میں منتقل فرماتے رہیں، تو وہ اخلاق وادب کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے!

سوز و ساز از:- فاروق بانسپاری، ضخامت ۱۰۴ صفحات (کاغذ، کتابت اور طباعت دیدہ زیب) قیمت غیر مجلد دو روپے مجلد دو روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- کتاب محل، دال منڈی بنارس۔

جناب فاروق بانسپاری تعمیر پسند شاعر ہیں ان کی نظموں میں مقصدیت اور پاکیزگیٔ فکر کے ساتھ روانی اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے، فاروق صاحب کی نظموں کے اس مجموعہ پر تعارف پروفیسر محمد نصراللہ انصاری (ایم اے) نے لکھا ہے۔

چند منتخب اشعار:-

ڈالر کے جادو کا تارا — ناچ رہا ہے مشرق سارا
جو بو کر، گیہوں کی آشا — ملکوں ملکوں یہی تماشا
پاپی نے اشنان کی ٹھانی — گنگا ہو گئی پانی پانی
مندر کا دروازہ کھولا — سنگھاسن بھگوان کا ڈولا

دبا کر جبر سے اپنے پرائے رکھے جاتے ہیں
یہاں زخموں پہ شمشیروں کے پھائے رکھے جاتے ہیں

یہاں قانونِ انسانی کے آگے سر نہیں جھکتا — یہاں تعظیم شبنم کے لئے گوہر نہیں جھکتا
قرابت کی یہاں مرضی پہ سیارے نہیں چلتے — خزف ریزوں کے پیچھے چاند اور تارے نہیں چلتے
یہاں کم زور سلطانوں کا رستہ روک دیتی ہے — یہاں فاروق اعظم کو ضعیفہ ٹوک دیتی ہے
خلافِ حق کسی کو سعی کا یارا نہیں ہوتا — زمینوں کا یہاں طاقت سے بٹوارا نہیں ہوتا

غم اکل حلال انساں کو دیتا ہے شکیبائی
یہاں فاقوں میں چلتی ہے شہ خیبر کی برنائی (نظم دنیائے اسلام)

تصویر کے غم میں تا بہ کجا پانی پہ لکیریں کھینچو گے
تم چاہِ زنخداں سے کب تک افکار کی کھیتی سینچو گے
سیلاب حوادث کے آگے یہ ریت کی دیواریں کب تک
توپوں سے بھلا ٹکرائیں گی پازیب کی جھنکاریں کب تک

"نکتہ توحید" کے چند شعر:۔

آج کتنا متوازن ہے ہمارا اسلام   بندۂ حق بھی ہیں ہم لوگ بتوں کے بھی غلام
آ ادھر نکتہ توحید بتادوں تجھ کو!   ایک دین، ایک خدا، ایک نبی، ایک نظام
ایک دھبا ہے جبیں پر وہ نشانِ سجدہ   جو تری شب کے لئے بن نہ سکا ماہِ تمام

"ابلیس کے خطبۂ صدارت" کا آخری شعر:۔

جس طرح بھی ممکن ہو جوانانِ حرم کو
مودودیٔ حق کیش کے پھندے سے بچاؤ

ان شعروں میں کتنی توانائی اور جان پائی جاتی ہے۔

پھنس جاتی ہے جب ناؤ کبھی اس کی بھنور میں   گرداب کے سینے سے ابھرتے ہیں کنارے
میدانوں کی تقدیر بدل دیتے ہیں دن میں   راتوں کو مصلے پہ جو ڈھلتے ہیں ستارے (مجاہد)

ہونٹوں پہ تبسم ہو تو نکھری ہوئی جنت   آنکھوں میں جو آنسو ہو تو بہتا ہوا کوثر
برہم ہو تو لگنے لگے شعلوں کو پسینہ   شاداں ہو تو شبنم سے بھی خنکی میں فزوں تر
سختی بھی قیامت کی نزاکت بھی بلا کی   کہہ سکتا ہے پھر کون یہ شیشہ ہے کہ پتھر (عورت)

وہ باغباں ہے ننگ گلستاں ترے بغیر   اک بوجھ ہے زمیں پہ مسلماں ترے بغیر
جو رشکِ گلستاں تھے وہ لالے نہیں رہے   صحرا کو رنگ بخشنے والے نہیں رہے
شانِ وفا دکھا کے مسلماں چلے گئے   اس انجمن سے بوذر و سلماں چلے گئے
مسلک تھا جن کا حال وہ بندے ہیں قال کے
حسنِ اذاں ہے سوگ میں عشقِ بلالؓ کے (عشق)

زندگی شیشہ بھی ہے فولاد بھی   زندگی پرویز بھی فرہاد بھی
بندۂ حق ہے زمانہ کا امام   کارِ مومن احتسابِ صبح و شام

قیامت ہے کہ کوئی بھی شریکِ غم نہیں میرا   مزہ یہ ہے کہ ہر شے کا چمن میں رازداں میں ہوں
کچھ ایسے بھی فسانے ہیں کہ جن کی میں حقیقت ہوں   کچھ ایسے بھی حقائق ہیں کہ جن کی داستاں میں ہوں
اجازت ہو تو میں عشق و ہوس کا فرق بتلا دوں   کوئی دیوانہ بنتا ہے، کوئی دیوانہ ہوتا ہے
اسیرانِ طلسم آہن و فولاد کے حق میں   مری خارا شگافی یا تری شیشہ گری اچھی
اگر صدہا خداؤں کی پرستش سے نہیں چارا   تو پھر اے بندہ پرور! ایک ہی کی بندگی اچھی
وفا کرے گی کسی اور سے بھلا کب تک   وہ شے جو قیصر و کسریٰ کو بھی نہ راس آئی

دوسرا رخ:۔

بعد ہے کتنا فکر و عمل میں   دنیا سر پہ، چیز بغل میں (ص ۱۲)

مصرعہ ثانی میں شدید ابہام پایا جاتا ہے، اردو کی اصل کہاوت یوں ہے — "بغل میں لڑکا، شہر میں ڈھنڈورا۔"

سرتاپا "مظہر العجائب   حاضر کی نظروں سے غائب (ص۱۳)

مصرعِ اولیٰ بحر سے خارج ہے۔

سستی شہرت کے دلدادہ   شاعر کم متشاعر زیادہ (ص۱۶)

"زیادہ" بروزن "لبادہ" ہے اس طرح:۔

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ   بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

مگر اس شعر میں "زادہ" کے وزن پر نظم کیا گیا ہے۔

سرگرمیٔ محفل ہو کہ ہنگامۂ میداں   اللہ رے اس مردِ خوش اوقات کے انداز (ص۱۸)

"گرمیٔ محفل" کا محل تھا۔ شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے "سرگرمی" لانا پڑا۔

یہاں سرچشمۂ جاہ و حشم قرآن ہوتا ہے   یہاں کا ہر گدا اپنی جگہ سلطان ہوتا ہے (ص۲۳)

مصرعِ ثانی کس قدر چست اور زوردار ہے مگر مصرعِ اولیٰ میں "سرچشمۂ جاہ و حشم" نے شعر کو کمزور کردیا۔

غزالانِ حرم کی اس قدر محفوظ ہیں راہیں   ہڑپ لیتی ہیں صیادوں کو خود ان کی کمیں گاہیں (ص۲۴)

"ہڑپ لیتی ہیں" نے "شعریت" کو غارت کردیا۔

تجدید کا سوز آفاقی احساس سے جب ٹکرائے گا
زلفوں کے خنک سائے میں تمہیں رہ رہ کے پسینہ آئے گا (ص۳۲)

"یہ تجدید کا سوز آفاقی" کیا بلا ہے؟

مذاقِ جائزہ اچھا، ہوائے آگہی اچھی   مگر اپنی حقیقت سے نہیں یہ بے رخی اچھی (ص۵۶)

"مذاقِ جائزہ" اور "ہوائے آگہی" نے شعر میں ابہام پیدا کردیا

مقابل نوریوں کے آدمی خاکی بھی جا پہونچا   حریم قدس میں شہ کارِ بے باکی بھی جا پہونچا (ص۶۸)

ممکن ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو کہ "آدم خاکی" کی جگہ "آدمی خاکی" کتابت ہوگیا؟ "شہ کارِ بے باکی" کس قدر غریب ترکیب ہے

حاملِ فقرِ محتشم! اے شیفتہ غنا نہ بن!   صاحبِ قلبِ حق نما! جامِ جہاں نما نہ بن (ص۷۷)

اس شعر میں کتنی ناپختگی پائی جاتی ہے۔

دل ہو ہزار چاک چاک شرطِ ادب مگر یہ ہے   کلیوں کا بھی حضورِ دوست باغ میں ہم نوا نہ بن (ص۷۷)

"کلیوں کا بھی" میں جو حروف دب رہے ہیں، ان سے شعر کی روانی اور نغمگی بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ پھر "کلیوں کی ہم نوائی" سے آخر کیوں روکا جا رہا ہے؟ یہ کیا اشاریت اور تلمیح ہے؟؟

خواجگیٔ منات کی بخششِ عالم سے گزر   طائرِ گلشنِ خلیل! دانہ و دام سے گزر (ص۷۸)

مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے مگر یہی بات دلکش انداز میں کہی جاسکتی تھی۔ حضرت خلیل کا جہاں تقابل ہو وہاں "لات و منات" سے زیادہ موزوں تشبیہ "آزر و نمرود" کی ہے۔

"سوز و ساز" مجموعی طور پر سنجیدہ اور باوقار شعری پیش کش ہے، بعض نظمیں بڑی ولولہ انگیز ہیں، جناب فاروق بانسپاری کے مستقبل سے شعر و ادب اور اخلاق و تہذیب اچھی امیدیں رکھتے ہیں۔

سحر کا انتظار تھا

از :- ابوالخطیب ، ضخامت ۲۶۴ صفحات ، رنگین وجاذب نظر سرورق
قیمت :- دو روپے پچاس پیسے -
ملنے کا پتہ :- الحمرا پبلیکیشنز ۔ ۸۵ ۔ جرا آبی ، محمود آباد ، کراچی ۳

جناب ابوالخطیب جانے پہچانے ادیب ہیں ، ان کے چند افسانے ملک کے جرائد میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں ـــــ ابوالخطیب کی یہ پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے ، یہ ناول اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے ، اس کے بعض حصے چونکا دینے والے ہیں ، ابوالخطیب کا یہ ناول اُن کے برسوں کے تجربہ و مُشاہدہ کا عکاس و ترجمان ہے ، انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے ، اُسی کو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے !

اس ناول میں ہوس کی دست درازیاں بھی ہیں ، ضمیر کی گرفت بھی ہے ، تو یہ و ندامت بھی ہے ، اس میں بعض "کردار" نماز پڑھتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں ، مگر ناول نگار کی طہارتِ فکر کے باوجود بعض مقامات پر جنسی جذبہ اور ہوا و ہوس کی عکاسی خاصی کھل کر کی گئی ہے !

" ۔۔۔ بیرے کو بڑی فحش سی گالی دی جاتی ، اور وہ دور سے ذرا سخت لہجہ میں اپنے آنے کی اطلاع دیتا " (صـ۷) کسی چھوٹے سے چھوٹے ہوٹل کے " بیرے " کو بھی گاہک گالیاں نہیں دیا کرتے ۔ ۔ ۔ جملہ کا آخری ٹکڑا " ترجمہ " سا معلوم ہوتا ہے " آہستہ آہستہ رات کی رنگینیوں نے پھر سر اٹھایا " (صـ۸) " رنگینیوں کا سر اٹھانا " یہ اندازِ بیان نشاط و کیف کی ترجمانی نہیں کرتا ـــ " وہاں وہی تو پکا سہارا ہے " (صـ۹) سہارے کو " پکا " اور " کچا " نہیں کہتے ، مضبوط اور کمزور کہتے ہیں !

" اے جوا مرگ ، ابھی تو تیرے دن ہیں " (صـ۱۲) " جواں مرگ " لانے کا یہاں کوئی محل ہی نہیں تھا ـــ نیا گلشن بنانے میں ایسی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے " (صـ۱۲) گلشن بنایا نہیں لگایا اور سینچا جاتا ہے ـــ " خدا ہمیں قبول کرے " (صـ۱۲) یہ کیا زبان ہے ـــ " کیا میرے پاس کھتی گھڑی ہے " (صـ۱۳) " کھتی " (ک پر زبر کے ساتھ) پڑ پیش " (ضمہ) نہ جانے کاتب صاحب نے لگا دیا ہے یا ناول نویس صاحب اس لفظ کو اس طرح بولتے ہیں ، پھر " کھتی " کے لئے " گھڑنا " نہیں " گڑنا " بولا جاتا ہے ۔ " کھتی " زیور کی طرح " گھڑی " نہیں جاتی بلکہ زمین میں کھود کر بنائی جاتی ہے ، " اماں تمہیں کیا ہو گیا ہے ، گھر میں آکر بیٹھے اور تم نے رن شروع کیا " (صـ۱۴) " رن شروع کیا " یہ آخر کہاں کی زبان ہے ۔

" بلکہ صدر ہونے کے بعد ان کا دل اور بھی نرم پڑ گیا تھا ۔ اسی طرح نرم جیسے صدیق اکبر کا دل " (صـ۱۷) اس تشبیہ میں بڑا مبالغہ پایا جاتا ہے ، جو دینی فکر رکھنے والوں کو تکلیف دہ حد تک کھٹکتا ہے ـــ " بھری جوانی " (صـ۲۲) " بھرپور جوانی " روزمرہ ہے ۔ " وہ بھی بان دھان سے " مسلح ہو کر (صـ۲۳) " دھان پان " اصل روزمرہ ہے ، جس سے صفت نزاکت کی ترجمانی ہوتی ہے ، جگر مراد آبادی کا شعر ہے ؎

صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے
تو یوں ہی دھان پان ہے پیارے

" پان دھان " بننے سنورنے کے معنی میں اردو کا روزمرہ نہیں ہے ـــــــ " انھوں نے اسے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ کوئی " گویا وہ کتیا ہو " (صـ۲۵) " گویا وہ کتیا ہو " اس ٹکڑے نے پوری عبارت کا ستیاناس کر دیا ـــ " وہ بالکل بیہوش نہیں ہوئی ضرورت پر اس کے ہاتھ پیر ضرور ہل رہے تھے ، لیکن یہ کام وہی کرتی ، جو یہ دباؤ چاہتا " (صـ۲۶) ابوالخطیب کی تحریر میں اس قسم کے جملے ـــ (جو یہ دباؤ چاہتا) آجاتے ہیں ، وہاں وجدان خاصی ناگواری محسوس کرتا ہے ، اتنے زمانے کی مشق کے بعد بھی تحریر میں

پختگی اور کچے پن کا پایا جانا حیرت انگیز ہے۔

"اس معصوم بن کھلے پھول کو توڑ کر اس راہ پر لگا دیتی جسے ہم بردہ فروشی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔" (ص۴۷) "پھول کو توڑ کر راہ پر لگا دینا" یہ کیا انداز بیان ہے؟ —— "صحت اچھی تھی بھرا ہوا جسم جو لباس پہنتا اس میں خوب پھبتا۔" (ص۵۵) لکھنا یوں چاہیے تھا ..... اُس کے جسم پر ہر لباس پھبتا —— "اچھا! لیکن خالہ تو ہمیں باسی کوسی عورتیں کھلا رہی ہیں۔" (ص۵۶) "استعمال کی ہوئی عورتوں" کو "باسی کوسی" کہنا ہی کچھ عجیب نہ تھا کہ "عورتیں کھلا رہی ہیں" نے اس اعجوبہ کو مضحکہ بنا دیا، قابل نفرت مضحکہ!! — توبہ!

"ارے! بیٹھ لونڈے، تیرے ابھی سے پر نکلنے لگے۔" (ص۵۷) "ابے" "ارے" لونڈے، لونڈیا، بچھیا اور تو تڑاق کو مکالمہ میں لا کر، ناول نویس غالباً یہ سمجھتا ہے کہ وہ عوامی بولی ٹھولی کو پیش کر رہا ہے، حالانکہ! یہ انداز بیان بڑا کمزور ہے اور ناول نویس کی زباں دانی کا کوئی اچھا تعارف نہیں ہے —— "اُس کے جذبات طرح طرح کے گمانوں میں رنگ گئے۔" (ص۶۸) "جذبات کا گمانوں میں رنگنا" اس میں کتنی بناوٹ پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۷۰ پر ایک جملہ ہے "... صحاح ستہ کھول کر بیٹھ سے کہا" اس پر ناول نویس نے نوٹ دیا ہے "مختلف حدیثوں کی ایک کتاب جو مسلمانوں کے سب فرقوں میں قابل اعتماد ہے۔" حالانکہ "صحاح ستہ" ایک کتاب نہیں ہے، احادیث کی چھ کتابوں کو "صحاح ستہ" کہتے ہیں، جن کے نام یہ ہیں —— (۱) بخاری (۲) مسلم (۳) ترمذی (۴) ابوداؤد (۵) ابن ماجہ اور (۶) نسائی۔

"وہ اس کے سامنے عورت پر ٹوٹا ہی کچھ اس طرح تھا۔" (ص۶۰) "رہا" لکھنا چاہیے تھا —— "مجھے لاڈ و پیار کر مصیبت سے پالا گیا۔" (ص۷۲) "لاڈ پیار" کے درمیان "واوِ عطف" لانے کی کیا ضرورت ہے، سوچ بچار، لاڈ پیار، سمجھ بوجھ تنگی ترشی وغیرہ الفاظ واوِ عطف کے بغیر بولے اور لکھے جاتے ہیں — "وہ کلثوم کے چہرے پر ایک عجیب و غریب پراسراریت کی کیفیت کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھتی (ص۷۵) "پراسراریت" کے جھمیلے میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی، پراسرار کیفیت سیدھا سادہ انداز بیان کافی اور موزوں تھا۔ ص۹۷ پر "چھیڑ خانی" کا املا "چھیڑ خوانی" نظر سے گزرا۔

"اس کے وجود پر ذہن کی گرفت کے بعد باپ کے پیار کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔" (ص۱۲۶) آورد ہی آورد اور تکلف ہی تکلف یہ تو حافظ جی کی غریب لونڈیا تھی، جس کے پاس پیسے تو درکنار، یہاں کوئی پانی دینے والا بھی نہیں۔" (ص۱۵۲) ذوشعوں کا سا انداز بیان، روزمرہ یوں ہے، —— "نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوا" —— "مالک مکان کے بال بچے ذرا تفریح کے لئے کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔" (ص۱۵۲) "ذرا" یہاں بے ضرورت اور بالکل زائد استعمال کیا گیا ہے —— "بڑھیا بڑی محبت سے اس کی ہر حس کو مُردہ کرتی۔" (ص۱۵۹) وجدان اس قسم کے طرز نگارش میں کس قدر گھٹن محسوس کرتا ہے —— وہ بڑا غفور الرحیم ہے، ایک نظر پر وہ بخش دیتا ہے (ص۱۶۳) "ایک نظر پر بخشنا" یہ کیا بات ہوئی!

—— "پھر بھی بوڑھے باپ کی محبت پیر سے مسلے ہوئے کیڑے کی طرح اس کے دل میں تڑپ رہی تھی (ص۱۶۷) اس تشبیہ میں ندرت تو ہے مگر ایسی ندرت جس سے توحش پیدا ہوتا ہے —— "بیڑی اور پان صبح سے نہ کھایا تھا۔" (ص۱۹۰) زندگی میں پہلی بار اس کا انکشاف ہوا کہ "بیڑی" بھی کھائی جاتی ہے!! —— "خالہ نے پھر ظہور کو اپنے حالات اور ارادے سے آگاہ کیا تھا اور بتایا کہ اسے کچھ اور سیٹھوں سے وصول کرنا ہے، لیکن دیر اس کی ہے کہ یہ راستے پر آئے۔" (۳۲۰) دیر اس کی

ہے یہ رستے پر آگئے" اس آخری ٹکڑے نے عبارت کو "کاواک" بنادیا۔

"اس کی چال ڈھال تو اس وقت چور کی سی ہو گئی تھی، جو مال چرا کر لے جا رہا ہو۔ لیکن اس کا دل اس حالت سے آزاد ہو (ص۲۳۹) "اس کا دل اس حالت سے آزاد ہوئے" ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ــــ "کوٹری پر جب گاڑی رکی تو لوگوں نے اپنے اپنے بستر ٹھیک کرنا شروع کئے" (ص۲۵) کراچی آنے والے مسافر "کوٹری" پر بستر ٹھیک نہیں کیا کرتے کہ کراچی کا تقریباً تین گھنٹہ کا وہاں سے سفر رہ جاتا ہے! "جنگ شاہی" یا کوئی دوسرا قریب کا اسٹیشن لکھنا تھا۔

جناب ابو الخطیب کی شہرت، ناموری، ترقی اور ادبی مستقبل کی درخشانی کا ہم سے بڑھ کر شاید ہی ان کا کوئی دوست متمنی ہوگا، مگر انہیں "زبان" کی صحت اور لفظوں کے صحیح استعمال پر پوری توجہ کرنی چاہیے یہ خامیاں دور ہو گئیں تو ان کی تعمیری فکر اور افسانوی صلاحیت انہیں ناول و افسانہ کی دنیا کا ہیرو بنا سکتی ہے۔

درد سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
Opal
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
کفسول شربت
اوپل لیباریٹریز لمیٹڈ۔ کراچی

نئی منزلیں، نئے عزائم
مغربی پاکستان کا عظیم طبی ادارہ ——— اشرف یونانی لیبارٹریز
مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف
کے زیرِ نگرانی گذشتہ تیس برس سے نوعِ انسانی کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمارا بنیادی مقصد طبِ یونانی کو خود کفیل بنانا ہے۔ ہم بصد فخر و انبساط اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے شعبۂ تحقیق نے سالہا سال کی ریسرچ اور کاوش کے بعد چند ایسی ادویات ایجاد کرلی ہیں جنہیں الکحل کے بغیر تیار کرنا بعید از امکان خیال کیا جاتا تھا۔ ان میں درج ذیل ادویات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
● سعالین، کھانسی کی زود اثر ٹکیاں ● سعرفینی۔ کھانسی کے لیئے ایک مؤثر شربت ● اشرف بال ٹانک، توانائی سے بھرپور، بچوں کا مرغوب شربت ● یونانی گرایپ واٹر۔ بچوں کا نظامِ ہضم درست رکھنے کے لیے ایک مجرب غذا ● صیفولین۔ خون صاف کرنے کی دوا ● لنگزول نزلہ، زکام، پھیپھڑوں کی کمزوری اور ابتدائی سل و دق کے لیے ● بخاروک۔ ہر قسم کے بخار کے لیئے تیر بہدف علاج ● کانول کان کے درد کی اکسیر ● اشرف برانڈ شربت فولاد۔ خون کی کمی کے لیئے فولاد کا مؤثر ترین شربت
● یونانی شربت فولاد۔ خون کی کمی دور کرنے کے لیئے فولاد اور محلول کچلہ کا مرکب
یہ ادویات ہر اہم شہر، قصبہ اور دیہی آبادی میں دستیاب ہیں۔ اس غیر معمولی کامیابی سے ہماری جو حوصلہ افزائی ہوئی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم چند مزید ایسی ادویات تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو طبِ یونانی کی ترقی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں یہ ادویات شامل ہیں۔
یونانی ایسٹرنسیرپ —— اعصابی قوت کی بحالی اور استحکام کے لیئے فولاد، کچلہ اور ... کا مرکب
روح فولاد —— چہرے کی زردی، ہضم کی خرابی اور عام کمزوری کے لیئے
جوشاندولین —— نزلہ زکام، کھانسی اور اعضاء شکنی کے لیئے
کیسٹرول —— بے مزہ قبض کشا گولیاں
قومی صحت کا مسئلہ حل کرنے کے لیے طبِ یونانی کا فروغ ازبس ضروری ہے
فنِ طب کی خدمت خلقِ خدا کی خدمت کا ایک اہم ذریعہ ہے ○
AFP
اشرف
ASHRAF UNANI LABORATORIES, REGD.
اشتباہ
دوائی خرید کرتے وقت شیشی اور ڈبے پر سامنے دیئے گئے مونوگرام کا اطمینان ضرور کرلیں
فہرست ادویات مفت طلب کریں —— ہمارے ترجمان ماہنامہ رہنمائے صحت کا نمونہ منگوانے کیلئے بیس پیسے کے ٹکٹ بھیجئے
ناظمِ اعلیٰ اشرف یونانی لیبارٹریز پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱ لائل پور
پاک

ماہر القادری

فاران
کراچی

پاکستان

ماہر القادری

رکن : انجمن ادبی رسائل پاکستان

فاران
کراچی

جلد : ۱۳
شمارہ : ۷

ایڈیٹر : ماہر القادری
اکتوبر ۱۹۶۱ء

ترتیب

چندہ سالانہ :- چھ روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے (۸۱)

مقامِ اشاعت : مکتبہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۲

پرنٹر پبلشر : مسرور حسین
مطبوعہ : مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ اوّل

سالہائے گزشتہ کی طرح اس سال بھی سیرت النبیؐ کے جلسوں میں شرکت کی سعادت میسر آئی، یہ تاثرات انہی جلسوں سے ماخوذ ہیں!
اُمتِ مسلمہ جس میں یہ گناہگار بھی شامل ہے، صدیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں عقیدت کے ہدیے پیش کر رہی ہے، مگر اس طرف مسلمانوں کی توجہ بہت ہی کم جاتی ہے کہ "خراجِ عقیدت" کے ساتھ ہمیں خراجِ اطاعت بھی پیش کرنا چاہیے کہ اصل چیز "اطاعت" اور "فرمانبرداری" ہے! وہ عقیدت جو اطاعت سے خالی ہو، بے رُوح اور بے وزن ہے، اُن غلاموں کو کیا کہیے، اور اُن کو کس نام اور لقب سے یاد کیجیے، جو اپنے آقا کی تعریفیں کرنے میں تو بڑی تیزی اور جوش دکھائیں، مگر اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں انتہائی سُستی اور غفلت سے کام لیں، جیسے "اطاعت و فرمانبرداری" کی ذمہ داری سے اُن کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے! اُن کا فرض اطاعت نہیں صرف قصیدہ خوانی اور منقبت نگاری ہے ——— آج ہم مسلمان "اطاعت گزار" بننے کی بجائے "جلسہ باز" بن کر رہ گئے ہیں، اور اپنی اسی حالت پر قانع ہیں، خوش ہیں اور مُطمئن ہیں.......

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

جس طرح ہم مُسلمانوں کی زندگیاں عام طور پر نام و نمود، ٹھاٹ باٹ اور عجمی تکلفات کا مظہر بن کر رہ گئی ہیں، اسی طرح ہمارے یہ جلسے بھی اسلامی سادگی سے معرا نظر آتے ہیں، وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب لوگ مسجدوں کی آرائش میں منہمک ہو جائیں گے، تو نماز میں غفلت برتیں گے ——— تو آج ہماری اُبھلی زندگی کا یہی حال ہے کہ ہم ظاہری چمک دمک میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اور دین کے تقاضوں سے غفلت برتنا ہمارا شعار بن گیا ہے! سیرت کے ان جلسوں کی آرائش میں کس قدر مبالغہ کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات مُبالغہ "اسراف" کی حد تک پہنچ جاتا ہے، اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا کہ ان جلسوں میں اگر اسلام کی سادگی کا لحاظ رکھا جائے، تو کتنی بھاری رقمیں بچ سکتی ہیں، جو غریبوں، ناداروں اور حاجت مندوں کے کام آسکتی ہیں، یہ تو اُس انسانِ کامل کی سیرتِ مقدسہ کے جلسے ہیں، جو:-

غریبوں کا ملجا، اور ضعیفوں کا ماوا
تھا ——— اور
سلام اُس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا

میلاد و قیام!

مشاہیر کی پیدائش اور موت پر "یوم" (DAY) منانے کی رسم اہلِ عجم کی ایجاد ہے، مسلمان اس قسم کی تقریبات اور رسموں سے ناواقف تھے اور تاریخ و سیر کی کسی ضعیف کیا موضوع روایت میں بھی یہ نہیں ملتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یا حضورؐ کے کسی خلیفہ او صحابی کی زندگی میں کوئی سال گرہ منائی گئی ہو، یا اُن کی ولادت اور وفات کے "دنوں" نے اُمت میں "تقریب" (CEREMONY) کی حیثیت اختیار کی ہو۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی نہ جانے کتنی عجمی

رسموں کو مسلمانوں نے اختیار کر لیا ہے اور ان پر "عقیدت و محبت" کے لیبل لگا دیئے گئے ہیں۔

پیدائش اور موت کے دن (DAY) تو لیڈروں کے منائے جاتے ہیں تاکہ اس طرح لوگ انہیں بھولیں نہیں، ان کی یاد تازہ ہوتی رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہم مسلمانوں کا تعلق ایک دن یا ایک مہینہ کا نہیں، حضورؐ سے ہم غلاموں کا تعلق تو ساری زندگی کا ہے، خلوت وجلوت، نشست وبرخاست، اکل وشرب، عبادت، تجارت، معیشت، سیاست، جنگ وصلح، شادی وغمی، تفریح ومزاح غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حضورؐ ہی کا اُسوۂ حسنہ ہمارے لئے نمونہ اور دلیلِ راہ ہے! ہر مہینہ، ہر دن بلکہ ہر ساعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ساعت ہے۔

اک لحظہ اُن کی یاد سے غفلت ہے معصیت
آٹھوں پہر تصورِ جانانہ چاہیے

اس لئے ان جلسوں کا عنوان "جلسۂ سیرت" ہونا چاہیے، نہ کہ "یومِ میلاد" کہ "یومِ میلاد" تو لیڈروں کا منایا جاتا ہے! حضورؐ کی یاد، حضورؐ کا ذکر اور حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ اور ذاتِ گرامی تو مشاہیر اور لیڈروں سے بلند تر ہے، اتنی بلند کہ فرش اور عرش کی نسبت بھی پستی اور بلندی کے اس تفاوت کو ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن اور حضورؐ کی جوانی، ان سب میں انسانیت کے لئے نمونہ ہے! مکہ کا ماحول فسق وفجور کا ماحول تھا۔ نفس کی ترغیبات کے لئے قدم قدم پر جال بچھے تھے، مگر حضورؐ کی جوانی اس ماحول میں اس پاکبازی اور معصومیت کے ساتھ بسر ہوئی کہ سرکارؐ کے دامنِ کردار کو اس ماحول کا گرد وغبار بھی نہ چھو سکا، حضورؐ کی سچائی اور امانت وراستبازی سے متاثر ہو کر قوم نے آپ کو "الامین" کا خطاب دیا! حضورؐ کی سیرت کے یہ واقعات یقیناً قابلِ تذکرہ ہیں۔

—— مگر ——

یہ عالم "انتظار وحیرت" تھا، جسے قرآنِ کریم میں —— فوجدک ضالاً —— سے تعبیر کیا گیا ہے، اس "انتظار وحیرت" کے بعد "فہدیٰ" کی اصل منزل آتی ہے، یہی "بعثتِ نبوی" ہے، اور حضورؐ کی زندگی کا یہی دور انسانیت کے لئے کامل نمونہ ہے! اس لئے بعثت کے بعد کی زندگی صحیح روایتوں کے ساتھ سیرت کے جلسوں میں بیان کی جانی چاہیے کہ اسی کی اتباع اصل مقصود ہے!

ہم اپنی ماؤں، خالاؤں، بیٹیوں اور بہنوں، اور دوسری قرابت دار عورتوں کے لئے یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کی زچگی کے حالات، دوسروں کے سامنے بیان کریں، کہ فلاں مہینہ میں حمل قرار پایا۔ پہلے مہینہ یہ کیفیت گزری، دوسرے مہینہ میں یہ حالت رہی۔۔۔! ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے ہماری غیرت عار محسوس کرتی ہے —— حیرت ہے کہ یہ کیسے "عاشقانِ رسولؐ ہیں" جو حضورؐ کی والدہ ماجدہ کے بارے میں "رحم وحمل" کی کیفیات وحالات بھرے جلسوں میں بیان کرتے ہیں، اور اس "تذکرہ" کو فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں جیسے اس تذکرے کے بغیر سیرت کا جلسہ ادھورا رہ جاتا ہے —— پھر حضورؐ کی ولادت کا حال بیان کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قیام کی حالت میں "صلوٰۃ وسلام" پڑھتے ہیں۔

"صلوٰۃ وسلام" کی اہمیت، برکت اور سعادت اپنی جگہ مسلّم ہے، زندگی میں ایک بار تو حضورؐ پر درود بھیجنا "فرض عین" ہے اور اس کی مداومت سے قلب کو جلا اور روح کو پاکیزگی ملتی ہے! "صلوٰۃ وسلام" کے فوائد وبرکات کی کوئی حد وانتہا نہیں!

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد وبارک وسلم ——

—— مگر ——

نہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، نہ حضورؐ نے اس کا حکم دیا، نہ صحابہ نے ایسا عمل کیا، نہ تابعین، تبع تابعین، اور فقہ و حدیث کے ائمہ ایسا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کرنے کے بعد، کھڑے ہو جائیں، اور کھڑے ہو کر "صلوٰۃ و سلام" پڑھا کریں! دین میں "قیام میلاد" کی کوئی ضعیف سے ضعیف سند بھی نہیں ملتی، اور جس فعل کی شریعت میں سند نہ ملے، وہ "بدعت" ہے، اور "بدعت" خیر کا سبب ہو ہی نہیں سکتی! اگر بعض لوگوں کو "قیامِ میلاد" میں لطف آتا ہے، تو لوگوں کا "لطف اور شوق" چاہے وہ کسی عالم دین اور بزرگ ہی کا "لطف" اور "ذوق و شوق" کیوں نہ ہو، دین میں قابل اعتبار نہیں ہے! دین کا معاملہ لوگوں کے ذوق و شوق پر چلنے لگے تو اللہ کا دین کھیل بن کر رہ جائے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک شخص کو عیدگاہ میں عید کی نماز سے قبل نفل پڑھنے پر سختی کے ساتھ ٹوکا اور وہ اس لئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کرنا ثابت نہیں تھا، حالانکہ "نفل" نماز اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، مگر عبادت ہو یا کوئی دوسرا کام، دین میں اسی وقت تک معتبر و مستند نہیں ہو سکتا، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور منشاء و ایما کی اس پر چھاپ نہ لگی ہو!

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

دین نام ہی اتباع رسولؐ کا ہے، حضورؐ کی اطاعت ہی ایمان کی جان ہے، کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے جس "فعل" کے لئے دلیل نہ ملے، اس "فعل" کا دین میں کوئی وزن اور اعتبار نہیں چاہے اس کے کرنے والے کتنے ہی بزرگ و محترم کیوں نہ ہوں! اگر "قیامِ میلاد" میں دین کی کوئی بھلائی ہوتی، تو کتاب و سنت میں اس کا ذکر آنا چاہیئے تھا یا پھر صحابہ کرام جن کا "عشقِ رسولؐ" معتبر تھا اور محبت نبیؐ اور تعظیم و احترام نبیؐ کے تقاضوں کو ہم سے بہت زیادہ جانتے اور پہچانتے تھے، "قیامِ میلاد" کیا کرتے۔ "قیامِ میلاد" پریس، ٹیلیفون اور ہوائی جہاز کی طرح کوئی "ایجاد" نہیں ہے، جسے تمدن کی ضرورت وجود میں لاتی ہے، یہ تو ایک "فعل" ہے، جسے باعث ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے اور اس کے ترک کرنے والوں پر نکیر کی جاتی ہے! اسی کا نام بدعت ہے۔

"قیامِ میلاد" کے لئے اس حدیث سے دلیل لانا جس میں قوم کے اکابر کی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، قیاس مع الفارق نہیں تو اور کیا ہے، حدیث[۲] اپنی جگہ بے شک صحیح ہے مگر "قیامِ میلاد" سے اس حدیث کا دور کا ربط بھی نہیں ہے، حضورؐ نے یہ کب فرمایا تھا کہ میری ولادت اور آمد کا جب ذکر کیا جائے، تو مسلمانوں کو میرے اکرام و اجلال (Honours) میں تعظیم کے لئے کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنا چاہیئے! اگر انبیاء کرام کی ولادت کے وقت "قیام" میں دین کا کوئی نفع ہوتا، تو قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کا جو ذکر آیا ہے، اس وقت "قیام" کا حکم دیا جاتا۔

جو کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ "محفل میلاد" میں "قیام" کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں، یا حضورؐ کی روح پر فتوح کا نزول ہوتا ہے، تو یہ عقیدہ سراسر گمراہی ہے، حدیث میں بس اتنا ملتا ہے کہ حضورؐ پر جو کوئی صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہے، وہ حضورؐ پر پیش کئے جاتے ہیں، یہ کسی حدیث میں نہیں آیا کہ جہاں "صلوٰۃ و سلام" پڑھا جاتا ہے، وہاں حضورؐ کی روحِ مقدسہ موجود ہو جاتی ہے!

مسلمانوں کا بس ایک ہی نعرہ ہے، اور وہ نعرۂ تکبیر (اللہ اکبر) ہے! یہی نعرہ جنگ کے میدانوں سے لے کر مسجدوں اور جلسہ گاہوں میں بلند کرنا چاہیئے ——— مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں سے "نعرۂ رسالت" (یا رسول اللہؐ!) ایجاد ہوا ہے اور سیرت کے بعض جلسوں میں "اللہ اکبر" کے ساتھ ہی "یا رسول اللہؐ" کے نعرے بھی ہم نے سُنے ہیں!

[۲] ایک حدیث میں عجمیوں کی طرح کھڑے ہو کر تعظیم کرنے سے روکا بھی گیا ہے۔

صحابۂ کرام کی مفصل تاریخ اور اُن نفوس قدسیہ کی زندگی کے پُورے حالات ہمارے سامنے ہیں، انھوں نے میدان جنگ میں کسی خوشی کے موقعہ پر یا لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کبھی نعرۂ رسالت (یا رسول اللہؐ) بلند نہیں کیا، اور نہ "نعرۂ رسالت" کے بارے میں حضورؐ کا کوئی قول اور ایما ملتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و احترام کے جذبہ سے جو بدنصیب دل خالی ہے، وہ ویرانہ سے بدتر ہے، بلکہ نورِ ایمان سے محروم ہے، تو جو خدا کے بندے "قیامِ میلاد" اور "نعرۂ رسالت" پر نکیر کرتے ہیں کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری اور محبت و عقیدت میں ایسا کرتے ہیں کہ کتاب و سُنّت سے یہ باتیں ثابت نہیں ہیں، ان حق شناسوں کو اس طرح مطعون کرنا کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "تعظیم کرنا" نہیں جانتے اور "وہابی" ہیں، بہت بڑی زیادتی اور بے انصافی ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی تعظیم و تکریم کرنے والے، تو یہی لوگ ہیں، جو قولِ رسول کو دین میں حُجّت سمجھتے ہیں، اور ہر بات کو کتاب و سُنّت کی کسوٹی پر جانچتے اور پرکھتے ہیں! ان عجیب و غریب "عاشقانِ رسولؐ" (؟) کو کیا کہیے، جنھوں نے ایسی باتیں اور رسمیں دین میں نکال لی ہیں، جن کا کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ میں کہیں پتہ اور نام و نشان نہیں ملتا۔

"قیامِ میلاد" ہو یا "نعرۂ رسالت" ان باتوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی کہ حضورؐ نے ایسا کرنے کا حکم ہی سرے سے نہیں دیا!

ان جلسوں میں بعض "میلاد خواں قسم کے علماء" قرآنِ کریم کی محکم آیات کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، اُسے دیکھ کر سخت رُوحانی اذیت ہوتی ہے ۔۔۔۔ مثلاً قرآن عزیز کی یہ آیت:-

↓

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ ۔۔۔۔۔۔۔۔

تلاوت کرکے، حلق کی پُوری قوت کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ دیکھو! اس آیت میں اللہ تعالیٰ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی رسول اللہؐ کا میلاد پڑھتا ہے ـــــ کیا لفظ "بعث" کے اس آیت میں آجانے سے یہ مراد لی جائے گی کہ آیت مذکورہ میں "ولادتِ رسولؐ" کا ذکر کیا گیا ہے کیا اس آیت:-

"۔۔۔ فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۔۔۔ (البقرہ)

(پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ۔۔)

میں بھی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کا "ذکرِ ولادت" فرمایا ہے اور نبیوں کی "میلاد خوانی" کی ہے، کیا ان آیات سے کسی عنوان بھی "محفلِ میلاد" کے جواز پر دلیل لائی جا سکتی ہے؟؟

اسی قبیل کے ایک "میلاد خواں" نے تو حد ہی کر دی:-

ـــ وَالْفَجْرِ، وَلَیَالٍ عَشْرٍ ـــ

تلاوت کرکے کہا کہ اللہ تعالیٰ دس راتوں کی اور فجر کی قسم کھاتا ہے، دس اور ایک مل کر ہوئے گیارہ اس طرح قرآن پاک سے بھی "حضرت غوث الاعظم کی گیارھویں شریف کا ثبوت ملتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کے ساتھ ایسا مذاق و تلاعب، یہ کھلا ہوا ظلم، مسخ و تحریف کی یہ کارستانیاں ۔۔۔۔۔

عیاذاً باللہ! ـ توبہ! استغفر اللہ!

"بشریتِ رسول ؐ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ مجھے میرے رُتبہ سے زیادہ نہ بڑھانا پچھلی اُمتیں اسی لئے اللہ تعالیٰ کی مغضوب و مطرود قرار پائیں کہ انھوں نے اپنے نبیوں، رسولوں اور بزرگوں کی مدح میں اتنا مبالغہ کیا، کہ ان کی شخصیتوں کو الوہیت سے جاکر ملا دیا، عیسائیوں کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ عقیدت و احترام کا یہی غلو انھیں اس گمراہی (شرک) تک لے گیا جسے قرآنِ کریم میں "ظلم عظیم" کہا گیا ہے، یہ خدا ناشناس گروہ خدا کے بندے اور رسول عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کو ڈنکے کی چوٹ "ابن اللہ" کہتا ہے، اور اس شرکِ صریح کے بعد اس کا بھی مدعی ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اہل ضلالت کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ انھیں اپنی گمراہیاں حسین و خوب تر نظر آتی ہیں، شیطان کی یہی سب سے بڑی جیت ہے۔

جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو "ابن اللہ" مان کر اُن کی "بشریت" کا انکار کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جو رسول اللہؐ کی "بشریت" کے مُنکر ہیں، اور آپ کو "بشر" کی جگہ "نور" کہتے ہیں! یہ گمراہی پھیلتی اور بڑھتی جا رہی ہے!

رہی یہ حدیث اول ما خلق اللہ نوری تو اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی نفی کسی عنوان نہیں ہوتی، جو لوگ اس حدیث کو حضورؐ کے "بشر" نہ ہونے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، وہ حدیث نبویؐ اور کتاب اللہ کو باہم ٹکرا دینا چاہتے ہیں! (معاذ اللہ) صحیح حدیث قرآن کی مخالف ہو ہی نہیں سکتی۔۔۔۔ "تخلیقِ نورِ رسولؐ" کے جس عالم اور زمانہ کا اس روایت میں ذکر کیا گیا ہے، اُس کے بارے میں ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ "نور" سے اور اُس کی "تخلیق" سے کیا مراد ہے؟ اس قسم کے مُتشابہات کی تحقیق سے روکا گیا ہے، وہی لوگ ان "نزاکتوں" میں اُلجھتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ بدیہی اور محقق بات یہ ہے کہ محمد ابن عبداللہ (روحی فداک) اس دُنیائے اسباب و علل اور عالمِ آب و گل میں ایک "بشر" کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے اور آپ دوسرے انسانوں کی طرح آپ کا شجرۂ نسب بھی حضرت آدمؑ پر مُنتہی ہوتا ہے حضورؐ خلقت کے اعتبار سے "آدمی" اور "بشر" تھے!

نبی اور رسولؐ کے بارے میں یہ تصور و عقیدہ کہ وہ "بشر" نہیں ہو سکتا، کافرانہ تصور و عقیدہ ہی وہ نادان اپنی جہالت کے سبب یہ سمجھتے تھے کہ جو دوسرے انسانوں کی مانند چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے (اور بشریت کے خواص رکھتا ہے) کہیں اللہ کا نبی ہو سکتا ہے اور "بشر" کی بات نبی کی حیثیت میں مان کر اور اُس کے پیچھے چل کر سوائے نقصان اور خسارے کے کیا ہاتھ آئے گا۔

مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (المومنون)

"اور یہ کچھ نہیں ہے (بس) تم جیسا ایک بشر ہے، جس طرح تم کھاتے ہو، یہ بھی کھاتا ہے جس طرح تم پیتے ہو، یہ بھی پیتا ہے، اور کہیں تم اپنے جیسے بشر کے کہنے پر چلنے لگے، تو تم بے شک گھاٹے میں رہو گے (یعنی خراب ہو جاؤ گے)

کافر یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جس کسی کو نبوت عطا فرماتا ہے، اُسے مافوق البشر ہونا چاہیئے، قرآن اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔۔۔۔۔ (بنی اسرائیل)

اور کہنے لگے ہم نہ مانیں گے تیرا کہا جب تک تو زمین سے ہمارے لئے ایک چشمہ جاری نہ کر دے
یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ (تیار) ہو جائے اور پھر تو اُس کے اندر نہریں
بہادے اور دوڑا دے، یا جیسا تو کہا کرتا ہے ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے آسمان گرا دے، یا اللہ
اور اُس کے فرشتوں کو سامنے لے آئے، یا تیرے لئے سونے کا ایک مکان بن کر کھڑا ہو جائے
یا تو آسمان میں چڑھ جائے، اور ہم نہ مانیں گے تیرے چڑھ جانے کو، جب تک تو ایک کتاب
ہم پر اُتار کر نہ لے آئے جسے ہم پڑھ سکیں' (اے نبیؐ) تو کہہ "سبحان اللہ! میں کون ہوں؟
بجز اس کے کہ میں (اللہ تعالیٰ) کا بھیجا ہوا بشر ہوں!

اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسولؐ کے بارے میں یہ تھا کافروں کے سوچنے کا انداز، وہ نادان اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ نبی کو "بشر" سے مافوق اور اللہ تعالیٰ کے کارخانے میں متصرف اور دخیل و شریک ہونا چاہیے، یہ کہ وہ ذرا اشارہ کرے اور آسمان کے فرشتے پرے باندھے ہوئے اُس کے سامنے حاضر ہو جائیں، اُس کے ایما سے چشمے جاری ہو جائیں، آن کی آن میں چٹیل میدانوں میں باغ لہلہانے لگیں اور خود نبی کے رہنے کے لئے سونے کا مکان تیار ہو جائے، یہ کیسا نبی ہے، جو ہماری طرح ٹوٹے پھوٹے سادہ مکان میں رہتا ہے۔ اور ہماری طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے ——— کافروں کے ان مطالبات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نبی کی زبان سے کہلوایا ——— کہ "ھل کنت الا بشراً رسولا" یعنی میں تو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا "بشر" ہوں' ۔ مطالبے جو تم نے کئے ہیں، ان کا پورا کرنا میرے بس میں نہیں اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ میری نبوت کی روشن دلیل تو خود میرا بشری وجود اور میری بشری سیرت و کردار کی عصمت و پاکیزگی ہے۔

——— اور ———

"قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ ۝
(ان رسولوں نے اُن سے کہا کہ بے شک ہم تمہاری طرح "بشر" ہی ہیں، مگر اپنے بندوں میں
جس پر چاہے اللہ احسان فرمائے)

——— اور ———

"قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ" (اے نبیؐ) کہہ دیجئے کہ میں تم جیسا ہی بشر ہوں' (ہاں!)
میری طرف وحی آتی ہے"

قرآن کی ان محکم آیات کے ہوتے ہوئے، جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "بشر" ہونے کی نفی کرتا ہے، وہ ظالم صریحی طور پر قرآن کریم کو جھٹلاتا ہے، نبیؐ کی بشریت کا انکار، اللہ تعالیٰ کی "تکذیب" ہے (معاذ اللہ! ....) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت کو آپ کی ماہیت اور خلقت کو، اللہ تعالیٰ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے کہ وہ نبی کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک نورِ اخلاق، آفتاب ہدایت، شمع صداقت اور سراج منیر تھے، حضورؐ کی بعثت کی بدولت کفر و شرک کا اندھیرا دور ہوا اور چاروں طرف توحید کی روشنی پھیلی، حضورؐ دنیا کے مطلع پر آفتاب ہدایت بن کر طلوع ہوئے، حضورؐ کی ذاتِ گرامی عالمین کے لئے رحمت ہے ——— حضورؐ کے یہ تمام محامد و صفات مسلم اور یقینی، لیکن آپ اپنی خلقت کے اعتبار سے "بشر" تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کا پورا شجرہ موجود ہے، آپ کے باپ دادا تھے، ماں اور نانی اور دوسرے رشتہ دار تھے۔

آپ کے اولاد بھی، آپ کو بھوک لگتی تھی، اور کھانا کھاتے تھے، آپ غسل بھی فرماتے تھے، آپ بیمار بھی ہوتے تھے طائف میں آپ پر کافروں نے پتھروں کی بارش کی تو آپ لہولہان ہو کر چلتے میں گر گر پڑتے تھے۔ اُحد میں آپ زخمی ہو گئے اور آپ کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی، وفات سے قبل جو علالت نے طول کھینچا، تو آپ پر اس قدر نقاہت طاری ہوئی کہ نماز پڑھانے کے لئے مسجد نبوی میں تشریف نہ لے جاسکے آپ کے حکم سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز میں امامت کا فریضہ انجام دیا۔ یہاں تک کہ آپ وفات پا گئے، اور حضورؐ کے جسد اطہر کو غسل دے کر قبر میں دفن کر دیا گیا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اگر آپ "نور" ہوتے ——— تو "نور" کو نہ پیاس لگتی ہے اور نہ بھوک محسوس ہوتی ہے، "نور" نہایا بھی نہیں کرتا! اور نہ "نور" کو زخمی کیا جاسکتا ہے، "نور" بیمار بھی نہیں ہوتا، اور نہ اُس کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے، اور "نور" کے ماں باپ اور اولاد بھی نہیں ہوتی ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عوارض پیش آئے، وہ بشری عوارض ہیں، اور آپ کی "بشریت" میں عقل و نقل کسی اعتبار سے بھی شک نہیں کیا جاسکتا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "بشر" ہونا حضورؐ کے لئے باعث عار نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور مشیّتِ کاملہ ہے کہ اُس نے اپنی خلافت کے لئے تمام مخلوقات میں "بشر" کو منتخب فرمایا، اور انہی انسانوں میں ایک انسان کو اتنی بلندی عطا فرمائی کہ جبریل علیہ السلام جن کی خلقت "نور" سے ہوئی تھی، شبِ اسریٰ میں "سدرۃ المنتہیٰ" پر ٹھیر گئے مگر "بشر" جبریل امین کو پیچھے چھوڑ کر اونچا ہی ہوتا چلا گیا ——— یہاں تک کہ :—

پہونچا اُس جا کہ فرشتہ کا بھی مقدور نہ تھا

"بشر" کی معراج کا یہ وہ عالم ہے کہ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

قاب قوسین تو ہے قرب کی پہلی منزل

بندہ اللہ سے اتنا ہے قریں آج کی رات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک "بشر" تھے مگر "افضل البشر" تھے "بندے" (عبد) تھے مگر "اشرف العباد" تھے، اللہ تعالیٰ کے حضور نبی اُمّی محمد عربی سے بڑھ کر کسی نے عجز بندگی پیش نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا وہ ذوق و شوق کہ راتوں کو نماز میں اتنی اتنی دیر کھڑے رہتے کہ پائے مبارک متورم ہو جاتے! خشیت الٰہی کا یہ عالم کہ تیز ہوا چلتی تو حضورؐ سہم جاتے اور توبہ واستغفار کرتے، سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ میدان عرفات میں حضورؐ اس انداز میں عجز و مسکنت کے ساتھ دعا میں ہاتھ اٹھاتے تھے جیسے کوئی بھکاری بھیک مانگ رہا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تعلیم دی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو اپنا حاجت روا، کارساز، داتا اور مشکل کشا نہ سمجھو، دور و نزدیک کی آواز اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں سن سکتا۔ دلوں کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی، رسول اور فرشتہ میں یہ قدرت نہیں ہے کہ دُنیا کے کارخانہ کو سنبھال سکے اور سا ایک ذرّہ بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے! مخلوق ہر حال میں اپنے خالق کی محتاج ہے اور انبیاء کرام بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنی تمام عزت اور محبوبیت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے در کے فقیر ہی ہیں!

سیرت النبیؐ کے جلسوں میں ایسے نکتے پیدا کرنا اور لطائف بیان کرنا جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہؐ کے درمیان فرق مراتب باقی نہ رہے، یہ فرق مشتبہ اور مضمحل ہو جاتے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "بشریت" کی نفی و انکار اور آپ کو "حاضر و ناظر" کہنا

درحقیقت اللہ اور رسولؐ کے ساتھ مذاق ہے۔ کتاب سنّت کی (معاذ اللہ) تکذیب ہے اور "سیرت" کے جلسوں کے اصل مقصد کو غارت کرنا ہے —

آج مسلمانوں پر جو ذلت و مسکنت چھائی ہوئی ہے، اور وہ ہر جگہ مظلوم اور پریشان حال نظر آتے ہیں، اُس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ بد اعمالیوں کے علاوہ، اُن کے عقائد میں فساد پیدا ہو گیا ہے، دُنیا کا بہت بڑا عجوبہ ہے کہ "توحید خالص" اُنھی "لا الٰہ الا اللہ" کہنے والوں کے ہاتھوں مجروح ہو رہی ہے، اور مُشرکانہ رسوم اور بدعات کو انھوں نے "دین" سمجھ رکھا ہے! عقیدہ اور عمل کے اسی فساد نے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی ہے! جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے فضل سے توحید اور کتاب و سُنّت کے تقاضوں کو صحیح طور پر پہچانتے ہیں، اُن کا فرض ہے کہ وہ ان گمراہیوں کو زبان و قلم سے رد کرتے رہیں! سیرت النبیؐ کے جلسوں میں خاص طور سے "توحید" کی اہمیت کو پیش کرنا چاہیے کہ "توحید" ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیام اور مشن کی غایت اور خلاصہ تھی!

ماہر القادری — ۲۷ ستمبر ۶۱

فکرِ اسلامی کا ترجمان اور داعی برصغیر ہند و پاک کا واحد عربی ماہنامہ

البعث الاسلامی

زیرِ ادارت :- سید محمد حسنی، سعید الاعظمی ندوی —

نئے دور کا آغاز!

البعث الاسلامی ربیع الاول کے شمارہ سے جو جلد ششم کا پہلا شمارہ ہوگا نئے دور میں داخل ہو رہا ہے!

نئی ترتیب　　**نیا معیار**　　نئے مضامین

- عالم عربی کے ممتاز ترین اہل قلم اور اہل فکر سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔
- ترتیب و طباعت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے انتظامات کئے گئے ہیں ہماری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تحقیقی۔ دعوتی۔ ادبی ہر لحاظ سے رسالہ اعلیٰ معیار کا حامل ہو اور اپنی دعوت اور نصب العین کو بخوبی پورا کر سکے!

سالانہ چندہ :- پانچ روپے

پاکستان میں چندہ جمع کرنے کا پتہ :- ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ یوپی۔ انڈیا

مُلّا واحدی دہلوی

تاثرات

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ (یہ تو بتاؤ) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو اسے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں۔ (کیوں کیا خیال ہے؟)

زمین کی کشش کے تو قائل ہو، پھر زمین میں بوئے جانے اور دفن ہو جانے کے بعد بیج درخت بن کر اوپر کیسے اُبھر آتے ہیں۔ کیا آسمان میں بھی کشش ہے۔ بیجوں کو تو اور نیچے جانا چاہیے تھا یا مٹی میں مل کر مٹی بن جانا چاہیے تھا۔

بہت سے بیج مٹی بن بھی جاتے ہیں اور انسان انہیں مٹی بننے سے روک نہیں سکتا۔ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ (کھیتوں کو اُگانے کی قدرت ہمارے ہاتھ میں ہے) ہم (کسی کھیتی کو اُگانا نہ) چاہیں تو اسے (کانٹوں کی طرح خشک اور بھوسوں کی طرح) چورا چورا کر دیں، اور تم حیران (و پریشان دیکھتے) رہ جاؤ (فاقے مرنے لگو) اور کہتے پھرو کہ ہم لُٹے میں آگئے۔ ہماری تقدیر پھوٹ گئی (ساری پونجی مٹی میں مل گئی)

دانستہ یا نادانستہ، ارادہ کر کے یا بے ارادہ کئے ہمیں اپنے جملہ کام اللہ ہی کے سپرد کرنے پڑتے ہیں۔ کسان بادلوں کو نہیں دیکھتا اللہ کو دیکھتا ہے کہ وہ کب بادلوں سے مینہ برسائے گا اور ایسا مینہ برسائے گا جس سے فصل لہلہا اُٹھے یا ایسا مینہ برسائے گا جو فصل کو تباہ و برباد کر دے۔ باران رحمت ہوگی یا باران عذاب۔

بعض ملکوں نے بے شک کچھ طریقے نکال لئے ہیں جن سے فصلیں قدرے اُن کے قابو میں آگئی ہیں اور اُن ملکوں کو جہاں اور اعتبار سے دوسرے ملکوں پر فوقیت حاصل ہے وہاں وہ کھیتی باڑی میں بھی بازی لے جاتے ہیں۔ اُن ملکوں نے اللہ کی عطا کردہ عقل اور اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز سے کام لیا ہے، اللہ کی عطا کردہ عقل اور اللہ کی پیدا کردہ چیزوں سے کام لینا خود موجب رحمت ہے مگر وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اللہ کی مدد کے بغیر ہم گھاس کا ایک تنکا اُگا لیں گے۔ اللہ کے محتاج وہ بھی ہیں اور اللہ پر توکل، انہیں بھی کرنا پڑتا ہے۔ توکل کی بجائے لفظ جو چاہیں بولیں۔

انسان جمادات سے کام لیتا ہے، انسان نباتات سے کام لیتا ہے، انسان حیوان سے کام لیتا ہے۔ انسان انسان سے کام لیتا ہے اور جو ان سب سے کام نہیں لیتا وہ عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ اِن سے کام نہ لینا اللہ کے منشا کی ناقدری کرنا ہے۔ لیکن کام لینے والوں کے ساتھ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمادات، نباتات، حیوان اور انسان سب کی طرف سے انہیں جواب مل جاتا ہے اور اللہ اکیلا اُن کا رفیق رہ جاتا ہے۔ جمادات، نباتات، حیوان اور انسان کا انسان کے لئے فائدہ رساں ہونا اللہ کے فضل و کرم پر منحصر ہے۔ اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ اللہ تمہاری مدد فرمائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اللہ تمہیں چھوڑ دے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہارا مددگار ہو۔ اللہ ہی ہے جس پر مومنوں کو بھروسہ اور توکل رکھنا چاہیے۔

توکل اسے نہیں کہتے کہ انسان اللہ کی عطا کردہ عقل اور قوت اور اللہ کے پیدا کردہ دوسرے سامانوں اور ذریعوں سے کام نہ

لے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر اللہ کا امتحان لینے بیٹھ جائے۔ یہ حرکت، تو خلاف اسلام ہے۔ توکل یہ ہے کہ اللہ نے کچھ قوتیں انسان کے اپنے اندر رکھی ہیں اور کچھ سامان اور ذریعے اور بنائے ہیں۔ ان سب سے کام لینے کے بعد انسان سمجھے کہ اللہ چاہتا ہے تو کامیابی دیتا ہے اور اللہ نہیں چاہتا تو کامیابی نہیں دیتا۔ انسان تدبیر کرنے کے بعد اللہ کے آگے ہاتھ پھیلائے اور اللہ سے اچھی امید باندھے۔

زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں کہ تدبیریں اور کوششیں دھری رہ جاتی ہیں اور ایک موقع سے تو ہر انسان کو سابقہ پڑتا ہے کہ وہ جان بچانے کی تدبیر اور کوشش کرتا ہے مگر مرجاتا ہے۔ بادشاہ جن کے پاس کسی تدبیر اور کسی کوشش کی کمی نہیں ہوتی مقررہ سانسوں سے زیادہ ایک سانس نہیں لے سکتے۔

جس اللہ میں جان لے لینے کی طاقت ہے اُسے اور چیزوں کا معطل کردینا کیا دشوار ہے۔ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَ اَبْصَارَکُمْ وَ خَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِہٖ۔ اللہ اگر تمہاری سماعت سلب کرلے اور تمہاری بصارت لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگادے تو اللہ کے علاوہ وہ کونسا معبود ہے جو تمہیں یہ چیزیں لاکر دیدے گا۔

زندگی بھر تدبیریں اور کوششیں کامیاب اور ناکامیاب ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان سب موجود ہیں، انسان نک سے سُک تک بظاہر درست ہے۔ سامانوں اور ذریعوں کی بھی قلت نہیں ہے۔ روپیہ مینہ کی طرح برس رہا ہے مگر اندر ہی اندر بھوک لگانے والی یا نیند لانے والی کل بگڑ گئی اور انسان کے لئے ساری نعمتیں حرام ہوگئیں وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ۔ اللہ انسان کو جس حال میں رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ مگر تدبیروں اور کوششوں، یعنی اللہ کی دی ہوئی اپنی قوتوں اور اللہ کے پیدا کردہ سامانوں اور ذریعوں سے ڈھنگ کے ساتھ اور قانونِ الٰہی کے مطابق کام لینے کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔ بُرے حال میں ہم ڈھنگ کے ساتھ اور قانونِ الٰہی کے مطابق کام نہ کرنے سے پھنستے ہیں اور بدحال ہوجاتے ہیں۔

معجزوں اور کرامتوں کی بات الگ ہے، ویسے نبی بھی اس دارالاسباب اور دارسعی وعمل میں ذرائع کے استعمال اور جدوجہد سے مُبرا او مستثنیٰ نہیں تھے، اور وہی اصحاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا۔ انہیں اپنی قوتوں اور دوسرے سامانوں اور ذریعوں سے کام لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ۔ لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ۔ تم سے جتنا بن پڑے طاقت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں سے برسر آنے کے واسطے اپنا ساز و مہیا کئے رہو۔ تاکہ اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھاسکو۔ نیز اُن پر دھاک بٹھاسکو (جو تمہارے مقابل نہیں آئے ہیں اور) جنہیں تم جانتے نہیں ہو۔

اور کہا گیا تھا۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ۔ (تم نے کیا یہ) خیال جمالیا ہے کہ جنت میں سختیاں اور مصیبتیں برداشت کئے بغیر چلے جاؤ گے۔ تمہیں اُن آزمائشوں سے ابھی کہاں سابقہ پڑا ہے جو تم سے قبل کے لوگوں کو پیش آئی تھیں۔ انھوں نے ہر قسم کی سختیاں اور مصیبتیں جھیلیں جن سے اُن پر زلزلہ سا طاری ہوگیا۔ یہاں تک کہ رسول اور رسول کے ساتھی مومنین چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب پہنچے گی۔ (اُن کے اضطراب کی دیر تھی، ہم نے جواب دیا) اللہ کی مدد موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اللہ کی عطا کردہ اپنی قوتیں اور بیرونی اسباب و ذرائع اللہ کے قانون کے مطابق استعمال کرو۔ اسی کو اللہ تعالیٰ اپنی مدد کہتا ہے۔ ارشاد ہے:۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ

اَقْدَامَکُمْ۔ اے مومنو! تم اگر اللہ کی مدد کرو گے اور اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے پیر جما دے گا۔
اپنی مدد کرنا اللہ کی مدد کرنا ہے اور اللہ اُن ہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کرتے ہیں۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے والوں اور دماغ کو معطل کر دینے والوں اور اسباب و ذرائع سے کام نہ لینے والوں کی اللہ مدد نہیں کیا کرتا۔
یہ خطاب صحابۂ کرام کے لئے مختص نہیں تھا۔ قیامت تک کے مسلمان مخاطب ہیں۔ جدّوجہد کے بغیر اس دنیا میں کچھ مل جائے ناممکن ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ——— اور جنھیں بغیر جدّوجہد مل رہا ہے وہ مرنے کے بعد اس کا نتیجہ بھگتیں گے
جو اللہ کو نہیں مانتے وہ اُس کی دی ہوئی قوتوں اور ذریعوں سے کام لیتے ہیں تو کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پھر اللہ کو ماننے والے ان قوتوں اور ذریعوں سے کام لیں تو کیا ٹھکانہ ہے وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اہل ایمان کی امداد تو اللہ پر لازم ہے
امریکہ اور روس کو مادّی فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے لیکن بھروسے اور توکل کے لائق صرف اللہ ہے

رسالہ مووی نے کمیونسٹوں کے اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ دنیا کی ننانوے فیصدی آبادی ابھی کمیونسٹ نہیں ہے لیکن آبادی کا ایک فیصدی کمیونسٹ اس قدر متحرک اور فعال ہے کہ ننانوے فیصدی پر چھایا چلا جاتا ہے۔ چین جو روس کے بعد سب سے بڑا کمیونسٹ مشہور ہے وہاں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر صرف دو فیصدی ہیں، مگر وہ اٹھانوے فیصدی پر غالب ہیں۔ خود روس میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر چار فیصدی ہیں، لیکن کبھی تصور بھی نہیں ہوتا کہ روس کا کوئی باشندہ غیر کمیونسٹ ہو گا۔
جو ملک روس سے متاثر ہیں اُن میں کمیونزم روس سے زیادہ کامیاب ہے، جیسے چیکوسلاویکیہ، رومانیہ، مشرقی جرمنی وغیرہ۔ اور حیرت اور افسوس کے ساتھ سنئے اور سر پیٹ لیجئے کہ کمیونزم کو جتنی کامیابی مسلمان ملک انڈونیشیا میں ہوئی ہے اُتنی ایشیا بھر میں، چین کے سوا کہیں نہیں ہوئی۔
مسلمان اُس قوم کا نام ہے جس کا قول اور موٹو کبھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا تھا، لیکن اب یہ قوم نہ سَمِعْنَا کو جانتی ہے اور نہ اَطَعْنَا کو۔ اس قوم کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ اور انتہا درجہ مفلوک الحال ہے اور عیسائی مشنریوں اور روسی ایجنٹوں کے واسطے ایسا تر نوالہ ہے جسے بہ آسانی نگلا جا سکتا ہے۔
حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا "اگر کسی بستی میں فرد واحد بھی اگر (معاشرے کی خرابی کی وجہ سے) بھوکا سوتا ہے اور بھوکا اٹھتا ہے تو ایسی بستی پر سے اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری ہٹا لیتا ہے۔" (مفہوم)
مسلمانوں میں بھوکے سونے اور بھوکا اُٹھنے والوں کی افراط ہے۔
مسلمانوں کی دینی ناواقفیت کا عالم مسلمانوں کے افلاس سے بدتر ہے۔ دیہات کے بہت سے مسلمانوں کو رسول تک کا نام معلوم نہیں، پوچھو تو زمیندار کا یا پیر کا نام بتا دیں گے۔ اللہ ہی جانتا ہے، افلاس میں مبتلا رکھنے والے امراء، اور جہل میں مبتلا رکھنے والے علماء و مشائخ کا کیا حشر ہونا ہے۔ شہری مسلمانوں نے کلمہ پڑھنا کافی سمجھ لیا ہے اور نماز روزہ ادا کر دینا اُن کے نزدیک ایسا ہے کہ پھر بلیک مارکٹ، ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ، سود، رشوت، شراب سب چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔
مسلمانوں کی تعداد کمیونسٹ پارٹی کے ممبران سے قریباً بیس گنی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر دنیا میں ساڑھے تین کروڑ ہیں، مسلمان ساٹھ کروڑ۔ ہمارے علماء و مشائخ اپنے فرائض سمجھنے لگیں تو مسٹر خروشیف کی مجال تھی کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے وفد سے کہتے کہ "تم بہ رضا نہیں، چار و ناچار تمہیں کمیونزم کو اپنانا پڑے گا" موجودہ صورت میں مسٹر خروشیف کیا، ہر کمیونسٹ یہ کہتا

اور کہتا رہتا ہے اور ایک فیصدی والے کی زبان سے بیس فی صدی والوں کو یہ سننا پڑتا ہے۔ ایک فیصدی والے ذہنی اور اقتصادی دونوں انقلاب لانے کی فکر میں ہیں اور بیس فیصدی والوں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ وجہ وہی ہے کہ کمیونسٹوں کا اپنے دین ناحق پر ایمان ہے اور ایمان کے مطابق عمل ہے اور مسلمانوں کا اپنے دین کے ساتھ صحیح معاملہ نہیں رہا، اور جب تک مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی قوانین نہیں نافذ ہونگے یہی معاملہ رہے گا۔

جان پڑنے کے بعد انسان پر پانچ دور گزرتے ہیں۔ ایک ماں کے پیٹ کا دور، دوسرا بچپن کا، تیسرا جوانی کا، چوتھا بڑھاپے کا، پانچواں ارذل العمر کا۔ جان ماں کے پیٹ میں پڑجاتی ہے۔ انسان وہاں کچھ عرصہ جاندار رہ کر گزارتا ہے، لیکن کسی سے بھی پوچھ دیکھئے کوئی پسند نہیں کرے گا کہ ماں کے پیٹ کا دور واپس آجائے۔ ہاں جوان ہو کر لوگ بچپن کو یاد کیا کرتے ہیں اور بڈھے ہو کر جوانی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ جس طرح بچپن ماں کے پیٹ سے نہیں بدلا جاسکتا اسی طرح جوانی میں بچپن کی یاد اور بڑھاپے میں جوانی کی تلاش خلاف فطرت ہے۔ خلاف فطرت حرکتوں سے سکون اور اطمینان نہیں ملا کرتا۔ سکون اور اطمینان جب ہی ملتا ہے جب انسان زندگی کا ہر دور اُس دور کے مطابق بسر کرے اور اُسے نعمت سمجھے۔

بچپن کی بے فکری اور جوانی کی ترنگوں کو بڑھاپے میں نہ رویا جائے تو بڑھاپا اللہ کا بالکل ویسا انعام ہے جیسا انعام بچپن اور جوانی ہیں۔ بچپن میں ماں باپ مرجائیں تو بچپن کونسی خوبی کی چیز ہے۔ ناز اٹھانے والے ہوں تو بچپن کا مزا ہے ورنہ اللہ لاوارثے بچپن سے بچائے۔ اسی طرح جوانی کے واسطے تندرستی اور دولت کی ضرورت ہے۔ سُنا ہوگا جاڑے کی چاندنی اور مفلسی کی جوانی کی طرف نگاہ نہیں کی جاتی۔

بڑھاپے کا بھی یہی حال ہے۔ بوڑھا آدمی بے سہارے رہ جائے اور اس کے اپنے ہاتھ پاؤں تک اُس کا ساتھ چھوڑ دیں تو یتیم اور لاوارث بچے اور مفلس نوجوان کا سا حشر اُس کا ضرور ہوگا۔ تاہم بوڑھوں کا تجربہ اور دنیا کے مدوجزر سے واقف ہونا بوڑھوں کی ڈھارس بندھائے رکھتا ہے۔ بچوں کی کم احساسی بچوں کے حق میں ارواڑ کا کام دیتی ہے اور جوانوں کا نشہ جوانوں کے آڑے آتا ہے۔ بوڑھوں کے تجربات جوانوں کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔ بوڑھے سب کچھ کھودیں مگر سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت اُن میں باقی رہے تو اُن کے پاس سب کچھ ہے اور سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت چھن جائے تو پھر وہ بوڑھا کہاں ہے، بالا ہے۔ بالے کی مانند بے احساس، بے خبر اور بے فکر۔ کہتے نہیں، بوڑھا اور بالا برابر ہوتا ہے۔ اس دور کا نام ارذل العمر ہے۔ اس سے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پناہ مانگی ہے، فرماتے ہیں:۔ اللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْاَرْذَلِ الْعُمُرِ۔

بڑھاپا اُس دور کا نام ہے جس میں انبیا کو نبوت دی جایا کرتی تھی اور جس میں آج بھی ذمہ داری کے عہدے سونپے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں چھوٹی عمر کا وائسرائے صرف ایک تقرر کیا گیا تھا۔ لارڈ کرزن وہ تقرر کے وقت چالیس برس کا تھا۔ چالیسویں سال سے بڑھاپا شروع ہوجاتا ہے اور بڑھاپا اُس وقت تک صرف بڑھاپا ہے جس وقت تک ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ جواب نہ دے دیں۔ ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ کا جواب دے دینا ارذل العمر کہلاتا ہے۔ ارذل العمر کے لئے عمر کی قید نہیں ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں ارذل العمر آسکتی ہے اور نوے سال کی عمر کا ونسٹن چرچل سابق وزیر اعظم انگلستان ارذل العمر سے بچا رہ سکتا ہے اور دنیا کے مدبروں کا سردار بنا رہ سکتا ہے۔

کسی بچے میں بوڑھوں کی سی دانش پائی جائی تو امکان ہے کہ وہ بڑھاپے میں خدا رسیدہ درویش یا حکیم و فلسفی نکلے لیکن کوئی

بچّہ بوڑھوں جیسا نچلا ہو تو یقین کر لیجئے کہ اُس کی صحت خراب ہے۔ بچّوں اور جوانوں میں بُڑھاپا جھلکنا اچھّی بات نہیں ہے۔ بچّوں کو بچّہ اور جوانوں کو جوان ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن بوڑھے جوان بنیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسا بوڑھوں کا بچہ اور بالا بننا۔ یہ بچّوں اور جوانوں کے بوڑھا بننے سے زیادہ بُرا ہے۔ بچّوں کو بچّوں کی خصوصیات زیب دیتی ہیں، جوانوں کو جوانوں کی خصوصیات، اور بوڑھوں کو بوڑھوں کی خصوصیات۔ مثلاً بچّوں کے لئے ہر عورت ماں کی مثل ہے۔ جوان کی نظر عورت پر پڑتی ہے تو ماں کا یا بہن کا تصوّر اُسے بہت کم ہوتا ہے۔ بوڑھے کے مناسب نہ بچّے کی کیفیت ہے نہ جوان کی۔ بڑھاپے کا دور بیٹی اور پوتی کے تصوّر کا ہے۔ انسانی حیات کا ہر دور الگ الگ ہے اور ہر دور کی باتیں الگ الگ ہیں۔

بوڑھے بوڑھوں کی باتیں اختیار کر کے خوش رہ سکتے ہیں۔ بوڑھوں کے سے اعمال میں جوانوں کے واسطے شاید دل کشی کا پہلو نکل آئے مگر جوانوں کے سے اعمال میں بوڑھے ہرگز لطف نہیں اٹھا سکتے۔ بوڑھے لطفِ حیات اٹھانا چاہتے ہیں تو بوڑھوں کے سے عمل کریں۔

بڑھاپے میں عموماً موت کا اتنا یقین ہو جاتا ہے کہ انسان موت کی بجائے موت کے بعد کی فکر کرنے لگتا ہے، اگرچہ بڑھاپے کی فکر اور جوانی کی فکر میں بڑا فرق ہے ؎

اے حسن! توبہ آں زماں کردی
کہ ترا طاقتِ گناہ نہ ماند

تاہم بساغنیمت ہے جو بڑھاپا ہی فکرِ مابعد الموت کے لئے مل جائے۔ بڑھاپا اس اعتبار سے بھی نعمت ہے کہ بُڑھاپے میں غفلت کا پردہ تھوڑا سا ضرور ہٹ جاتا ہے۔

اسلام کا نظامِ زکوٰۃ

اجتماعی زکوٰۃ کی اہمیت اور تنظیم

(از: سید رشید احمد ایم اے ـــــ لیکچرار شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی)

نماز اور زکوٰۃ کا نہ صرف اسلام نے حکم دیا ہے بلکہ قدیم زمانے سے تمام انبیاء کرام یہ حکم دیتے چلے آئے ہیں۔
چنانچہ قرآن کریم کی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل کے پیغمبروں کا ذکر کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وجعلناهم ائمة يهدون بامرنا واوحينا اليهم فعل الخيرات واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة ـ وكانوا لنا عابدين ـ (پ۱۷ انبیاء ـ ۴)

ہم نے ان کو (انسانوں کا) رہنما بنایا اور وہ ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کو ہدایت کرتے تھے اور ہم نے وحی کے ذریعے ان کو نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تلقین کی اور وہ ہماری عبادت کرتے تھے ـــــ

حضرت اسماعیل ؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وكان يامر اهله بالصلوٰة والزكوٰة وكان عند ربه مرضيا (پ۱۶ مریم ۴)

وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

حضرت موسیٰ کو حکم

حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت اسماعیل ؑ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر تھے ان کی یہودی قوم نہایت سرمایہ پرست بخیل اور کنجوس تھی وہ روپے پیسے پر جان دیتی تھی اس لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی بھلائی کے لیے خدا سے دعا مانگی تو اس کے جواب میں خدا نے یہ ارشاد فرمایا۔

عذابی اصيب به من اشاء ـ ورحمتی وسعت كل شئ ـ فساكتبها للذين يتقون ويؤتون الزكوٰة والذين هم بآياتنا يؤمنون ـ (پ۹ ـ اعراف ـ ۱۹)

میں جسے چاہوں گا، عذاب دوں گا میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے مگر اس رحمت کو صرف ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو مجھ سے ڈریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے

مذکورہ بالا آیت میں حضرت موسیٰ ؑ کی قوم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کی شرط زکوٰۃ رکھی گئی تھی تاکہ ان کی زرپرستی کا علاج ہو سکے چوں کہ حضرت موسیٰ ؑ کی قوم بہت سرکش اور لالچی تھی اس لئے بار بار ان سے نماز اور زکوٰۃ کا عہد و پیمان لیا گیا۔ (ملاحظہ ہو پ۱ سورۂ بقرہ رکوع ۱۰)

یہاں تک کہ انہیں صاف طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ خدا کی مدد اور اس کی رحمت اسی وقت انکے شامل حال ہوگی جب کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کریں چنانچہ ارشاد فرمایا گیا۔

وقال الله انی معكم لئن اقمتم الصلوٰة وآتيتم الزكوٰة وآمنتم

اللہ نے فرمایا "میں تمہارے ساتھ ہوں بشرطیکہ تم نماز قائم کرو

برسلی وعزرتموھم واقرضتم اللہ قرضاحسنا (پ المائدہ ۲) اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسنہ دو (خدا کی مدد ان چیزوں کے ساتھ مشروط ہے)

زکوٰۃ کا عالمگیر حکم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی نبی حضرت عیسٰی علیہ السلام تھے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا جیسا کہ سورۂ مریم میں خود حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبانی یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وجعلنی مبارکا این ماکنت واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا (پ۱۶ مریم رکوع ۲) اللہ تعالیٰ نے مجھے بابرکت بنایا جہاں بھی رہوں اور مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دیتا رہوں جب تک کہ میں زندہ ہوں۔

ان تمام آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تمام پیغمبروں کا دین فطرت یہی رہا ہے کہ وہ اپنی قوموں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیں کیونکہ ان کا تہذیبی اور اخلاقی مشن ان دو چیزوں کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اور کوئی قوم ان کے بغیر فلاح و نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

ان تمام پیغمبروں کے بعد جب تمام پیغمبروں کے سرتاج اور آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے تمام سابقہ پیغمبروں کی تعلیمات کو قائم رکھا بلکہ ان کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے دین الٰہی کی تکمیل کی، اس سلسلے میں زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کا وہ اعلیٰ نظام پیش کیا کہ اگر اسے صحیح طریقے سے جاری رکھا جاتا تو اس وقت مسلمانوں کے علاوہ اور کوئی قوم روئے زمین پر موجود نہ ہوتی۔

قرآن مجید میں اول تا آخر نماز اور زکوٰۃ کا بار بار حکم دیا گیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں ان دو فرائض کی اہمیت سب سے زیادہ ہے چنانچہ قرآن کریم کو کھولتے ہی سورۂ فاتحہ کے بعد جو پہلی آیت ہم تلاوت کرتے ہیں وہ اس طرح ہے۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقناھم ینفقون (پ البقرہ ۱۱) یہ (قرآن) ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے یہ ان پرہیزگاروں کے لئے ہدایت (کا ذریعہ) ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دائرہ میں داخل ہونے کے لئے نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا نہایت ضروری ہے جیسا کہ آگے چل کر اس طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

اولئک علیٰ ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون (بقرہ) یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور فلاح و کامرانی ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔

زکوٰۃ کا مفہوم

زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی طہارت اور نشو و نما کے ہیں جب صاحب سرمایہ مال کمانے کے بعد غریبوں پر مقررہ رقم خرچ کرتا ہے تو اس کا ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کو پاکیزگی قلب حاصل ہوتی ہے۔ مال کو اس طرح خرچ کرنے کا نام شرعی اصطلاح میں زکوٰۃ قرار پایا ہے جب کوئی مال میں سے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیتا ہے تو باقی ماندہ مال پاک و صاف ہو جاتا ہے اور صاحب مال دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔

اس طرح صدقہ اور زکوٰۃ سے نہ صرف مال پاکیزہ ہو جاتا ہے بلکہ خود صاحب مال کی فطرت بھی پاک و صاف ہو جاتی ہے اور وہ نفس کے کمینہ پن اور خود غرضانہ جذبات سے چھٹکارا پالیتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

خُذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم بھا (اے پیغمبر) تم ان کے مالوں سے صدقہ لو جس کے ذریعے تم انہیں پاک و صاف کر سکو۔

آگے چل کر سود کی مذمت اور زکوٰۃ ادا کرنے کی حکمت اور مصلحت کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔

وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربو عند اللہ وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المفلحون۔

وہ سود جو تم ادا کرتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں اضافہ کرے تو وہ خدا کے نزدیک کوئی اضافہ نہیں کرتا (مگر) وہ زکوٰۃ جو تم اللہ کی رضامندی کے ارادہ سے دیتے ہو۔ تو یہ (مال کو) دوگنا کرنے والی ہے۔

زکوٰۃ سے دولت میں اضافہ

مذکورہ بالا آیات میں زکوٰۃ کا فلسفہ اور اس کی اہمیت کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ اگرچہ مال و دولت بے شمار فوائد و برکات کا سرچشمہ ہے اور اس کے ذریعے نظام کائنات قائم ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کئی برائیاں اور نحوستیں بھی پائی جاتی ہیں ایک دولت مند انسان میں مال کمانے کے بعد خواہ خون پسینے کی کمائی کیوں نہ ہو ایک قسم کا غرور اور نخوت پیدا ہو جاتی ہے اسے انسانوں سے ہمدردی باقی نہیں رہتی بلکہ اس کا نفس اسے ہر وقت مال جمع کرنے اور اسے غریبوں پر خرچ نہ کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے اس میں بخل اور خباثت نفس کے دھبے پیدا ہو جاتے ہیں مگر جب وہ زکوٰۃ دیتا ہے تو وہ اپنی نفسانی خباثت کے علی الرغم انسانی ہمدردی کے جذبہ کا اظہار کرتا ہے اس طرح اسے انسانوں کی مدد کر کے رُوحانی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اب اس کا ضمیر جو مال جمع کرنے اور کمانے کی جدوجہد میں مضطرب اور پریشان رہتا تھا۔ ایک حد تک مطمئن ہو جاتا ہے بلکہ صدقہ و زکوٰۃ دینے سے اسے دلی سکون ملتا ہے۔

قومی دولت میں اضافہ

چنانچہ پہلی آیت میں صاحب مال کی طہارت اور پاکیزگی کی نفسیاتی توجیہہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے مگر اس سے بڑھ کر ملک و قوم کو جو فائدہ پہنچتا ہے اور زکوٰۃ کی بدولت قوم اور خود افراد کی معاشی زندگی میں جو انقلاب برپا ہو سکتا ہے اس کی طرف دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ سود خوری جسے بظاہر مال کی زیادتی کا سبب سمجھا جاتا ہے درحقیقت قومی دولت میں خدا کے نزدیک کچھ اضافہ نہیں کرتی بلکہ قومی معیشت کو تباہ کرتی ہے اور جب سود خوری کی بدولت پیدائش دولت کے عاملین کی معاشی حالت تباہ ہو جائے تو سرمایہ دار اور سود خوار افراد بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اس طرح سود خوری ان کے تمام معاشی نظام کو تباہ کر دیتی ہے لیکن زکوٰۃ کے ذریعے پیدائش دولت کے غریب عاملین کی امداد ہوتی ہے جو بعض اوقات ناگہانی اور قدرتی حالات کے تحت عاجز اور بیدست و پا ہو جاتے ہیں لہٰذا جب سماج ان کی کفالت کرتا ہے تو ان کے یا ان کی اولاد کے ذریعے پیدائش دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح قوم خوشحال ہو جاتی ہے۔

خدمت خلق کا ذریعہ

زکوٰۃ، رفاہ عام اور خدمت خلق کے کاموں کو اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اسلام میں مذہبی رسوم بھی خدمت خلق کا ذریعہ ہیں۔ اسلام میں ایمان اور نماز و عبادت کے ذریعے انسان کی روحانی فطرت کو بیدار کیا جاتا ہے تاکہ وہ مخلوق خدا کی خدمت، خود غرضی اور طمع کے جذبہ کے بغیر محض خدا کی خوشنودی کے لئے سرانجام دے۔ یعنی خدا کے تصور اور توحید و عبادت سے انسانوں کے تصور اور توحید و عبادت سے انسانوں کے دلوں میں خلوص کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت انسان جوش و خروش کے ساتھ بنی نوع انسان کی خدمت کر سکتا ہے چنانچہ اسی حقیقت کی وضاحت مندرجہ ذیل

آیات میں کی گئی ہے۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملائکۃ والکتاب والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب ۔ واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون (پ۲)

نیکی محض اسی کا نام نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرو بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ، روز آخرت، فرشتوں اور پیغمبروں پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں یتیموں غریبوں، مسافروں، سائلوں غلاموں (یا قیدیوں) کو چھڑانے میں مال صرف کرتا ہو۔ وہ نماز قائم کرتا ہو اور زکوٰۃ دیتا ہو (نیک لوگ وہ بھی ہیں) جو عہد کرنے کے بعد اپنے عہد کو پورا کریں اور مصیبت، نقصان اور جنگ کے موقع پر صبر اختیار کریں ایسے ہی لوگ سچے مسلمان ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

مذہبی شعار نماز و زکوٰۃ مسلمانوں کا قومی اور مذہبی شعار ہے اسلام کے نزدیک اسی کے ذریعے دوست دشمن میں امتیاز ہو سکتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ مومنوں کی یہی نشانیاں ہیں اور ان میں دوستی اور اخوت قائم کرنے کے لئے انہی دو چیزوں کو سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ اور مسلمانوں کو دوست بنانے کا یہی سب سے بڑا ذریعہ ہے بلکہ کفار دشمن اور مشرکین کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ ان سے جنگ جاری رکھی جائے اور جنگ کو اس وقت بند کیا جائے جب کہ وہ توبہ کر کے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرنے لگیں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین (پ۱۰ التوبہ رکوع ۲)

پھر اگر وہ (کفر و شرک سے) توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

چوں کہ زکوٰۃ اسلامی شعار اور اسلام کا سب سے بڑا بنیادی فریضہ ہے اس لئے یہ عبادت میں شامل ہے اور اسی لئے زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے لی جاتی ہے غیر مسلموں کے لئے اس کے بجائے جزیہ مقرر کیا گیا ہے جس کا ادا کرنا اسلامی ریاست کا شہری بننے کے بعد ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

سماجی حق اگرچہ زکوٰۃ عبادت اور مذہبی فریضہ ہے تاہم اس کا دوسرا یہ فائدہ ہے کہ اس کے ذریعے اسلامی معاشرہ کو اس بات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے کہ زکوٰۃ دے کر وہ ان عاجز اور ناتواں افراد کی دستگیری کرے جو ناگہانی حادثات یا قدرت کے ہاتھوں بیدست و پا اور لاچار ہو جاتے ہیں تاکہ وہ سماج کے لئے ناسور نہ بن سکیں اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ سرمایہ محض بڑے بڑے دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے درمیان نہ گردش کرتا رہے بلکہ سرمایہ کی منصفانہ تقسیم ہو جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم　　تاکہ یہ دولت محض تمہارے مالداروں کے درمیان نہ گردش کرتی رہے۔

زکوٰۃ کا فلسفہ زکوٰۃ کا فلسفہ یہ ہے کہ اسلام عوام کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا چاہتا ہے وہ لوگوں کو فقر و فاقہ میں مبتلا دیکھنا نہیں چاہتا ہے بلکہ اسلام کا منشا یہ ہے کہ ہر ایک کو نہ صرف روٹی اور کپڑا میسر ہو بلکہ ہر ایک زندگی سے بھی جائز طور پر لطف اندوز ہو سکے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ ناکارہ اور نکمے بن کر خیرات پر گذارا کریں اس لئے اس نے ہر ایک کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ جائز طریقے محنت کر کے روزی کمائیں اس لئے گداگری اور بھیک مانگنے کو ممنوع قرار دیا ہے تاہم معاشرہ میں کچھ افراد ایسے بھی رہتے ہیں جو پیدائشی اندھے اور اپاہج ہوتے ہیں یا ناگہانی حادثوں میں بیدست و پا ہو جاتے ہیں۔ یا وہ کمانے کے قابل ہیں مگر ان کے لئے ذرائع معاش مہیا نہیں ہیں یا مفلسی اور تنگدستی کی وجہ سے قرضدار ہو گئے ہیں۔ یہ تمام صورتیں ایسی ہیں

جن کی بنا پر معاشرہ اور سماج کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ کمزور اور ناتواں بھائیوں کی مدد کریں تاکہ وہ بھی اپنی بنیادی ضروریات سے بے فکر ہو کر انسانیت کے بلند مقاصد کی تکمیل کریں کیوں کہ خداوند کریم نے فرزندانِ آدم کو اشرف المخلوقات بنایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے —

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا ۵ (پ ۱۵)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے فرزندان آدم کو عزت بخشی، انہیں خشکی اور سمندر پر سوار کرایا انہیں پاکیزہ رزق عطا فرمایا، اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی —

احترام انسانیت کا ذریعہ

فرزندان آدم کی اس سے بڑھ کر اور کیا عزت ہو گی کہ خدا نے انہیں عقل اور لطیف جذبات سے سرفراز کیا اور انہیں وہ روحانی ذوق شوق عطا فرمایا جس کا درجہ مادی اور جسمانی ضرورتوں سے بہت بلند ہے لہٰذا اگر عوام بنیادی ضروریات سے محروم رہیں یا روٹی کپڑے کی ضروریات کو پورا کرنے میں ان کا تمام وقت صرف ہو جائے تو وہ روحانی اور مذہبی زندگی کی اعلیٰ قدروں کی کیسے تکمیل کر سکیں گے بلکہ جب وہ فقر و فاقہ کی کش مکش میں مبتلا رہیں گے تو ان میں احترام انسانیت اور خودداری کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ ان کی زندگی جانوروں اور چوپاؤں سے بدتر ہو جائے گی کیوں کہ حیوان اور چوپائے تو اپنی بنیادی ضروریات پوری کر لیتے ہیں انہیں کھانے پینے کو کافی مل جاتا ہے کیونکہ وہ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اچھلتے کودتے اور زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں یہاں تک کہ پرندے چہچہا کر اپنی خوشحالی اور شادمانی کا اظہار کرتے ہیں مگر وہ انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے، اور جو تمام کائنات کا مالک ہے وہ بد نصیب اپنے کھانے پینے کی ضروریات کو حاصل کرنے میں اس قدر منہمک رہتا ہے کہ وہ پرندوں اور جانوروں سے بھی کمتر ہے وہ تو زندگی کی عام مسرتوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ وہ انسانی اور روحانی قدروں کی تکمیل کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سماج جس کے افراد اس قدر محتاج ہو جائیں انسانی سماج کہلانے کا مستحق نہیں ہے کیوں کہ وہ احترام انسانیت کے جذبہ سے خالی ہے۔ اس نے خدا کی بخشی ہوئی عزت اور فضیلت کو پامال کر دیا ہے اور مقاصد خداوندی کی مخالفت کرتا ہے —

انسان خدا کی سرزمین میں اس کا خلیفہ ہے، خدا نے اس کو اپنا نائب اس لئے بنایا کہ کائنات میں زندگی کے آثار نمایاں ہوں اور زندگی پروان چڑھے اور ہر طرف تازگی ہو تاکہ انسان فطرت کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہو کر خدا کی نعمتوں کا شکر کرے مگر وہ نامراد انسان کیا خاک زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے جو زندگی بھر نان شبینہ کا محتاج رہے —

امیر و غریب کا غیر معمولی فرق

لہٰذا اسلام اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اسلامی سماج کے مختلف طبقوں میں امیر و غریب کا اس قدر زیادہ فرق نمایاں ہو کہ ایک طبقہ سونے چاندی کے ڈھیروں سے کھیلتا ہو اور دوسرا طبقہ بھوکا ننگا رہے۔ اسلامی معاشرہ کی یہ شان ہرگز نہیں ہو سکتی کیوں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "اس بستی سے جہاں کوئی بھوکا ہو خدا اس ذمہ داری اٹھا لیتا ہے" (مسند امام احمد مطبوعہ شاکر ۴۸۸) آپ کا یہ ارشاد گرامی ہے "تم میں سے کوئی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز نہ پسند کرے جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہو" اسلام اس طرح کی طبقاتی تقسیم کو اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ اس کے پس پردہ طبقاتی رقابتوں، حسد اور کینہ پروری کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے صحیح معاشرہ کی بنیادیں منہدم ہو جاتی ہیں اس طرح طمع، خود غرضی اور سنگدلی کے ناپاک جذبات بھی انسان کے نفس اور ضمیر کو خراب کر دیتے ہیں ایسی حالت میں یہ بھوکے ننگے انسان یا تو چوری ڈکیتی اور لوٹ مار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں یا

ذلیل وخوار ہو کر انسانیت اور شرافت کو فروخت کر بیٹھتے ہیں۔

نظام زکوٰۃ چونکہ اسلام کے منصفانہ سماج میں یہ تمام باتیں ممنوع ہیں، لہٰذا اس قسم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا گیا ہے اگرچہ تمام مذاہب میں زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات کا حکم دیا گیا ہے مگر ان تمام مذاہب میں ان احکام کی حیثیت محض اخلاقی اور مذہبی تھی، قانونی طور پر ان کا باقاعدہ نظام نہ تھا اور نہ خاص ضابطے مقرر کئے گئے تھے بلکہ ان مذاہب میں صدقہ وخیرات کی حیثیت محض بخشش کی تھی مگر اسلام میں اسے غریبوں کا جائز حق قرار دیا گیا ہے اور اسی مقصد کے لئے زکوٰۃ کا ایک خاص نصاب مقرر کیا گیا ہے چنانچہ مال کی مقررہ حد اور مقررہ مدت پوری ہونے کے بعد مال دار کے لئے زکوٰۃ کو ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ مال صاحب مال کی جائز ضروریات سے فالتو ہو اور کسی کا قرضہ واجب الادا نہ ہو اور اس حالت پر ایک سال گذر گیا ہو۔

نصاب زکوٰۃ زکوٰۃ کم از کم ساڑھے باون تولے چاندی پر اور سونے کی مقدار میں کم از کم ساڑھے سات تولہ پر فرض ہوتی ہے اس سرمایہ پر ٹیکس ہے جو سال بھر کسی کے پاس جمع رہے جس قدر سرمایہ سال بھر تک جمع ہوگا اسی قدر اس پر اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر اسلامی حکومت کے کارکن وصول کریں گے اس میں زیورات، جواہرات، بنک کا اندوختہ سب شامل ہیں۔ مال تجارت اور مکانوں کے کاروبار پر بھی زکوٰۃ فرض ہے یعنی رہنے کے مکان کو چھوڑ کر وہ مکانات جو کرایہ پر دیئے جاتے ہیں، تو ان کی آمدنی پر مذکورہ بالا نصاب کے مطابق زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ مویشی کے ریوڑوں پر بھی جو ضرورت سے زیادہ ہوں، زکوٰۃ فرض ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق بحرین کے گورنر حضرت حضرت انس بن مالک کو سرکاری فرمان کے ذریعے مطلع کیا تھا، اس صورت میں تعداد کے اضافے کے ساتھ ساتھ مویشی کی شکل میں زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ اونٹ کے ریوڑ کی زکوٰۃ کے لئے کم از کم تعداد پانچ ہے گائے بھینس کے ریوڑ پر زکوٰۃ دینے کی کم از کم تعداد تیس ہے اور بھیڑ بکری کے گلّے میں چالیس سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

زکوٰۃ کے احکام زکوٰۃ کو ادا کرنے کے سلسلے میں اسلامی شریعت کے احکام وہدایات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے لہٰذا قرآن واحادیث میں ہدایات دی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کسی قانون دباؤ، نام ونمود، ریاکاری یا کسی دنیاوی نفع اور طمع کی توقع پر نہ ادا کی جائے اس طرح زکوٰۃ کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا ثواب جاتا رہے گا قرآن کریم میں ارشاد ہے "اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور اذیت دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہو اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو اس (کے خرچ کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برسے تو ساری مٹی بہہ جائے اور چٹان کی چٹان صاف رہ جائے۔" (پ ۳)

احسان نہ جتانا دوسری ہدایت یہ ہے کہ کسی کو زکوٰۃ دے کر اس کا احسان نہ جتایا جائے اور نہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جس سے اس کے دل کو تکلیف پہونچے کیوں کہ زکوٰۃ دینا کسی پر بخشش یا احسان نہیں ہے بلکہ یہ غریبوں کا جائز حق ہے اور مال دار زکوٰۃ دے کر اپنے مال پر تصرف کرنے اور اسے کام میں لانے کا جائز اور قانونی حقدار بن جاتا ہے اس طرح وہ زکوٰۃ دے کر خدا کے رزق کا مالک بنتا ہے اور اس کا شکریہ ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر خرچ کر کے احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں تو ان کے لئے خدا کے ہاں اجر ہے اور انہیں کوئی نقصان یا رنج نہیں ہوگا۔ اگر خیرات کے بعد تکلیف پہونچائی جائے تو اس سے یہی بہتر ہے کہ سائل کو نرمی سے

ٹال دیا جائے اور اس سے معافی مانگ لی جائے" (پ ۳)

ایک ہدایت یہ بھی ہے کہ خدا کی راہ میں اچھا مال دیا جائے اور قصداً خراب مال زکوٰۃ میں دینے کی کوشش نہ کی جائے اور اگر ممکن ہو تو نام و نمود اور ریاکاری سے پرہیز کرتے ہوئے پوشیدہ طور پر زکوٰۃ ادا کی جائے اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھا جائے کہ اس قدر زکوٰۃ نہ ادا کی جائے کہ آدمی قرضدار ہو جائے یا اپنے بال بچوں کی جائز ضروریات میں خلل پڑے بلکہ شرعی حکم یہ ہے کہ صرف ضرورت سے زائد مال میں سے زکوٰۃ اور خیرات ادا کی جائے جیسا کہ ارشاد ہے :-

وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اے پیغمبر! کہہ دو کہ جو ضرورت سے زائد ہو (سورہ بقرہ) (اللہ کے نیک بندے وہ ہیں) کہ جب خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی اختیار کریں بلکہ ان کا طریقہ ان دونوں کے درمیان ہو۔"

(پ ۱۹ سورہ الفرقان رکوع ۵)

تم اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑ لو کہ وہ گردن سے بندھا ہوا ہے اور نہ اتنا کھول دو کہ حسرت زدہ بیٹھے رہو اور لوگ بھی تم کو ملامت کریں۔ (پ ۱۵ بنی اسرائیل رکوع ۲)

زکوٰۃ کے مستحقین

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے مستحق حضرات کے بارے میں مختلف آیات میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "اپنے رشتے دار کو اس کا حق دو اور غریب مسافر کو (بھی دو)"

"نیک وہ ہے جو خدا کی محبت میں اپنے رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں اور مسافر پر خرچ کرے اور (ایسے لوگوں کے لئے بھی خرچ کرے) جنکی گردنیں غلامی اور اسیری میں جکڑی ہوئی ہوں"۔

"اپنے ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار اور اجنبی پڑوسیوں، پاس بیٹھنے والوں، مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ بھی (نیک سلوک کرے)

"صدقہ و زکوٰۃ" ان غریبوں کے لئے ہے جو اپنا سارا وقت خدا کے کام میں لگا کر ایسے گھر گئے ہوں کہ (روزی کمانے کے لئے) زمین پر سفر نہیں کر سکتے، ان کی خودداری کو دیکھ کر تم گمان کرتے ہو کہ وہ دولت مند ہیں مگر ان کی صورت دیکھ کر تم پہچان سکتے ہو وہ ایسے نہیں کہ لوگوں سے اصرار کر کے (اور لپٹ کر) مانگ سکیں۔ (لہٰذا انہیں) جو کچھ بھی تم خیرات دو گے اللہ کو اس کا علم ہے پ ۳

مستحق افراد

مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں زکوٰۃ و صدقات کے مصارف کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

"صدقات (و زکوٰۃ) فقراء و مساکین (غریبوں) کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے ہیں جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر ہوں اور ان کے لئے ہے جن کی تالیف قلوب منظور ہو، اور (زکوٰۃ) گردنیں چھڑانے کے لئے بھی دی جائے نیز قرضداروں راہ خدا کے کاموں اور مسافروں کے لئے بھی ہیں۔ اللہ بہتر جاننے والا اور حکمت والا ہے"۔ (پ ۱۰ سورہ توبہ رکوع ۸)

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں زکوٰۃ کے حقدار بیان کئے گئے ہیں۔ فقراء اور مساکین کی ائمہ کرام نے جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سے مراد وہ غریب طبقہ ہے جو بالکل کنگال ہو یا اس قدر معذور ہو کہ کما نہ سکتا ہو یا اگر کمانے والا ہو تو اس کی کمائی اس قدر قلیل ہو کہ اس کے اور اس کے خاندان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہو، ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو کما سکتے ہیں مگر انہیں روزگار نہ ملتا ہو۔

فقراء اور مساکین کے دو طبقوں کے علاوہ زکوٰۃ کے مستحق وہ افراد بھی ہیں جو خوشحال تھے مگر بھاری قرض یا مسافر ہونے کی وجہ سے مالی مشکلات میں پھنس گئے ہوں لہٰذا ان کی موجودہ مالی مشکلات کو زکوٰۃ کے ذریعے دور کرنا کار ثواب ہے۔

زکوٰۃ دینے کا ایک مصرف غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرنا بھی تھا گزشتہ زمانے میں اسلام نے اس زمانے کے موجودہ

حالات کو دیکھتے ہوئے قانونی اور شرعی طور پر غلامی کا مکمل انسداد نہیں کیا مگر ایسے احکام جاری کئے کہ بتدریج غلامی کا انسداد ہوسکے۔[1] اس مقصد کے ماتحت زکوٰۃ وصدقات کے فنڈ سے غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کیا جاتا تھا اس مد میں وہ قیدی بھی شامل تھے جو جنگ میں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے ہوں، ایسی صورت میں انہیں فدیہ دے کر آزاد کرایا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں غلاموں کو آزاد کرانے کی صورت باقی نہیں رہی ہے۔

تالیف قلب

زکوٰۃ کے مصارف میں تالیف قلب کی بھی ایک مد رکھی گئی ہے اس کے ذریعے ایسے نومسلموں کی امداد کی جاتی تھی جو مسلمان ہو کر اپنے معاشرہ سے کٹ گئے ہوں اور ان کا خاندان کا ذریعۂ معاش باقی نہ رہا ہو مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہوگئے ہوں چنانچہ حضورؐ کے زمانے میں ایسے نومسلموں کی خاص طور پر مدد کی گئی تھی اس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مسلمان مالدار ہوگئے تو تالیفِ قلب کی ضرورت باقی نہیں رہی البتہ آج کل کے زمانے میں تبلیغی مشن کی ضروریات اور نومسلموں کی معاشی ضروریات کی بحالی کے لئے اس کی دوبارہ ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔

رفاہ عام کے کام

مذکورہ بالا آیت میں مصارف زکوٰۃ میں "فی سبیل اللہ" کے الفاظ میں تمام رفاہ عام کے نیک کام شامل ہوسکتے ہیں علماء اسلام نے عام طور پر اس میں جہاد کی فوجی ضروریات کو شامل کیا ہے ملکی مدافعت کے لئے یہ ضروریات بھی اہم ہیں تاہم قومی تعمیر کی دیگر ضروریات کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے بہرحال جہاد اور جنگ کے زمانے میں غیر معمولی مصارف ہوتے ہیں اس لئے ایسے کاموں کے لئے "فی سبیل اللہ" کے ذریعے الگ تخصیص کی گئی ہے۔

چونکہ اسلام کو زکوٰۃ کا وسیع نظام قائم کرنا مقصود ہے اس لئے اس نے زکوٰۃ کو وصول کرنے والوں کی تنخواہ بھی اس کے مصارف میں شامل رکھی ہے تاکہ زکوٰۃ مکمل طریقے سے وصول کی جاسکے اور عامل زکوٰۃ اپنا پورا وقت اس کی وصولی میں صرف کرسکے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام صرف انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے کا قائل نہیں ہے بلکہ وہ اجتماعی طور پر اسلامی حکومت کی طرف سے اس کی وصولی اور تقسیم کا ایک وسیع نظام قائم کرنے کا حامی ہے تاکہ اسلامی ممالک کے ہر قریہ اور گوشے سے زکوٰۃ وصول کی جائے اور اسے مقامی فلاح وبہبود پر خرچ کیا جائے اس اہم مسئلہ پر آگے چل کر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے ارشادات

صدقہ اور زکوٰۃ کے بارے میں ہم حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ارشادات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کی جلد دوم میں ابواب زکوٰۃ کے ماتحت بیان فرمائے ہیں آپ فرماتے ہیں۔

"زکوٰۃ میں دو قسم کی حکمتیں مدنظر رکھی گئی ہیں (۱) اصلاح نفس (۲) تمدنی اور سماجی ضروریات کا انسداد، اصلاح نفس سے مراد یہ ہے کہ مال، بخل، خودغرضی، انسانی عداوت اور دیگر بداخلاقیاں پیدا کرتا ہے مگر اس قسم کی تمام مالی بداخلاقیوں کی اصلاح خدا کی راہ میں مال صرف کرنے اور سخاوت سے ہوجاتی ہے۔ اس سے نہ صرف بخل کا خاتمہ ہوجاتا ہے بلکہ خودغرضی بھی جاتی رہتی ہے اور عداوت کے بجائے برادرانہ محبت پیدا ہوجاتی ہے اس طرح یہی قومی محبت ان تمام شریفانہ اخلاق کی بنیاد بن جاتی ہے جو انسان کو حسن سلوک کا عادی بنا کر انہ ان میں اعلیٰ کردار پیدا کرتے ہیں اسی کا نام اصلاح نفس ہے۔

اصلاح نفس کے علاوہ زکوٰۃ کے ذریعے مفید تمدنی اور سماجی کام بھی سرانجام پاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تمدن اور معاشرت

[1] لیکن کفار سے مسلمانوں کی جنگ ہو، تو غلاموں اور کنیزوں کے مسائل ایسے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑے گا اور اس وقت "غلامی" کے بارے میں جو فقہی احکام ہیں، وہ عملاً حرکت میں آجائیں گے۔ (م۔ ق)

کانظام اسی وقت صحیح طریقے سے قائم رہ سکتا ہے جبکہ اس کا مالی نظام مستحکم ہو اسی صورت میں تمدنی اور سماجی نظام کے اعلیٰ و ادنیٰ ارکن اور رعایا کی مناسب حال ضروریات کو رفع کیا جاسکتا ہے۔ نیز فقراء و مساکین، یتیموں، بیوگان اور دوسرے خستہ حال ضرورت مند دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ذلیل و رسوا ہونے سے نہ صرف محفوظ رہ سکتے ہیں بلکہ حکومت بھی ان کی پوری کفالت کر سکتی ہے مگر یہ تمام مشترک ذمہ داریاں اس وقت انجام پاسکتی ہیں جب کہ حکومت کو اپنی ذرائع آمدنی میں ایک معقول حصہ سرمایہ داروں سے زکوٰۃ کی شکل میں وصول ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح فطرت اور عقل سلیم کے اصولوں کے مطابق اسلام نے زکوٰۃ کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) اس مال سے زکوٰۃ لی جائے جس میں نشوونما کی صلاحیت ہو۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ ا:۔ وہ جانور جو چراگاہوں میں افزائش نسل کے لئے پالے جاتے ہیں۔ (ب) زراعت (ج) تجارت۔

(۲) ان اشخاص سے زکوٰۃ لی جائے جو شریعت کی نظروں میں سرمایہ دار شمار کئے جاتے ہیں اور جنہیں قرآن کریم میں یہ کہہ کر پکارا گیا ہے کہ وہ چاندی اور سونے کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں (وہ لوگ جن کے پاس نقد سونا یا چاندی ہو)

(۳) ان لوگوں سے بھی زکوٰۃ لی جائے جو محنت و مشقت کے بغیر کوئی خزانہ معلوم کرلیں یا جواہرات کہیں سے نکال کر لائیں ایسے لوگوں سے بھی مقررہ حصہ لیا جاتا ہے۔

(۴) اہل صنعت و حرفت کی صنعت و حرفت پر زکوٰۃ مقرر کی جائے۔

ان چیزوں کی اسلام نے موسمی حالات، اتفاقی حادثات اور عام معاشی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے لئے ایک خاص مدت اور مقدار متعین کی ہے اور عام ضرورتوں کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام نے اپنے فرائض میں تمدنی، سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کا کس قدر خیال رکھا ہے بلکہ اس کی بنیاد ہی صرف دو چیزوں پر ہے (۱) انفرادی اصلاح (۲) سماجی اور اقتصادی فلاح و بہبود۔"

زکوٰۃ کی وصولی

سب سے پہلے اہم مسئلہ زکوٰۃ کی وصولی کا صحیح انتظام ہے آج کل ہم زکوٰۃ کو انفرادی طور پر ادا کرتے ہیں اس طرح زکوٰۃ کا صحیح مصرف نہیں رہا ہے نہ صرف اس سے قوم اور سماج کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے بلکہ ہم ایسے پیشہ ور گداگروں کو زکوٰۃ دیتے ہیں جنھوں نے اپنا پیشہ ہی بنالیا ہے کہ وہ زکوٰۃ اور خیرات پر گذارا کریں انہیں جہاں خیرات بٹتی ہوئی نظر آتی ہے وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں اس لئے زکوٰۃ معاشرہ اور قوم کو فائدہ پہنچانے کے بجائے مضر ثابت ہو رہی ہے اس کے ذریعے گداگری کا مذموم پیشہ فروغ پا رہا ہے اور مفت خوروں کی پرورش ہو رہی ہے یہ طریقہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے بلکہ اس طرح اسلامی معاشرہ بھی بری طرح تباہ ہو رہا ہے لہٰذا نظام زکوٰۃ کی تنظیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینی بند کردی جائے اور حکومت زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا کام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہ کوئی نئی تجویز نہیں ہے بلکہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر خلفائے اسلام کے زمانے تک صدیوں اس پر عمل رہا ہے۔ قرآن مجید میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خود لوگوں سے زکوٰۃ و صدقات وصول کریں چنانچہ ارشاد ہے:۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا
(پ ۱۱ توبہ رکوع ۱۳)

(اے پیغمبر) تم انکے مال میں سے صدقہ لو جس کے ذریعے تم انہیں پاک صاف کرکے پاکیزہ بنا سکو۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "مجھے حکم ملا ہے کہ میں بھی تمہارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لے کر اسے تمہارے

محتاجوں کی طرف لوٹا دوں"۔

تنظیم زکوٰۃ کی مختصر تاریخ اس حکم کی بدولت جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی حکومت قائم کی تو آپ نے زکوٰۃ کے لئے بیت المال قائم کرنے پر پوری توجہ مبذول کی، صحابہ کرامؓ خود آ کر زکوٰۃ و صدقات دیا کرتے تھے جنہیں آپ بالعموم اسی وقت لوگوں میں تقسیم فرما دیتے تھے یا جہاد اور جنگی مقاصد کے لئے استعمال میں لاتے تھے اس کے بعد جوں جوں اسلامی سلطنت کا رقبہ وسیع ہوتا گیا اسی قدر آپ دوسرے علاقوں اور قبیلوں میں عاملین زکوٰۃ مقرر فرماتے رہتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب عرب کے دور دراز گوشوں سے عرب قبائل کے وفود جوق درجوق مسلمان ہونے لگے تو آپ انہی میں سے ایک آدمی کو امیر بنا دیتے تھے اور وہی زکوٰۃ وصول کرتا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ خاص حالات کے ماتحت کسی آدمی کو اپنی طرف سے صرف زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر فرماتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں کتاب الزکوٰۃ کے ماتحت ایک حدیث شریف میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ نے بنو اسد کے ایک آدمی کو قبیلہ بنو سلیم سے زکوٰۃ اور صدقات وصول کرنے پر مقرر فرمایا تھا جس کا نام ابن اللتبیہ تھا چنانچہ جب وہ زکوٰۃ وصول کر کے آیا تو آپ نے اس سے حساب لیا۔

عہد رسالت کا نظام زکوٰۃ آخر زمانے میں جب کہ تمام عرب مسلمان ہو گیا تھا تو اسی وقت آپ کو یمن اور جنوبی عرب کے علاقوں میں بعض معتبر صحابیوں کو گورنر بنا کر بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ نہ صرف ان دور دراز علاقوں میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کریں بلکہ وہاں کے ملکی انتظام کو بھی درست کریں اور ان سے اسلامی ٹیکس بھی وصول کریں چنانچہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم اور معلم بنا کر بھیجا تو انہیں ہدایت فرمائی کہ وہ انہیں نماز اور زکوٰۃ پر آمادہ کریں اور انہیں سمجھائیں کہ زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ انہی کے مالداروں سے وصول کر کے انہی کے محتاجوں پر تقسیم کی جاتی ہے اس لئے یہ اسلامی ٹیکس انہی کی سماجی بہبود کے لئے ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے انہیں یہ بھی ہدایت فرمائی کہ وہ چھانٹ چھانٹ کر ان کا عمدہ اور ایسا بہترین مال نہ وصول کریں جس سے ان کو نقصان برداشت کرنا پڑے۔

زکوٰۃ کی وصولی اور مال زکوٰۃ کی حفاظت کا آپ اس درجہ خیال رکھتے تھے کہ زکوٰۃ میں جو مویشی آتے تھے ان میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے آپ ان مویشیوں پر داغ کر کے خاص نشان لگا دیتے تھے تاکہ عام لوگوں کے مملوکہ مویشیوں کے ساتھ نہ مل جائیں اور لوگوں کو بھی یہ معلوم رہے کہ یہ زکوٰۃ کے قومی مویشی ہیں۔

زکوٰۃ نہ دینے پر جنگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو فتنۂ ارتداد کا سیلاب امنڈ آیا بالخصوص جنوبی عرب کے وہ نو مسلم جو ابھی تک اسلامی تعلیمات سے اچھی طرح آشنا نہیں ہوئے تھے، مرتد ہو گئے، ان میں سے اکثر افراد چونکہ زکوٰۃ کے فلسفہ سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے اس لئے انہیں زکوٰۃ ادا کرنا بہت شاق گزرا، ان کے فطری بخل نے انہیں زکوٰۃ نہ دینے پر اکسایا اور کچھ لوگ اسے غلامانہ ٹیکس سمجھ کر اس سے گریز کرنے لگے انھوں نے اپنے مسلمان حاکموں سے یہ کہا کہ وہ نماز پڑھنے اور اسلام کی تمام تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں مگر زکوٰۃ نہیں دے سکتے لہٰذا اس وسیع فتنہ و فساد سے مجبور ہو کر بعض صحابہؓ نے حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کو یہ رائے دی کہ وہ فی الحال ان سے زکوٰۃ وصول کرنا ملتوی کر دیں کیوں کہ جابجا شورشیں ہو رہی ہیں لہٰذا ایسے لوگوں کو چھوڑ کر جو زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں۔ فی الحال صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو اسلام سے بالکل مرتد ہو گئے ہیں مگر اس موقع پر عزم و صداقت کے پیکر مجسم حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے ارشاد فرمایا۔

"خدا کی قسم"! اگر وہ زکوٰۃ کے سلسلے میں اونٹوں کو باندھنے کی رسّی دینے سے بھی گریز کریں تو ایسی حالت میں بھی ان سے جنگ کرونگا"
اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایسے نازک موقع پر اسلام کے خلیفہ اول نے اجتماعی طور پر زکوٰۃ وصول کرنے سے گریز نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زکوٰۃ ہی اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی ہے لہٰذا اگر اسی موقع پر وصولی زکوٰۃ کو ملتوی کر دیا گیا تو پھر کبھی زکوٰۃ وصول نہیں ہو سکے گی اور اس کے بغیر اسلامی حکومت کا قیام ناممکن ہوگا اس لئے آپ نے تمام باغیوں سے جنگ کی اور تمام باغی سرغنوں کا قلع قمع کیا اس کے بعد نہ صرف ہر قبیلے سے زکوٰۃ وصول کی بلکہ آئندہ بھی زکوٰۃ کی وصول یابی کا سلسلہ جاری رکھا۔

جب بغاوت اور فتنہ ارتداد کا انسداد ہو گیا اور تمام ملک عرب میں امن وامان بحال ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے تمام اسلامی علاقوں میں زکوٰۃ کی مختلف قسموں کے بارے میں مفصل احکام بھیجے چنانچہ اس سلسلے میں بحرین کے حاکم حضرت انس بن مالک کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق مویشی پر زکوٰۃ کی پوری تفصیلات مندرج تھیں جیسا کہ صحیح بخاری کی کتاب الزکوٰۃ میں بیان کیا گیا ہے۔

محکمۂ زکوٰۃ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جب بہت سے ممالک مفتوح ہوئے اور اس کے ساتھ انتظام سلطنت بھی وسیع ہوتا گیا تو ہر شعبے اور محکمے کے لئے جداگانہ رجسٹر قائم کئے گئے اور چونکہ باقاعدہ دفتری نظام قائم کیا گیا تھا اس لئے زکوٰۃ اور صدقات کے لئے بھی ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا جس کی تمام صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں اس میں محکمہ زکوٰۃ کے حسابات کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور تمام صوبوں اور اضلاع سے جو زکوٰۃ سرکاری کارکنوں کے ذریعے وصول ہوتی تھی، ان میں سے مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد جو رقم بچتی تھی وہ مرکزی حکومت کو روانہ کر دی جاتی تھی۔ یہ نظام زکوٰۃ خلفاء راشدین کے بعد بنوامیہ اور بنو عباس کے دور خلافت کے آخر زمانے تک قائم رہا (تاریخ الاسلام السیاسی الابراہیم حسن ج اول ص۵۰۸)

اجتماعی زکوٰۃ کی تاکید تاریخی حیثیت سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے کا کب رواج ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلامی حکومتیں ختم ہونے لگیں تو علمائے کرام نے یہ فتویٰ دیا ہوگا کہ چونکہ اسلامی حکومت اس وقت باقی نہیں رہی ہے، اس لئے مالدار مسلمان اپنی طرف سے زکوٰۃ نکال کر مستحق حضرات کو دیدیا کریں۔ ورنہ اس سے پیشتر ظالم حکومتوں کے زمانے میں صحابہ اور دیگر ائمہ سلف مسلم حکام ہی کو زکوٰۃ دینے کی تلقین کرتے رہے چنانچہ کتب احادیث مثلاً ابوداؤد مصنف ابن ابی شیبہ اور بیہقی میں یہ مذکور ہے کہ جب بنوامیہ کے ظالم حکمراں عوام پر ظلم وستم کرنے لگے تو بعض حضرات انہیں زکوٰۃ دیتے ہوئے ہچکچانے لگے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا۔ زکوٰۃ حکام ہی کو ادا کرو۔ ایک شخص نے کہا "حکام وخلفاء صحیح مصرف میں نہیں، صرف کرتے ہیں"۔

اس پر آپ نے فرمایا "تاہم انہی کو زکوٰۃ ادا کرو"۔ انھوں نے فرمایا "جب تک خلفاء نماز ادا کرتے رہیں تو انہی کو زکوٰۃ ادا کیا کرو"۔

"ابو صالح کہتے ہیں" میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابو سعید خدری اور حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ یہ حکام جو بدعنوانیاں کر رہے ہیں وہ سب آپ کے پیش نظر ہیں کیا ایسی حالت میں بھی ہم انہی کو زکوٰۃ ادا کریں سب نے باتفاق رائے یہ کہا کہ ضرور انہی کو زکوٰۃ ادا کرو کیوں کہ اجتماعی زندگی کے لئے یہی طریقہ ہونا چاہیے۔

صحابہ کے بعد ائمہ کرام اور مجتہدین بھی حکومت کی طرف سے اجتماعی طور پر زکوٰۃ وصول کرنا ایک اسلامی فریضہ سمجھتے تھے امام مالک

کے نزدیک جو کوئی اس فریضہ میں رکاوٹ پیدا کرے تو اس سے جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جہاد کیا تھا۔

ائمہ احناف بھی زکوٰۃ کو وصول کرنا حکومت وقت کا حق سمجھتے تھے چنانچہ بہت بڑے حنفی محدث اور فقیہ ابوبکر جصاص اپنی شہرہ آفاق کتاب احکام القرآن میں ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں۔

"اگر یہ کہا جائے کہ اموال (باطنہ یعنی سونا چاندی) کی زکوٰۃ پر امام کا یہ حق نہیں ہے کہ ضرور اسی کو دی جائے اور پھر اس کو ذمی (غیر مسلم شہری) پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل قانون شریعت میں اموال (باطنہ) کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ امام (خلیفہ) کو دی جائے اور اس کا وصول کرنا امام ہی کا حق ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما زکوٰۃ وصول فرماتے تھے"

موجودہ نظام زکوٰۃ ہماری حکومت نے بعض حالات کے ماتحت فی الحال رضاکارانہ بنیاد پر مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تازہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی پاکستان کی حکومت نے اس زکوٰۃ کی وصولی کے بارے میں چند قواعد وضوابط بھی بنا لئے ہیں اور بنیادی جمہوریتوں کو زکوٰۃ کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے یہ طریقہ بہت مناسب ہے کیونکہ زکوٰۃ کا وسیع نظام بنیادی جمہوریتوں ہی کے ذریعے خوش اسلوبی کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے یہ اور بھی بہتر ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی سے پہلے بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم ہو گیا اس طرح اس نظام کو قائم کرنے کے لئے حکومت کو مناسب کارکن مل جائیں گے اور اگر دیانتدارانہ طریقے سے زکوٰۃ وصول کی جائے تو اس کے ذریعے سماجی بہبود کی بہت سی اسکیمیں چل سکتی ہیں اور مقامی فلاح و بہبود کے لئے ایسا وسیع فنڈ مہیا ہو سکتا ہے جس سے بنیادی جمہوریتوں کے بہت سے مسائل حل ہو سکیں گے۔

بنیادی جمہوریت اور زکوٰۃ چونکہ مقامی کارکن صاحب زکوٰۃ حضرات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اس لئے وہ لوگ مقامی جمہوریت کے زیر انتظام زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا ایک ایسا بیت المال اور اس کا دفتر قائم کر سکتے ہیں جس میں زکوٰۃ کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جائے اور آمد و خرچ کے رجسٹر میں اس کی وصولی کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ مال زکوٰۃ کو خرچ کرنے کے لئے مختلف شعبہ جات قائم کئے جائیں جن کے ماتحت باقاعدہ سماجی بہبود کا کام کیا جائے۔

صنعتی مراکز یہ خیال ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے شرعی اصولوں کے مطابق صرف مستحق حضرات کی امداد کی جائے اس کے ذریعے جیسا کہ عہد رسالت اور خلفائے اسلام کے زمانے میں طریقہ رائج تھا، یتیموں، بیواؤں، اپاہج اور بیروزگار افراد کو امداد بہم پہونچائی جائے اس کی بدولت انسداد کی تحریک بھی کامیاب ہو سکتی ہے مگر ضرورت ہے کہ ان مقاصد کے لئے منظم مرکز قائم کئے جائیں اس کی صورت یہ ہے کہ ہر علاقے میں ایسے صنعتی مدارس اور صنعتی مراکز کھولے جائیں جہاں مذکورہ بالا غریب حضرات اور بیوہ عورتیں مفید صنعت و حرفت یا گھریلو دستکاریاں بھی سیکھ سکیں اور اس کے ساتھ ان کی مالی مدد بھی ہوتی ہے اس کی تفصیلی صورت یہ ہے کہ یتیم بچوں کے لئے صنعتی مدارس کھولے جائیں جہاں انہیں علم وہنر دونوں چیزیں سکھائی جائیں اور دوران تعلیم میں ان کے اخراجات زکوٰۃ فنڈ سے پورے کئے جائیں ان مدارس میں وہ تمام آوارہ گرد بچے بھی شامل کر لئے جائیں جو گداگری کے ذریعے سے روزی کماتے ہوں۔ اس طرح نہ صرف ان مستحق لوگوں کی مالی امداد ہو گی بلکہ تعلیم اور صنعت و حرفت کو بھی فروغ

؎ کیا اقامت صلوٰۃ "بنیادی جمہوریت کے ارکان کی میں شامل ہے؟؟ (م-ق)

حاصل ہوگا اور گداگری کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔

صنعتی گھر بیوہ، لاوارث اور بار یافتہ خواتین کے لئے الگ صنعتی گھر قائم کئے جائیں جہاں وہ صنعت و حرفت اور گھریلو دستکاری سیکھ کر باعزت روزی کما سکتی ہیں اور آئندہ کسی پر بار نہیں بن سکیں گی صنعتی گھروں میں لاوارث خواتین کے رہنے کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

محتاج خانے بالغ اپاہج یعنی اندھے، لولے، بہرے اور گونگے افراد کے لئے محتاج خانے قائم کئے جائیں یہ ان لوگوں کے لئے ہوں جو کسی طریقے سے بھی کمانے کے قابل نہ ہوں اور وہ اپاہج گداگر جو بھیک مانگتے ہوئے پکڑے جائیں وہ بھی ان محتاج خانوں میں رکھے جائیں بلکہ ان محتاج خانوں میں نئے طریقے کے مطابق اندھوں اور بہروں کے اسکول بھی قائم کئے جائیں تاکہ وہ جدید طریقے کے مطابق کسی قدر تعلیم حاصل کر سکیں۔

وہ بالغ مرد جو بے روزگار ہوں مگر کمانے کے قابل ہوں اور وہ کوئی ہنر یا فن جانتے ہوں تو انہیں بھی زکوٰۃ فنڈ سے مالی امداد دے کر برسر روزگار بنایا جائے یا ان کا قرضہ ادا کیا جائے تاکہ وہ قرضے کے بوجھ سے آزاد ہو کر فارغ البالی کے ساتھ روزی کما سکیں۔

بیت المال کے دیگر فوائد زکوٰۃ فنڈ کے ذریعے مذکورہ بالا مستقل کاموں کے علاوہ رفاہ عام کے دوسرے کام بھی انجام پذیر ہو سکتے ہیں مثلاً غریب طلباء کو تعلیمی وظائف دیئے جائیں، ائمہ مساجد کی امداد کی جائے بلکہ مساجد کی اس طرح تنظیم کی جائے کہ محلہ کی ہر مسجد زکوٰۃ کا بیت المال بن جائے وہیں زکوٰۃ جمع ہو مساجد کے ائمہ اور موذنین سے زکوٰۃ کی وصولی کا کام لیا جائے اس طرح نہ صرف عوام اعتماد کے ساتھ زکوٰۃ دے سکیں گے بلکہ مساجد کے ائمہ اور موذنین بھی زکوٰۃ سے تنخواہ لینے کے حق دار بن سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ فائدہ ہے کہ زکوٰۃ سے ایک تبلیغی فنڈ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح نہ صرف مبلغوں کا تقرر ممکن ہوگا بلکہ ان نومسلموں کو بھی جو اپنے معاشرہ سے جدا ہو کر اسلامی معاشرہ میں آئیں، مالی امداد دی جا سکتی ہے تاکہ ایسی صورت میں وہ مسلمان ہو کر مالی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوں' ایسے نومسلموں کو تالیف قلب والی قسم میں شامل کیا جائے۔ ان کے علاوہ نظام زکوٰۃ کے لئے جو دفتر قائم ہوگا اس کے ملازمین اور کارکنوں کی تمام تنخواہیں بیت المال ہی سے ادا کی جائیں گی۔

بہرحال اگر ہم سرگرمی اور دیانت داری کے ساتھ رضاکارانہ بنیاد پر نظامِ زکوٰۃ قائم کر لیں تو نہ صرف ہم بھولا ہوا ایک شرعی فرض ادا کریں گے بلکہ اس بیت المال کے ذریعے ہمیں اس سماجی فلاح و بہبود کی مختلف تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وسیع فنڈ حاصل ہو سکے گا اور اس طرح ملک اور قوم شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو سکے گی بشرطیکہ اس کے کارکن اپنی دیانتداری اور مخلصانہ قومی خدمت کے ذریعے عوام کا اعتماد حاصل کر لیں۔

فاران:— فاضل مضمون نگار کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انفرادی طور پر مسلمان جو "زکوٰۃ" ادا کرتے ہیں، وہ سب کی سب رائگاں جا رہی ہے، اور اس سے فائدے کے بجائے ملت کو نقصان پہونچ رہا ہے! مسلمانوں کی "انفرادی زکوٰۃ" سے بھی ملت کو فائدہ پہونچتا ہے! مثلاً پاکستان اور ہندوستان کے کتنے دینی مدارس ہیں، جن کی بڑی حد تک کفالت "زکوٰۃ" کے ذریعے ہو جاتی ہے ہاں ——— یہ کہنا صحیح ہے اور معقول ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے کے مقابلہ میں اجتماعی طور پر زکوٰۃ دینے کے فوائد بہت زیادہ ہیں، اور سامنے کی بات ہے کہ اجتماعیت' انفرادیت سے ہر حیثیت میں مفید تر ہے ——— ید اللہ علی الجماعۃ ——— جماعت کو بیشک اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔

——— وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو، اُس ملک میں تو حکومت کو قانونی طور پر "زکوٰۃ" وصول کرنے کا یقیناً حق حاصل ہے، اور جو کوئی صاحبِ نصاب زکوٰۃ ادا نہ کرے، اس پر احتساب بھی کیا جانا چاہیے ——— مگر قرآن کریم میں "آتوا الزکوٰۃ" سے پہلے "اقیموا الصلوٰۃ" کا حکم بھی بار بار آیا ہے، اس لئے "اقامتِ صلوٰۃ" اور "ادائے زکوٰۃ" ان دونوں فرائض کی تکمیل دوش بدوش ہونی چاہیے!

جو حکومت مسلمانوں سے "زکوٰۃ" حاصل کرنے کا داعیہ رکھتی ہے اس کا فرض ہے کہ "اقامتِ صلوٰۃ" کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کرے، جو عمالِ حکومت نماز ادا نہ کریں انہیں اس جرم میں ملازمت سے برطرف بھی کیا جاسکتا ہے "ترکِ صلوٰۃ" اتنا بڑا دینی جرم ہے کہ اس جرم کی مداومت مسلمان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے

——— اور ———

"الصلوٰۃ" (نماز) کی قرآنِ کریم میں یہ تعریف بیان کی گئی ہے وہ "فحش و منکر اور سرکشی" سے روکتی ہے، ——— تو وہ حکومت جو "محصلِ زکوٰۃ" بننے کا داعیہ رکھتی ہے، اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ جو چیزیں کتاب و سنت کے نزدیک فواحش و منکرات میں داخل ہیں، اُن پر قانونی طور پر پابندی لگائے۔ مثلاً شراب، قمار، زنا اور اسی قسم کے دوسرے معاصی پر قدغن لگائی جائے خاص طور سے عورتوں کے "جاہلی تبرج" کو روکا جائے تاکہ سوسائٹی میں اخلاق کی پاکیزگی، عفت و حیا اور نیکوکاری کی رُوح دوڑنے لگے! اسی پاکیزہ ماحول میں زکوٰۃ کے اخلاقی اور معاشی فوائد خاطر خواہ برگ و بار لاسکتے ہیں۔

ترجمہ :- ظفر آفاق انصاری (ایم ۔ اے)

"اسلام ان ماڈرن ہسٹری"
پر ایک تنقیدی نظر!

از: مارگریٹ مارکس (نیو یارک امریکہ)

مشہور مستشرق ڈاکٹر ولفورڈ کینٹویل اسمتھ کی کتاب "اسلام ان ماڈرن ہسٹری" (مطبوعہ پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۵۷ء و مینوٹر ستمبر ۱۹۵۹ء) امریکہ میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے ۔ اس کتاب میں مصنف نے اسلام اور اسلامی نقطہ نظر کی انتہائی غلط نمائندگی کی ہے ۔ مندرجہ مقالہ اسی کتاب پر تنقید کے لئے لکھا گیا ہے ۔

(مدیر، مسلم ڈائجسٹ ڈربن جنوبی افریقہ رمضان سالنامہ ۱۳۷۹ھ مارچ سنہ ۶۰ء)

قدیم اسلامی سماج پر مغربی اثرات نے اسلام کو تاریخ کی شدید ترین کش مکش کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ ڈاکٹر ولفورڈ کینٹویل اسمتھ نے نہایت عالمانہ اور جامع انداز میں اس پریشان کن مسئلہ کی تحلیل و تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کتاب میں "آن کے نظریہ تاریخ کی ایک مختصر اور جامع تمہید کے بعد انھوں نے ابتدائی اور متوسط ادوار میں اسلام کی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے" باقی کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ بیسویں صدی کے تہذیبی چیلنج کے عرب، ترکی اور ہندو پاکستان کے مسلمان دانشوروں پر کیا اثرات ہوئے اور انھوں نے اس کا کس طرح جواب دیا ۔

ڈاکٹر اسمتھ کے نزدیک پاکستان کا اسلامی ریاست بننا محض غلطی ہے، وہ پاکستانیوں سے اس لئے برافروختہ ہیں کہ وہ ماضی پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہیں ۔

ڈاکٹر اسمتھ کہتے ہیں "کسی ایک مخصوص دور کی حکومت کو دوسرے دور میں تعمیر کرنے کی کوشش کرنا ناممکن اور بے معنی ہے، پاکستان، عرب کی تاریخ کے ایک حصہ کو دوبارہ جنم نہیں دے سکتا"

مصنف کے نزدیک ان مسلمانوں کا جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں مستقبل بہت شاندار ہے ۔ اس کے کہنے کے مطابق ۱۹۳۰ء میں:-

"حسین احمد مدنی نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کی قومیت ہندوستانی ہے اس پر علامہ اقبال نے طنز آمیز اشعار میں جواب دیا کہ مسلمانوں کی قومیت صرف اسلام ہے ۔ حالیہ واقعات نے اس یقین کو متزلزل کرنا شروع کر دیا ہے ۔ ہندوستانی مسلمانوں نے قانون کی حکومت دیکھ لی ۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ کیسے پولیس نے مذہبی جنون سے سرشار ہندوؤں کو انہیں لوٹنے سے بچایا اور کس طرح مسجد کو مندر میں تبدیل نہیں ہونے دیا ۔ مسلمان مذہب پر

عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ بغیر کسی تردد کے یہ بات کہی جا سکتی ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی بہتری ایک لادین ریاست کی بنا پر ہے۔ روایتی مذہبیت خواہ کچھ کہے لیکن کام لادینیت نے کیا یہی وجہ ہے کہ اب نسبتاً کم مسلمان ایسے ہونگے جو اسلامی ریاست کے تخیل سے وابستہ ہوں۔"

فاضل مصنف نے اس حقیقت سے بالکل آنکھ بند کر رکھی ہے کہ خواہ ہندوستان نے کتنے ہی مذہبی آزادی کے وعدے کئے ہوں اور خواہ ہندو مت مسلمانوں پر نہ ٹھونسا گیا ہو لیکن ہندو تہذیب ضرور ان پر مسلط کر دی گئی ہے۔ ہندوستانی ٹکٹوں پر جن پر جو رقص دیوتا شیو کی تصویر چھاپی گئی ہے اس کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو دستور کی رو سے گائے کا احترام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو کو منظور شدہ زبان کی حیثیت کو ختم کر دیا گیا ہے (نیز اسکولوں کے نصاب میں ایسی کتابیں شامل کی گئی ہیں، جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کو غلط طور پر پیش کیا گیا ہے ۔۔ م۔ق)

مصنف نے خواہ جو کچھ کہا ہو لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی حیثیت اندیشہ ناک ہے، بلاشبہ موجودہ حکومت نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی ہے لیکن پنڈت نہرو اب معمر ہو چکے ہیں، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان کا جانشین بھی انہی کی طرح فیاض ہوگا۔

اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں۔ ایک تہذیب بھی ہے۔ اور اس حیثیت سے بلحاظ نظریہ و عمل وہ ہندو تہذیب سے متصادم ہے۔ پاکستان میں اگر کچھ بدعنوانیاں ہیں اور اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہے کہ ایک جدید اسلامی ریاست کس قسم کی ہونی چاہیئے تو اس کی بنا پر پاکستان کو غلطی سمجھنا محض غلط مبحث ہے۔ دنیا کے اس حصے میں اسلامی تہذیب کے پھلنے پھولنے کے لئے پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ پاکستان کے مسلمان اپنی صلاحیتوں سے پورا کام لینے میں اگر فی الحال ناکام رہے ہیں تو کیا، ان کے لئے مستقبل میں اس کے مواقع نہیں ہیں، اور اس کے برخلاف ہندوستانی مسلمان ان مواقع سے محروم ہیں۔

محولہ بالا کتاب میں دو طویل ابواب میں مغربی تہذیب پر عربوں اور ترکوں کے ردعمل کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ عربوں پر موجودہ زندگی کے حقائق سے فرار اور اپنے ماضی کی درخشانیوں کے ضرورت سے زیادہ احساس پر سخت تنقید کرتے ہوئے قاری کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ طرز عمل کس درجہ لاحاصل تھا۔

مسلمانوں میں سے مصنف کو صرف ترکوں سے حقیقی ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔ جیساکہ عام طور پر معلوم ہے کمال اتاترک نے خلافت، شریعت، عربی رسم الخط، اور اسلامی جنتری سب کو ختم کر دیا تھا۔ اور اس سب کو بھی ناکافی سمجھتے ہوئے مذہبی تنظیموں کو بھی ختم کر دیا مسلم یونیورسٹیاں بند ہو گئیں اور بڑی بڑی مسجدوں مثلاً سینٹ صوفیہ کو عجائب گھر بنا دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں "۱۹۲۰ء میں اسلامی رسوم بشمول نماز، قربانی اور مسجد کی حاضری میں تبدیلیوں پر سرکاری طور پر گفت و شنید ہو رہی تھی"۔

مصنف کہتا ہے: "سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر کس مذہبی اتھارٹی کی بنا پر وہ یہ کر رہے تھے"۔

تجدد پسند ترک کے نزدیک یہ اتھارٹی انقلاب ہے" لیکن کمال اتاترک فی الحقیقت دین ناشناس تھا اور اس کی ساری کوششوں کا محور یہ تھا کہ خدا کی بجائے لادین ریاست کی پرستش ہو۔ لیکن مصنف اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ دلیل دیتا ہے کہ بلاشبہ ترکوں نے اسلام کو ترک نہیں کیا۔ اس پر نظرثانی کی ہے۔ ان کے نزدیک کسی جدید تعلیم یافتہ شخص کے لئے قابل قبول بننے کے لئے اسلام

کو بالکل ہی مختلف انداز میں پیش کیا جانا ہوگا۔"

اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ ترکی کے دانشوروں نے شریعت کو ترک کر دیا بلکہ باقی ماندہ اسلامی دنیا سے وہ کٹ کر رہ گئے۔

"جدید ترکوں کی بڑی سختی سے یہ رائے ہے کہ یہاں اسلامزم اب ختم ہو چکا ہے۔ شاید ہی کسی چیز پر وہ اس قدر جلد جذباتی ہوں جتنا اپنے آپ کو سرا ہوں سے۔ جنہیں وہ کم از کم قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ کسی مذہبی تعلق کے انکار میں ہو جاتے ہیں۔ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بعض ترک عربوں کو اسی طرح سمجھتے ہیں جیسے کوئی امریکی پروٹسٹنٹ کو سمجھتا ہے۔ سیاسی طور پر غیر متعلق اور مذہبی طور پر ظلوم و جہول! اس رائے کا اظہار کرنا کہ انقرہ یونیورسٹی کا شعبہ دینیات ازہر جیسا ہوگا مضحکہ خیز ہے، اس مطلب پریشان کن انداز میں لیا جائیگا۔ اس کے مقابلہ میں وہ اس کا مقابلہ ہارورڈ کی (　　　) سے کرنا زیادہ پسند کریں گے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ اگر اب کوئی مارٹن لوتھر پیدا ہوا تو اس کی سب سے زیادہ شنوائی ترکی کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں ہوگی مسئلہ مسلمان سے عیسائی بننے کا نہیں ہے بلکہ دور وسطیٰ سے نکل کر دور جدید میں داخل ہونے کا ہے

لیکن فاضل مصنف نے اس بات کا اندازہ نہیں کیا کہ جدید مغربی تہذیب کا رویہ مذہب اور علی الخصوص اسلام کے لئے کس درجہ معاندانہ ہے۔ اس کے اثرات کی بنا پر خود عیسائیت کی حالت اچھی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے حصے میں عیسائیت بالخصوص پروٹسٹنٹ مذہب اپنے ماننے والے کی زندگیوں سے بہت دور ہے۔ یہ لوگ کبھی کبھار چرچ جاکر زبانی خدمت البتہ کر دیتے ہیں

مصنف کا کہنا ہے کہ "یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب مختلف تہذیبوں کے درمیان کوئی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ جدید تہذیب کا آغاز اگرچہ مغرب میں ہوا لیکن اب وہ پوری دنیا میں پھیلتی اور دیگر تمام تہذیبی نقوش پر غالب آتی جا رہی ہے اسی بنا پر جدید لادینیت محض مغربی نہیں ہے بلکہ ایک عالمی رجحان ہے جسے دوسری تمام تہذیبیں اپنے اندر جذب کر رہی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کے دنیاوی معاملات مذہبی معاملات سے آزاد سماجی ترقی پر منحصر ہونگے۔ مذہب کو لادینیت برداشت کرنی چاہیئے۔ اب اگر مسلمانوں نے قیصر اور خدا کی تقسیم کو قبول نہیں کیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے ——— بہرحال ڈاکٹر اسمتھ کے نزدیک "اسلام کا مستقبل" یہی خوش آیند اور پسندیدہ ہے۔

بالفاظ دیگر اگر مسلمانوں کو اپنا دین محفوظ رکھنا ہے تو انہیں چاہیئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں برباد کر دیں۔ اس منطق کی رُو سے وُہ ترکی دانشور جو بڑے اطمینان سے قرآن کی تعلیمات اور سُنت کی حجت کا انکار کرتے اور شریعت کو ترک کر چکے ہیں ——— نہ صرف عملاً بلکہ اصولاً بھی ——— وہی اسلام کے سچے تابعدار ہیں۔ (معاذاللہ)

ڈاکٹر اسمتھ چاہتے ہیں کہ مسلمان انہیں اسلام کا ایک ہمدرد طالب علم سمجھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے غیر جانبدار اور حقائق پر مبنی ہے۔ لیکن اگر ان کی کتاب کا غور سے اور احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو، ہر صحیح الفکر مسلمان اس غیر جانبداری کی تہ میں نفرت کے جذبات تک پہنچ سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر اسمتھ کا طرز فکر عام مستشرقین کے طرز فکر کا نمائندہ ہے۔ اسلام سے انکی دشمنی اور مشنریوں کی دشمنی میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بات کو بہتر انداز میں پیش کرنا جانتے ہیں۔

یہ کتاب ان تمام مسلمانوں کو پڑھنی چاہیئے جو اس کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ مغرب سے معاملہ کرتے ہوئے انہیں کس نوعیت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امیر الدین خاں جے پوری

فطرت اور حقیقت

فطرت یا سرشت یا طبیعت یا یوں کہئے کہ فاطر السموات والارض یا حقیقت کی مشیت کی کار پرواز آزاد ہے۔ بڑھتی رہتی ہے پھیلتی رہتی ہے۔ کوئی اصطلاحی ظرف یا نام نہاد سانچہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ مقید و محدود ہو کر رہ جائے۔ اس کو پھیلنے اور بڑھنے کے لئے ایسے گوشے، پھر راستے، پھر میدان مل جاتے ہیں۔ جو ترقی یافتہ ہی نہیں محیر العقول بھی ہوتے ہیں۔ ہم انسان فاطر السموات والارض کی کھلی نشانیوں کو صرف آسمان و زمین ہی میں دیکھ سکتے ہیں اور فکر و حقیقت نصیب ہو تو کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ مقامات ہماری رویت و عقل سے اوجھل ہیں جن کے لئے کہا گیا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ــــــــــ

اور شاید ہمیشہ اوجھل رہیں۔

جدید اکتشافات کی بناء پر ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے۔ جو بے انتہا سوزش و التہاب کی وجہ سے سورج سے ٹوٹ کر الگ ہوا نا محدود فضائے بسیط میں اربوں برس، مہا سنکھوں میل چلا گیا۔ جب کہیں اپنی سرعت گردش یا فضا کے بوجھل اثرات یا طرح طرح کی شعاعوں میں الجھنے یا ہوا کے سہارے کی وجہ سے، یا ان سب کے مجموعی توازن و طاقت کی وجہ سے ایک جگہ قرار پایا تو خدا جانے کتنے لاکھوں کروڑوں شب و روز گذرنے کے بعد اس ٹکڑے کی فطرت کو پنپنے کا سہارا ملا۔

فطرت جاودانی ہے، بے قرار ہے، بے چین ہے اس کا ظاہری جسد مٹ جائے اس کے مظاہر و آثار فاطر کی مشیت کے کسی اقتضاء سے مٹ جائیں لیکن وہ فاطر کے ساتھ ہی باقی ہے اور مصروف عمل۔ ایک گیانی۔ شاید اسی مسئلہ کو اپنے لفظوں میں یوں کہتا ہے۔

ہر مرے تو ہم مریں نا تر مرے بلائے
سانچے گر کا بالکا مرے نہ مارا جائے

سورج سے ٹوٹ کر علیحدہ ہونا فضائے بسیط میں چل پڑنا پھر کہیں قرار پکڑنا یہ سب تقاضائے فطرت سے تھا اب قرار پانے کے بعد فطرت نئی طرح سے مصروف عمل ہوئی بے پناہ آگ کے شعلہ جوالہ نے اپنی سمت اپنے مرکز کی طرف معین کی۔ حرارت پسیج کر بخار، بخار پانی بنا۔ پانی جمع ہو کر کہیں کہیں گوشوں میں اپنے سے کم آگ کو بجھانے لگا بجھے ڈھیر سے کہیں چٹانیں بنیں۔ کہیں پہاڑ۔ اس طرح فطرت نے نئے روپ نئے مظاہر اور نئی چیزیں دکھلانے لگی۔ پانی بڑھا سمندر بن گئے۔ مقامات زمین آب و ہوا کے اثرات کی شعاعوں کی رسائی سے التہاب میں دخانی کیفیت پیدا ہونے سے اور ان سب چیزوں کے امتزاج سے زمین کے بجھے حصہ میں سیماب۔ تیل۔ گیس۔ جواہرات، سونا۔ چاندی، لوہا۔ کیرومائٹ اور خدا جانے کیا کیا بن گئے۔ لاکھوں چیزوں کو ہم نے معلوم کر لیا ہے اور ابھی نعمتیں فطرت کے نہاں خانے میں سینت کر رکھی ہوئی ہیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

یہ عالم جمادات تھا۔

جو مجسم ہے وہ محدود ہے اور اس کا ایک معین وقت ... کے لئے ہے ایک دن ایسا بھی آیا کہ عالم جمادات میں فطرت کے پنپنے کے لئے گنجائش نہ

رہی ۔ فطرت کے علم میں شروع ہی سے عالم جمادات کا یہ انجام تھا ۔ وہ لاکھوں برسوں سے ایک انجانی قوت کی پرورش و تربیت کر رہی تھی ۔ اس نے کہیں اسی قوت کو توانائی دے کر کسی ایک ذرہ میں گداز اور رعنائی پیدا کر دی ۔ یہ ذرہ ہماری اصطلاح میں دانہ بن گیا ۔

ایک صبح معتدل موسم میں جبکہ ہلکی خنک اور خوشگوار نسیم چل رہی تھی ۔ آفتاب کسی خاص اور متناسب زاویہ سے متوازن شعاعیں ڈال رہا تھا ۔ فطرت ایک نازک ۔ شاداب ۔ ہری سوئی کی طرح اس دانہ یا ذرہ سے ابھری ۔ یہ مادر ارضی کی پہلی نباتی بیٹی تھی ۔ یہ سوئی سی چیز ذرا موٹی ہوئی سیدھی اور توانا ہوئی پتے نکلے شاخیں پھوٹیں اور نوادر پھول بھی نکلے اور انمیں رنگ بھی اور مہک بھی ۔ زمین دلہن بن گئی ۔ بھوری کالی ۔ پیلی ۔ چکنی بھر بھری نرم وسخت مٹی میں ہریالی پھیل گئی ۔ پھولوں سے رنگ برنگے ستارے روشن ہو گئے ۔ (فتبارک اللہ احسن الخالقین)

فطرت کے پاس ایک عجیب روپ تھا سمجھ میں نہیں آتا ہم اس کا کیا نام رکھیں ۔ وہ ہر ہست کو عدم بناتا اور پھر ہستی کو نشو و نما دیتا تھا بہتر یہ ہے کہ ہم اسے "مرگ" کہہ لیں ۔ اس لئے کہ مرگ ہی تخلیق نو کی دایہ ہے ۔ یہ تو معلوم نہیں کہ عالم جماد میں یہ مرگ کس طرح عمل کرتی تھی یونہی کرتی ہوگی کہ مضبوط چٹانوں کو نرم مٹی بنا دیا ۔ پتھروں کی سیاہی و تاریکی کو مار کر منور کر دیا کسی کڑوے کسیلے مزہ کو مٹا کر نمکین بنا دیا کہیں ہواؤں کو کسی بند رقبہ میں سڑا کر دھواں بنا دیا ۔ زلزلوں سے کہیں زمین پھاڑ کر اونچے اونچے پہاڑوں کو دفن کر کے سمندر ان پر بہا دیئے دریاؤں کو صحرا بنا دیا ۔ خیر ۔

عالم نباتات میں فطرت نے اپنے عمل مرگ و آفریدگاری کو خوب اجاگر کیا ۔ مرگ خزاں کے نام سے آئی اور آفریدگاری نشو و نما کے نام سے ۔ ایک پیڑ گرا سوکھ ٹرے ہو گئے ۔ ایک پھول مرجھایا سوکھا گتے مگر اُف ۔ خزاں یا مرگ فنا اس سے نہ کسی تناور درخت کی چلی ۔ نہ زمین پر گری پڑی بیلوں کی ۔ خزاں کے شدید حملوں کے مقابلہ میں بچنا مشکل ہو گیا ۔ اس وقت مادر فطرت ہی نے اپنے ہونہار بروؤں کو سنبھالا ۔ ہر نبات نے اپنے لئے مرگ قبول کی مگر اپنی اولاد و نسل کو جاری و باقی رہنے کے لئے ہر جتن سے بچایا ۔ کچھ درختوں نے اپنے بیج ہوا کے کاندھوں پر ڈال کر دور دور پھینک دیئے اور خود اپنے دشمن (خزاں) کے ہاتھوں مٹ گئے ۔ کچھ اپنے بیجوں کو مٹی تلے دباتے رہے ۔ سنبھل اور آکڑے جیسے درختوں نے اپنی روئی سے پیراشوٹ بنائے اور اپنی اولادوں (بیجوں) کو ان پر سوار کر کے کہیں دور محفوظ مقامات پر بھیج دیا ۔ ۔ جہاں موافق و سازگار موسم آنے پر وہ پھولے پھلے ۔ نہ خزاں یا مرگ تھکی ۔ نہ آفریدگاری و نشو و نما تھکے ۔ دونوں میں یونہی آنکھ مچولی ہوتی رہی ۔ اس عمل میں یا کش مکش میں زمین کی خوب بن آئی ۔ لہلہا اٹھی ۔ باغ باغ ہو گئی ۔ اپنی دولت بڑھانے کے لئے نئے اجزا ۔ نئے رنگ اور نئی کیفیتیں سمیٹتی رہی ۔

نبات آفرینیاں اور گلکاریاں رنگ و بو کے ساتھ اور ثمر و اثر و حلاوت و دھنیت کے ساتھ ۔ فراواں سے فراواں تر ہو گئیں یہ زمین جو کبھی آگ کا گولا تھی ۔ سرسبز و شاداب و رعنا خوب صورت کرہ بن گئی ۔

لیکن تنوع بوقلمونی عجوبہ کاری رنگارنگی کی ایک حد ہوتی ہے ۔ زمین خود ایک محدود کرہ ہے اس کی قوت تخلیق و ایجاد کی بھی ایک حد ہے ۔ البتہ وقت غیر محدود ہے اور وقت کا ہی ذکر ہے ۔ ایک وقت ایسا آگیا کہ زمین کی آغوش میں فطرت کو تجدید عمل کے لئے گنجائش نہ ملی ۔ اس لئے کہ عالم نباتات پورا پھل پھول چکا تھا ۔ پروان چڑھ چکا تھا ، اس کے سر جوانی کا سہرا بندھ چکا تھا ۔ بوڑھا ہونے کی بات نہ کہئیے اس لئے کہ عالم چاہے وہ جمادی ہوں یا نباتی یا کوئی اور ہوں کبھی بوڑھے نہیں ہوتے ۔

فاطر السموات والارض کی مشیت میں جب کسی شے کا ظہور و نفوذ ہو تو اس کے لئے وہ اسباب مہیا کر دیتا ہے ۔ معلوم نہیں خشکی یا تری میں فطرت نے اپنے ارتقاء کے لئے ایک نیا عمل کیا ۔ کسی پودے کے چھوٹے سے ریشہ میں ایک ایسی تھرک پیدا ہوئی جو نہ ہوا کی وجہ سے تھی نہ سورج کی قوت بخشی کی وجہ سے ۔ نہ چاند کی رنگ افروزی کی وجہ سے ۔ نہ آس پاس کی ڈالیوں اور پتوں کی لچک کی وجہ سے ۔ نہ کسی غیر محسوس

ارتعاش کی وجہ سے۔ فاطر جانے یا فطرتِ جمادات و نباتات کو کچھ معلوم ہو۔ یہ ریشہ اپنے پودے سے الگ ہو گیا مگر تعجب کہ اور ریشوں۔ پتوں۔ ٹہنیوں اور پیڑوں کی طرح مٹی یا ہوا یا پانی یا دھوئیں میں تحلیل نہ ہوا اس کا وجود علیٰ حالہ قائم رہا۔ اضافہ اس پر یہ کہ ارادہ و حرکت بھی اس میں شامل تھی۔ جدھر چاہتا تھا، ناچتا پھرتا تھا۔ تعجب یہ کہ اپنے نقصان کو سمجھتا تھا جدھر خطرہ ہو، نہیں جاتا تھا۔ غضب یہ کہ اپنی سے چھوٹی اور حقیر ہستی کو خود میں جذب کر لیتا تھا۔ اور اس جذب کی بدولت روز بروز توانا اور جسیم ہوتا جاتا تھا۔ کچھ دن بعد اس میں شاخیں سی پھوٹیں جیسے ہاتھ پاؤں۔ اور سرے پر باریک باریک نقش بنے۔ جیسے منہ۔ آنکھ۔ کان۔ ناک۔ اس کو ہم حشرہ یا کیڑا کہہ لیں تو فہم کے زیادہ قریب ہوگا ایک تو تھا ہی، دو ہوئے، سو ہوئے ہزاروں لاکھوں ہو گئے اور طرح طرح کے زاویہ اور صورت کے سمندر میں بھی بھر گئے خشکی پر بھی اور ہوا میں بھی مل گئے۔ اتنے چھوٹے بھی کہ ایک انچ میں لاکھوں۔ جراثیم کے بھی جرثمہ۔ اتنے نازک کہ ہلکا سا غبار بھی چھو لے تو فنا ہو جائیں۔ اتنے بڑے اور موٹے بھی کہ دس بیس گز میں نہ سمائیں۔ اتنے بڑے بھی کہ آسمان و زمین کے معمولات و حادثات کی پروا کئے بغیر سو سو سال تک بھی نہ مٹیں۔ اس عالم میں فطرت خوب کھل کھیلی۔ نئے نئے طرح طرح کے پیارے پیارے کھلونے بناتے۔ ڈراونے بجوبنائے چلتے پھرتے۔ دوڑتے بھاگتے۔ رینگتے پھدکتے۔ تیرتے پیرتے۔ فطرت نے ایک اور پرواز کی۔ طیور کے نام سے ایک شعبہ قائم کر کے پر لگا دیئے۔ سطح زمین سے لے کر کچھ اونچائی تک، سمندر کی تہ سے سطح آب تک حیوانات بنام حشرہ (کیڑے) درندہ، چرندہ، پرندہ اور آبی جانوروں کے نام سے چھا گئے اور بھر گئے۔ فطرت ایک اصول شروع سے ساتھ لے کر چلی تھی جس کا نام ہے "بقائے اصلح" یعنی جس چیز میں قائم رہنے کی صلاحیتیں ہونگی۔ وہ زیادہ باقی رہے گی۔ عالم نباتات اپنے سے کمتر صالح مٹی سے خلیوں کے لئے مسالہ۔ پانی سے نمی اور ہوا سے تنفس حاصل کر کے پھولتا پھلتا تھا۔ اب عالم حیوانات نے ان دونوں جمادات و نباتات سے اپنی غذا حاصل کی۔ درختوں اور ان کے اجزا کو اور مٹی کو چاٹنے۔ کھانے۔ چگنے اور چرنے لگے اور تو اور حیوان کو بھی حیوان مار کر کھانے لگے۔۔

نباتات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت (فطرت) شادابی و رعنائی کے نام سے پھولوں کو رنگ برنگا بناتی تھی طیور میں اسے خون کی لطافت سے پروں کو رنگین کر دیا پھولوں کے آس پاس کے غبار رنگین میں رقص ڈال کر تتلیاں بنا دیں اب ذرا فکر کی نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی فاطر یا صانع نے کیاریوں اور گملوں میں رنگ برنگے پھول بنائے ہیں اور انہی کے پاس ہمرنگ و ہم نزاکت تتلیاں اور ذرا دور آشیانوں میں ننھے اور نازک پرند جمع کر دیئے۔ فرقِ صرف یہ ہے کہ پھول میں شادابی و رعنائی اجزائے زمین کے عرق یا رس سے ہے تتلیوں اور پرندوں میں ہزار رنگینیاں لطیف خون سے ہیں۔

فطرت نے ایک خاص عطیہ بھی عالم حیوان کو دیا اور وہ ہے "صوت" ہم نے تو دیکھا نہ سنا کہ نباتات باتیں کرتے ہوں یا سنتے ہوں مگر شاعر کہتے ہیں کہ پھول باتیں کرتے ہیں سنتے ہیں بلکہ ہنستے بھی ہیں۔

گل گفت کہ من مذہب دینی دارم ——— اور

بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد ——— اور

گل بخندید کہ از زاست نرنجیم ۔۔۔۔۔۔۔

"صوت" کہیں چہچہا۔ نغمہ۔ ترنم۔ بنی۔ کہیں خوفناک اور چنگھاڑ۔ نہیں معلوم فطرت کی کیا ستم ظریفی ہے کہ ہر نوع کے جانور کی بولی الگ الگ، تو ہے مگر ایک جنس کے پرند و چرند زمین کے کسی گوشہ میں ہوں ایک ہی بولی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ سائبیریا کی مرغابیاں راجستھان کی جھیلوں میں اجنبی بولی والی نہیں ہیں۔

آخر ہم کیہ فطرت کو عالم حیوانات میں بھی وہی زمانہ پیش آگیا جو عالم نباتات میں پیش آیا تھا۔ یعنی بے گنتی نوع پیدا ہوئے۔ پتہ پتہ

ڈال ڈال حشرات پھیل گئے، چپہ چپہ چرندو پرند سے بھر گیا۔ قطرہ قطرہ میں جراثیم پھر اُن کے جراثیم۔ پھر اُن کے جراثیم کہتے ہی چلے جایئے لایعلم جنود ربک الا ھو۔ فاطر ہی اپنے لشکر کو جانے فطرت ان سب کے رنگ، روپ، شکل، صورت، ڈیل ڈول، چلت پھرت دوڑ دھوپ دیکھ چکی جی سیر ہو گیا۔

جمادات و نباتات میں جتنے ظہور تھے۔ نمود تھے۔ شیوع تھے صرف تھے۔ لیکن نہ خود شناس۔ نہ خود نگر نہ خود آرا۔ اِن سے فطرت کا یہ منشا پورا نہ ہوا کہ فاطر جو خزانہ غیب ہے۔ اس کو پہچانا جائے اس کے لئے فطرت کے ارتقا نے ایک نئی لیکن اکمل و اشرف عالم کی طرف توجہ مبذول کی۔

کہیں پانی کے کنارے سڑی مٹی میں کوئی حیوانی جرثمہ پڑا تھا امتدادِ وقت کے بہترین حصہ میں فطرت نے عالم جمادات کی تمام معاون کو کشتہ کر کے۔ صلاحیتیں اور لوچ سمیٹ کر۔ برق کی لہریں اکھٹی کر کے باران کی لطافتیں اور گوہر سازیاں لے کر۔ جواہرات کی چمک دمک اور رنگینیاں جمع کر کے اس ننھے (جرثمہ) میں شامل کر دیں۔ یہی نہیں فطرت عالم نے عالم نباتات سے شادابیاں لیں رعنائیاں لیں رسیلے مزے لئے اکسیری خواص لئے۔ رنگ، روپ نزاکت توانائی شگفتگی و تبسم ساخت کے فنی گوشے۔ غرضکہ ہر مایہ ناز چیز کو لے کر سمویا اور اس ننھے (جرثمہ) کی تخلیق میں شامل کر دیا۔ عالم حیوانات سے گردش خون نظر افروزی۔ اعضا۔ سرعت۔ جنبش و حرکت۔ دور نگاہی۔ حواس صوت صوت میں سے چنگھاڑ اور چہچہے سب کا جوہر نکال کر اس ننھے میں رکھدیا۔ اس ننھے یا جرثمہ میں حرکت تھی مگر حیوانات کی حرکت سے زیادہ متوازن و سنجیدہ۔ لطیف اور نچکیلی شعاعوں نے جو حاصل جرمِ خورشید و قمر تھیں اُسے سنبھالا۔ ہوائی لطافت نے اور پاکیزہ نزہ خوشبوؤں نے اُسے اپنے آغوش میں لے کر تھپکا۔ اپنی دُنیا کے یہی شب و روز جن کو اب ہم چوبیس گھنٹہ میں تقسیم کرتے ہیں اس ننھے کو بڑے سازگار ہوئے یہ سنی مٹی میں جما ہوا لہو بنا۔ لہو بوٹی بنی بوٹی ہڈی بنی۔ ہڈیوں پر نرم نرم لچکیلا خوش رنگ گوشت چڑھ گیا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ایک احسن و اشرف و اکمل مخلوق کرہ ارض پر اُبھری۔ یہ ہمیں تو ہیں جن کا نام انسان ہے۔ ہمارے لئے ہی تو فاطر نے اپنی سب نافذ قوتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کرو۔

فطرت نے عالم حیوان کو صوت دی تھی صرف چیخنے کے لئے یا گلے سے زیر و بم بنانے کے لئے اور زبان دی تھی صرف نگلنے اور پینے میں مدد لینے کے لئے۔ عالم انسان میں صوت و زبان کے تعاون نے مخارج تلاش کر کے ایک نئے کمال کی تخلیق کی جس کا نام ہم نے رکھا ہے۔ نطق نطق ایک شرف بن گیا اور انسان اشرف المخلوقات بن گیا۔ یہی نہیں۔ نباتات میں جو اثر پذیری کی خصوصیت تھی اور حیوانات میں جو ضرر و فائدہ کا احساس تھا۔ اس کو فطرت نے مکمل کر کے عقل و شعور کے نام سے ایک اور تحفہ عنایت کیا جس کی بدولت انسان ابر و باد مہ و خورشید و فلک سے کام لینے کے قابل ہوا۔ اور اسی عقل و شعور کے تقاضے سے انسان کی سیرت بنی۔

مالک ساعات و آنات ہی جانے کہ ہمارے کتنے اصطلاحی برس انسان کو موجودہ دور تک پہونچنے میں لگے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ عقل و شعور کے سہارے سیرت کی تربیت ہوتی رہی۔ فطرت نے اپنے اس ہونہار برِوے کے بہلنے کھیلنے کے لئے اس کی عقل سے ہی کچھ کھلونے تجسس و ادراک وہم کے نام سے بنا دیئے اب یہ ستاروں پر کمند ڈالنے لگا۔ ذروں اور قطروں میں فطرت کے دفینے اور صلاحیتیں ڈھونڈنے لگا۔ یہ چاند سورج کے طلوع و غروب کو سمجھ گیا اور انکی طرف جھپٹنے لگا۔

فطرت کے ارتقائی مظاہر سبحان اللہ حیات یا زیست جمادات میں خاموش تھی نباتات میں مسکرائی حیوانات میں بولی نوع انسان میں باتیں کرنے لگی اور بخلاف اور عوالم کے نوع انسان میں زیست انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہو گئی۔ یہ اجتماعی زیست اس کے لئے وبال جان بھی بن گئی اور بکمال رُوح بھی سا اب سمجھ میں آیا کہ فاطر ہی ایسی پاک ذات اور قادر ہے کہ جس نے انسان ہی میں موت اور زندگی کا دریافتی

وقفہ اس لئے رکھا ہے کہ انسان کا یہ سلیقہ دیکھے کہ وہ اپنی عقل و شعور سے فطرت کے مناسب اپنے اعمال کو کس طرح مرتب کرتا ہے۔

عالم انسان پھلا پھولا۔ عقل نے کہیں ابراہیمی اعمال مرتب کئے کہیں نمرودی۔ کہیں کلیمی جلوے دکھلائے کہیں فرعونیت۔ کہیں کرشن و کنس کے روپ میں بڑھی۔ کہیں رامچندر و راون کے پیکروں میں آئی۔ ان کٹھالیوں میں تپ کر ایسی ایسی کسوٹیوں پر کس کر ایسے ایسے معیاروں پر جانچی جا کر انسانی عقل اور اس کی پروردہ سیرت اس منزل پر پہونچ گئی کہ فطرت کے صحیح رجحانات کو سمجھ سکے۔ تعین کا مرتبہ حاصل کر سکے۔ حق و باطل میں فارق حد بندی کر سکے۔ دل و دماغ میں توازن و تعاون پیدا کر سکے اور حیات بعد الممات کے متاع و حسنات فراہم کر سکے یعنی وہ جو اعلان ایک مرتبہ سنا تھا کہ "میں زمین میں اپنا ایک نائب بناؤں گا"۔ اس منصب کے لئے خود کو پیش کر سکے۔ اس وقت فاطر الناس نے عقل کی رہنمائی اور سیرت کی صالحانہ توانائی کے لئے نوع انسان کو صحیفِ فطرت یا کتاب حکیم اسی آب و گل کی ایک مخلوق کے ذریعہ دی جس کے جسم کے خلیے اس کتاب حکیم کے الفاظ و معانی سے پر تھے جس کے اخلاق و دانش کی پہنائیاں اس کتاب کی روح سے معمور تھیں۔

اس کھربوں سال کی پرانی دنیا میں اس نے صرف سوا آٹھ ہزار دن فطرت آرائی میں گزارے۔ فطرت کو اجاگر کر کے فاطر الناس سے روشناس کیا۔ عقل کے سنورے، ستھرے، نکھرے گوشے دکھلائے۔ سیرت کو مانجھا چمکایا۔ فطرت جماد کے عالم سے جس قوت کو سنبھالے، سہارا دیتے نامعلوم مدت میں انسان تک لے کر آئی تھی اس کی تکمیل سے انسان کو فرشتہ بنے دیکھ لیا۔ عبد صالح کے نام سے وارثِ ارضی دیکھ لیا۔ خلیفۃ اللہ دیکھ لیا پہچان لیا۔ فطرت ہی کا تو ساختہ پرداختہ تھا۔ فطرت اب ان چار عالموں کے بعد کسی اور عالم کا کیوں تصور کرے جب کہ اس کے پھیلنے پھولنے پھلنے، بڑھنے، کھل کھیلنے کے لئے عالمِ انسان میں وافر سے وافر تر گنجائشیں، وسعتیں، شاخیں، صیغے اور شعبے موجود ہیں۔ دھیان اگر جاتا ہے تو عالم ملکوت کی طرف جاتا ہے مگر وہ تو بے بسی کا عالم ہے۔ یہ آب و گل کا جاندار پتلا جو تب و تاب جاودانہ کا رسیا ہے۔ ابد تک سکون و جمود کی اجیرن زندگی کیوں گذارے۔ یہ نطق کا تنہا مالک فقط اللہ ھو اللہ ھو کیوں کئے جائے۔ یہ ظلوم و جہول، شہوانی و حیوانی قوتوں کا بادشاہ "یفعلون ما یومرون" کا غلام کیوں بنے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان خلیفۃ اللہ تو ہو۔ صاحبِ امر نہ ہو۔ صاحب امر تو ہو لیکن صاحب قدرت نہ ہو۔ صاحب قدرت تو ہو لیکن اس کے اعمال خود اس کے غور و فکر و ریاضت کا نتیجہ نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا مجبور خلیفہ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہوگا۔ اور جوابدہی سے آزادی نظام ارض کی برہمی و بربادی کا باعث ہے۔ اس لئے تقاضائے فطرت ہے کہ یہ محنت کش و عقیل و امیدوار جزا انسان جبریلی و میکائلی سے آگے بڑھ کر کچھ اور ہی چاہتا ہے۔ یہ "کچھ اور" خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ کیا ہے۔ کیسا ہے کب سے ہے کب تک ہے۔ کہاں ہے اور کیوں ہے اس تلاشِ حقیقت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ توجہ اور ظلوم و جہول و عجول کی توجہ ہی علوم و آگاہی کے لئے سینکڑوں شعبے۔ فلسفہ و منطق و ریاضیات و الٰہیات اخلاقیات و جمالیات و طبیعات و فلکیات و ارضیات و جسمانیات کے اور روحانیات و طبیعات و فلکیات و ارضیات و جسمانیات کے اور روحانیات و مادیات وغیرہ کے قائم کر کے آگے بڑھنے لگا مشاہدات و تجربات کی عمل گاہیں بنائیں۔ مادہ کی مجموسا و منفرد طاقتوں کو قابو میں لے کر شکل و صورت و اثر میں بدل دیا۔ کہیں کبھی آنکھ میچ کر روح کے پیچھے ہو لیا۔ عبادت و تزکیہ و تصفیہ و مراقبہ و مکاشفہ وغیرہ کی منزلیں طے کر گیا۔ کہیں اپنی تخلیق کی لطافتوں کو سمیٹ کر شعر و موسیقی و مصوری میں مست و منہمک ہوا کہیں خدمت بنی نوع کو ذریعہ وصول مقصد سمجھا۔ کہیں مظاہرہ طاقت و جسم جسمانیات و فتوح کو وسیلہ حصول نجات جانا۔ خیر و شر و فضائل و رذائل ایک ایک کو پرکھا۔ اس فقیری کے بھی منزل سے۔ جس کے لئے مصرعہ ہے:

ترک دنیا ترک عقبیٰ ترک مولا ترک ترک

اس شاہی کا تاج بھی سر پر رکھا جس کے لئے کہا گیا ہے

جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

غرضیکہ۔۔۔۔۔ نغمہ نے میں رہا یا نشترمے میں رہا شورش محفل رہا وہ جس کسی شے میں رہا

مقصود اس ہزار شیوگی وہمہ گیری کا یہ تھا کہ اپنی فطرت کی تسکین کرلے اور فاطر کی حقیقت کو پالے۔ مگر اُف یہ حقیقت انسان کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ دور ہی رکھا اور بہت دور۔ انسانی دماغ کی روشنیوں کو حجابی و پردہ دار بنا دیا۔ اس کی جولانی ذوق وشوق نے جو دام شکار کے لئے بنائے تھے ان کے پھندوں میں خود اس کو پھنسا دیا اور لطف یہ کہ انسان نے اس فاش شکست کا نام تسکین قلب رکھ دیا۔

قفس میں جیسے کوئی طایرِ نحیف و نزار
سر اپنا تیلیوں پہ رکھ دے اور سو جائے

حکمت و دانش کی انتہا حیرت ہے۔ حکیم دانشور بڑھے اور خوب بڑھے مگر ظن وتخمین کی وادیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ عشق کی انتہا کہیں نہیں۔ فطرت کے پاس بہترین شاہکار بھی تھا۔ یہ بھی اس نے انسان کو دیدیا۔ مگر ہوا یہ کہ کوئی "غبار و قافلہ و ناقہ محمل لیلیٰ"۔ میں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گم ہو گیا۔ کسی نے خود اپنا سر پھوڑ لیا۔ کسی کو سولی پر چڑھایا گیا کہیں شریعت کی احترام کی خاطر سر اُڑے کسی پر شاہ راہ طریقت میں سنگباری ہوئی۔۔۔۔ عشق ازیں بسیار کردست و کند۔۔۔۔۔ ایسے بھی ہوئے عشق عبودیت میں مرتاضانہ بہت آگے بڑھے مگر اپنے ہی تخمین و اوہام کے پیکر بنا کر اس کے سامنے جھک گئے۔

مذاقِ دید نے مرمر کے بت تراش لئے
خرد نے جرم کیا لطف بندگی کے لئے

مختصر یہ کہ حقیقت کی نظر فریب و دلفریب عقل فریب وادی میں یہ جنتی بھولا بھالا انسان کہیں نہ کہیں پھنس کر رہ گیا اور حقیقت کے گرد وغبار کو بھی نہ پا سکا۔ حقیقت البتہ اشنا کرتی رہی کہ ہر دل میں لگاؤ کے مطابق یقین بنی بیٹھی رہی۔

معشوق ما بہ شیوہ ہر کس موافقست با ما شرابِ خورد و بزاہد نماز کرد

وقت کا کوئی حصہ آخر نہیں ہے لیکن ایسا وقت ضرور آئے گا کہ آفریدگاری و مرگ یا تخلیق و موت تھک جائے گی اکتا جائے گی ارض خود اپنی فطرت سمیٹ لے گی اور ارض کو فاطر السموٰت والارض یا حقیقت سمیٹ لے گی۔۔۔۔ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُب۔ اے یہ کیا ہوگا!۔۔۔ ہوگا یہ کہ کل شئ ھالکٌ۔۔۔ کوئی باقی بھی رہے گا!۔۔۔ کیوں نہیں! الاّ وجہہٗ ؕ

فضل احمد عارف (ایم۔اے)
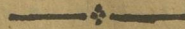
الخنساء —— عرب کی عظیم مرثیہ گو شاعرہ

اگر ہم بعثت نبوی سے پندرہ بیس سال پہلے بازار عکاظ کا نقشہ چشم تصور میں لائیں تو ہمیں حدِ نگاہ تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیں گے اور ان کے درمیان رنگ برنگے خیمہ استادہ نظر آئیں گے۔ بعض خیمے خصوصاً لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوتے ہیں۔ یہ خیمے عرب شعراء کے ہیں۔ ان میں سے وہ سُرخ سُرخ سا خیمہ غالباً اعشیٰ کا ہے۔ ساتھ والا لبید کا ہے اور ادھر دیکھئے ایک خیمہ الگ نصب ہے، جس کے دروازے پر ایک جھنڈا لہرا رہا ہے، ذرا پڑھئے تو، علم پر کیا لکھا ہے،

ہاں لکھا ہے! —— الخنساء —— ارثی العرب ——

یعنی ——

عرب کی سب سے بڑی مرثیہ گو خنسا کا خیمہ

واقعی علمائے ادب کا اس پر اتفاق ہے کہ خنسا عرب کی عظیم مرثیہ نگار شاعرہ ہے حتیٰ کہ مرثیہ کے صنفِ سخن میں فحول شعراء میں سے کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

خنسا کا اصل نام تماضر تھا اور اس کا باپ عمرو بن شرید قبیلہ بنی سلیم کا نامور سردار تھا۔ اس لحاظ سے خنسا کی پرورش ناز و نعمت کے ساتھ ہوئی۔ حسن و جمال میں بھی وہ کمال رکھتی تھی۔ قبیلہ ہوازن کے مشہور شاہسوار، سردار اور شاعر دُرید بن الصمہ نے شادی کی خواہش کی مگر خنسا نے انکار کردیا اور اپنے قبیلے کے ایک شخص کے ساتھ شادی کرنے کو ترجیح دی۔ طبیعت موزوں تھی، اس لئے کبھی کبھی دو چار شعر کہہ لیتی تھی۔ مرثیہ گوئی اور شاعری کا صحیح طور پر آغاز اس وقت ہوا جبکہ خنسا کے دو بھائی معاویہ اور صخر جو نہایت بہادر، فیاض اور بہن پر شفقت کرنے والے بھائی تھے، دشمنوں کے ہاتھوں، بیدردی کے ساتھ قتل ہوگئے۔

باپ کا انتقال پہلے ہو چکا تھا۔ بھائیوں کی وفات سے خنساء کو بڑا صدمہ پہنچا۔ چنانچہ جب جاہلی رواج کے مطابق بنی سلیم کے ان دو سرداروں کی قبروں پر نوحہ گر عورتیں کھڑی ہوئیں اور نوحہ کرنے لگیں تو فضا میں ایک دلخراش صدا جو سب سے جدا تھی، ارتعاش پیدا کرتی سُنائی دی۔ یہ آواز ایک غم زدہ بہن کی تھی کہ جو اپنے شفیق بھائیوں کا، دکھی دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ میں مرثیہ کہہ رہی تھی اس واقعہ کے بعد تو خنسا کی زندگی رونے دھونے اور مرثیہ کہنے کے لئے وقف ہوگئی۔ آٹھوں پہر روتی رہتی اور جذباتِ غم شعر کا روپ دھار کر ظاہر ہوتے رہتے حتیٰ کہ پورے عرب میں خنسا کی مرثیہ گوئی کا چرچا ہوگیا اور ان کا شمار فحول شعرائے عرب میں ہونے لگا۔

ادھر فاران کی چوٹیوں سے اسلام طلوع ہوا اور نورِ ہدایت پھیلنے لگا تو جہالت کی تاریکی میں پڑے ہوئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور خصوصاً ہجرت کے بعد لوگ کشاں کشاں حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ مدینہ منورہ جہاں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قیام تھا وفود کی آماجگاہ بن گیا۔ بنی سلیم کے لوگ بھی آئے اور انھوں نے اسلام قبول کیا، ان میں عرب کی یہ شاعرہ بھی تھی۔ ایک روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خنسا کا کلام سنا، متاثر ہوئے اور تعریف بھی فرمائی۔

اسلام لانے کے بعد خنسا نے اپنے بڑے بھائی معاویہ کی خاطر رونے دھونے میں کسی قدر کمی کردی کیوں کہ اسلام صبر کی تلقین کرتا ہے

لیکن چھوٹے بھائی صخر کا غم کچھ ایسا غم تھا جو بھلائے نہ بھلایا جا سکا، وہ کوشش ضرور کرتی مگر صبر و شکیب کا دامن ہمیشہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا مرنے والا بھائی اپنی بہن کے دل پر محبت و خلوص کے کچھ ایسے نقوش چھوڑ گیا تھا کہ ان کا مٹانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ صخر پر خنساء روتی اور اس قدر روئی کہ آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اور درد بھرے لہجہ میں کہا کرتی ؎

کنت ابکی لہ من الثار   وانا الیوم ابکی لہ من النار

یعنی پہلے تو میں صخر کو بدلہ لینے کی خاطر رویا کرتی تھی اور اب اس لئے روتی ہوں کہ وہ قتل ہو گیا اسلام نہ لا سکا اور اب جہنم کی آگ میں جلتا ہو گا۔

رفتہ رفتہ جب اسلام کی تعلیمات خنساء کے دل میں اترتی گئیں تو صبر و قرار کی دولت بھی بڑھتی چلی گئی۔ آخر عمر میں تو اسلام نے ان کی کایا ہی پلٹ دی تھی اور ان میں وہ انقلاب باطن پیدا کیا کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ خنساء کی زندگی کا یہ واقعہ جو بیان کیا جا رہا ہے ایسا واقعہ ہے کہ جس سے اسلام کی عظمت کے نقوش اُجاگر ہوتے ہیں۔

فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ۱۴ھ میں جب قادسیہ کی جنگ شروع ہوئی تو خنساء اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر جہاد میں شریک ہوئیں اور جس صبر و ہمت کا مظاہرہ وہاں کیا، اس کی یاد تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کر رکھی ہے۔

معرکہ اغواث جنگ قادسیہ کا پہلا معرکہ تھا۔ فوجیں جب تیار ہونے لگیں تو خنساء نے اپنے چاروں بیٹوں کو خود تیار کر لیا۔ سامان حرب ان کے بدن پر سجایا اور جہاد کی ترغیب دی۔ حمیت، غیرت اور اپنی عفت اور عصمت کا واسطہ دیتے ہوئے ان الفاظ میں مخاطب ہوئیں

لم تنب بکم البلاد ولم تقحکم السنۃ ثم جئتم بامکم عجوز کبیرۃ فوضعتموھا بین ایدی اھل الفارس واللہ انکم لبنو رجل واحد کما انکم بنو امرۃ واحدۃ ماخنت اباکم ولا فضحتُ خالکم انطلقو فاشھدوا اول القتال وآخرہ

میرے جگر کے ٹکڑو! تم اپنے ملک پر بوجھ نہ تھے اور نہ تمہیں قحط سالی نے ستایا تھا بلکہ عظیم مشن کی خاطر تم خود وطن سے نکلے اور اپنے ساتھ اپنی بوڑھی سن رسیدہ ماں کو لے آئے اور اسے (دشمنانِ اسلام) اہل فارس کے سامنے ڈال دیا۔ خدا کی قسم (تم اپنے باپ کی خالص اولاد ہو اور جس طرح) تمہاری ماں ایک ہے، اسی طرح تمہارا باپ بھی ایک ہے، بخدا میں نے تمہارے باپ کی امانت میں خیانت نہیں کی اور نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا ہے

لو، اب جاؤ اور لڑائی میں ابتدا سے لے کر انتہا تک مصروفِ جہاد رہو۔۔۔۔

چاروں بیٹوں نے گھوڑوں کو میدان جنگ کی طرف بڑھایا اور جب نظروں سے غائب ہو گئے تو اطمینان سے خدا کی بارگاہ میں دعا کی:۔

"خدایا! میری متاع عزیز یہی کچھ تھی، اب تیرے سپرد ہے۔"

چاروں مجاہدوں نے خوب داد شجاعت دی اور ایک کر کے اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے۔ خنساء نے بیٹوں کی شہادت کی خبر سُنی تو زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔

الحمد للہ الذی شرفنی بقتلھم ——— اس ذات پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جس نے میرے بچوں کو شہادت کا شرف بخش کر مجھے سرفراز فرمایا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے خنساء کے اس ایثار، صبر و تحمل کو بنظر استحسان دیکھا اور چاروں کے وظیفے ماں کے نام جاری رکھے۔

امیر معاویہؓ کا عہد تھا کہ بادیہ میں دوسروں کو رونے والی خاتون، دوسروں کو روتا چھوڑ کر خود چل بسی۔۔۔۔

شاعری خنساء کے شعر کہنے کا اسلوب سادہ مگر نہایت دل کش ہے، رقت الفاظ، حلاوت اور شدتِ تاثر کی وجہ سے ان کا کلام ممتاز ہے۔ فخریہ شعر کہنے اور مرثیہ میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتیں ان کے شعر چونکہ دردمند دل سے نکلے ہیں، اس لئے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

ع　دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔۔۔۔

جریر اموی دور کے تین بڑے شعراء میں اپنی رقتِ شعر کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اس نے اپنی بیوی کا جو مرثیہ کہا ہے، وہ سوز اور اثر کے اعتبار سے اس قدر بلند پایہ ہے، اور اس قدر مقبول ہوا کہ جریر کے ہمعصر بلکہ مدمقابل شاعر فرزدق کی بیوی کا جب انتقال ہوا تو اس کی قبر پر نوحہ گر عورتوں نے جو نوحہ پڑھا تھا، وہ جریر ہی کا مرثیہ تھا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

لولا الحیاء لہاجنی استعبار　　　ولزرت قبرک والجنیب یزار

اس جریر سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ اگر خنساء نہ ہوتی تو میں ہی سب سے بڑا شاعر تھا۔ بشار بن برد جو نہ صرف خود شاعر تھا بلکہ سخن فہمی اور شعر کی پرکھ میں ید طولیٰ رکھتا تھا اس کی رائے تھی کہ عورت جب شعر کہے گی تو اس میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہوگی مگر جب اس سے خنساء کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا۔

وہ تو فحول شعراء سے بھی بڑھ گئی ہے۔

مشہور جاہلی شاعر نابغہ ذبیانی کہ جس کا قصیدہ سبع معلقات میں شامل ہے، وہ بھی خنساء کی عظمت شعری کا اعتراف عموماً کیا کرتا تھا تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عکاظ کے بازار میں جہاں شاعری کا غلغلہ بلند ہوتا تھا، وہاں خنساء کو خاص مقام حاصل تھا۔ اس کے خیمے کے دروازے پر علم ہوتا تھا اور اس پر "ارثی العرب" کے الفاظ اس عظیم مرثیہ گو شاعرہ کے تعارف کے لئے تحریر تھے۔

نمونہ کلام

۱۔

أعینیّ جودا ولا تجمدا　　　الا تبکیان لصخر الندی؟

ــــــ اے میری دو آنکھو! خوب آنسو بہاؤ اور ہرگز نہ رکو کیا تم سخی صخر کو نہیں روؤ گی؟

ألا تبکیان الجریٔ الجمیل　　　ألا تبکیان الفتی السید

کیا تم اس خوبرو جوان، بہادر، سردار کو نہیں روؤ گی؟

یذکرنی طلوعُ الشمس صخراً　　　واذکرہ بکلّ غروب شمس

سورج جب نکلتا ہے تو وہ مجھے میرا بھائی صخر یاد دلاتا ہے (کہ جو اس وقت لوٹ مار کیا کرتا تھا) اور اسی طرح ہر غروب آفتاب کے وقت بھی مجھے اسی کی یاد آتی ہے (کہ جو اس وقت مہمانوں کی خاطر و مدارت میں لگا ہوتا تھا)

فلولا کثرۃ الباکین حولی　　　علیٰ اخوانہم لقتلتُ نفسی

(باقی مضمون صفحہ ۵ پر دیکھئے)

غزلیں

راہی بلند شہری

دل ہی جب ٹوٹ گیا ساز نہیں ہے نہ سہی
نغمہ ریز اب کوئی آواز نہیں ہے نہ سہی

دل نے جب فیصلۂ ضبطِ ستم کر ہی لیا
ملتفت وہ نگہہ ناز نہیں ہے نہ سہی

ہم نے بھی چھوڑ دیا مشغلۂ آہ و فغاں
اب کوئی گوش بر آواز نہیں ہے نہ سہی

جب ترے لب ہی غزلخوان و گل افشاں نہ رہے
میرے ہاتھوں میں اگر ساز نہیں ہے نہ سہی

حسن جب رہگذرِ عام تک آ ہی پہونچا
عشق کا راز اگر راز نہیں ہے نہ سہی

خود گلستاں کی فضا قابلِ پرواز نہیں
ہم میں گر طاقتِ پرواز نہیں ہے نہ سہی

عشق کو بھی نہیں اب فرصتِ آشفتہ سری
حسن کا پہلا سا انداز نہیں ہے نہ سہی

اپنے پہلو میں دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں
گر کوئی ہمدم و دمساز نہیں ہے نہ سہی

اعجاز برہانپوری

محبت منزلِ مقصد پہ جب مسند نشیں ہوگی
وہ دن کتنا حسیں ہوگا وہ شب کتنی حسیں ہوگی

خوشی سے غم دیئے جا روز و شب اے گردشِ دوراں
طبیعت میری ان باتوں سے رنجیدہ نہیں ہوگی

فروغِ کفر سے کیا خوف ہوگا شمعِ ایماں کو
یہ ایسی روشنی ہے جو کبھی مدھم نہیں ہوگی

بہت ایسے ہیں جن کو قابلِ سجدہ کہیں لیکن
جبینِ شوق جز تیرے کہیں بھی خم نہیں ہوگی

جسے تو مشغلہ سمجھے ہوئے ہے دل لگانے کا
یہی دنیائے دل اس روز مارِ آستیں ہوگی

ماہر القادری

کسی کی بے رخی کا غم نہیں ہے
کہ اتنا ربط بھی کچھ کم نہیں ہے

نہ ہشیاری، نہ غفلت ہے نہ مستی
ہمارا اب کوئی عالم نہیں ہے

رگِ جاں سے بھی وہ نزدیک تر ہیں
مگر یہ فاصلہ بھی کم نہیں ہے

یہاں کیا ذکر شرم و آبرو کا
یہ دورِ عظمتِ مریم نہیں ہے

کوئی دعوےٰ کرے کیا معرفت کا
صفت بھی ذات کی محرم نہیں ہے

فغاں اک مشغلہ ہے عاشقوں کا
یہ عادت بربنائے غم نہیں ہے

فرشتوں کی یہ شانِ بے گناہی
جوابِ لغزشِ آدم نہیں ہے

ماہر القادری

یادِ رفتگاں!

مولوی عبدالحق (بی اے)[1]

بابائے اُردو

حیدرآباد دکن میں ایک صاحب تھے محمد اصغر بیرسٹر، مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے (غالباً علاتی) بھائی تھے۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں اصغر بیرسٹر بڑے جوشیلے قومی کارکن تھے پھر وہ ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ "نواب اصغر یار جنگ" خطاب ملا، شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ اصغر تخلص کرتے تھے۔ نواب معظم جاہ بہادر کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے، شعر پر داد دینے کا خاص انداز تھا۔ حضرت فانی بدایونی لطف لینے کے لئے مجھ سے پوچھتے "بھئی ماہر! رات پرنس کے یہاں نواب اصغر یار جنگ بہادر نے فلاں شعر پر کس طرح داد دی"۔ میں نقل کر کے بتاتا، اس پر فانی مسکراہٹ سے لے کر قہقہہ تک پہونچ جاتے!

انہی نواب اصغر یار جنگ بہادر کے یہاں سب سے پہلے میں نے مولوی عبدالحق صاحب کو دیکھا، یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے!

نواب اصغر یار جنگ بہادر غالباً اُس وقت تک "اصغر بیرسٹر" تھے، اور اُسی سال جج ہو بھی گئے ہوں۔ تو نوابی کے خطاب سے بہرحال سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی معیت میں میرا وہاں جانا ہو گیا، چائے کا دور چلا، مولوی عبدالحق کتاب کے مطالعہ میں مصروف کیا مستغرق تھے! مولوی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی بلکہ اُن کا دیدار رہا، بات چیت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مولوی صاحب کے تعارف کی ضرورت ہی نہ تھی کہ انہیں سب لوگ جانتے تھے اور اب سے اکتیس سال قبل میں کسی حیثیت سے بھی قابل تعارف نہ تھا۔

مولوی عبدالحق کا قیام اُن دنوں اورنگ آباد میں رہتا تھا، پھر وہ چند سال کے بعد بلدہ حیدرآباد میں آ گئے۔ اسے کوئی چاہے تو احساسِ کمتری سے تعبیر کر لے یا اس کو خودداری کا نام دیدیا جائے بہرحال مجھے مولوی صاحب کی قیامگاہ پر جانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی، جلسوں اور پارٹیوں میں دو چار بار اُن کا دیدار ہو کر رہ گیا! یہ میری عادت رہی ہے کہ میں نے

---

[1] بابائے اُردو مذہبی عالم نہ تھے، حیدرآباد دکن میں اُن کا تقریباً پچاس سال قیام رہا ہے اور محکمہ تعلیمات کے معزز عہدوں پر وہ فائز رہے ہیں، اس لئے "مولوی" اُن کے نام کا جزو لاینفک بن کر رہ گیا، کیونکہ ریاست دکن میں سرکاری طور پر "مسٹر" کی جگہ "مولوی" عہدیداروں کے ناموں کے ساتھ لکھا جاتا تھا! مولوی عبدالحق نے جس زمانے میں بی اے پاس کیا ہے۔ اس دور کے ہندوستان کے مسلمانوں میں گریجویٹ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، بی اے کے امتحان میں کامیابی بہت بڑا تعلیمی اعزاز تھا چنانچہ مولوی عزیز مرزا اور مولانا ظفر علیخاں کے ناموں کے ساتھ "بی اے" لازمی طور پر لکھا جاتا تھا۔ رسالہ اردو کا سرورق ہو یا "بابائے اردو" کی دوسری تصنیفات ——— ہر جگہ ——— مولوی عبدالحق بی اے لکھا ہوا ملے گا، یہی اُن کا پسندیدہ نام بھی تھا، اور اسی نام اور لقب سے وہ مشہور بھی ہوئے

خواہش کے باوجود اپنی طرف سے اکابر و مشاہیر سے ملنے کی پیش قدمی شاذ و نادر ہی کی ہے! مگر اُن سے ملاقات کے اسباب خود بخود پیدا ہو گئے ہیں، کیسے کیسے نامی گرامی آدمیوں سے ملاقات کے مواقع کس وقار کے ساتھ میسر آئے ہیں — میرا ہی شعر ہے

تجلی بے حجابی کے لئے تیار ہو جائے
نگاہِ شوق تھوڑی سی اگر خوددار ہو جائے

انہی دنوں حیدر آباد دکن میں "ملکی تحریک" نے زور پکڑا، اس وطنی عصبیت کا نشانہ سب سے زیادہ یو۔ پی کے مسلمان تھے! اس المیہ کو کس سے بیان کیجئے کہ اس خطہ مینو سواد اور ذہانت بنیاد کے رہنے والوں کی "روشنی طبع" ہر دور میں، ہر جگہ ان کے لئے "بلائے جان" ثابت ہوئی ہے۔ ہائے! یہ سفلہ پرور دُنیا، جہاں ذہانت و دانش پر نااہلی اور نالائقی کی پھبتیاں چسپت کی جاتی ہیں۔

حیدر آباد دکن میں جب "ملکی تحریک" کا آغاز ہوا ہے، تو قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ تک اس فتنہ کی جھپیٹ میں آ گئے۔ بلدہ حیدر آباد دکن کے ویوک وردھنی تھیٹر میں، مشہور مہاسبھائی لیڈر وامن نایک کے ساتھ اسی موضوع پر نواب صاحب نے دھواں دھار تقریر کی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا کہ وہ بہت ہی جلد اس مخمصے سے نکل گئے، اور پھر اسلامی اتحاد کے پر جوش داعی اور کتاب و سنت کے نقیب بن گئے! (اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمت ہو)

"ملکی تحریک" نے جب زور پکڑا، تو مولوی عبدالحق صاحب کی ذات اور انجمن ترقی اُردو بھی اس لپیٹ میں آ گئیں، بلدہ حیدر آباد کے جن حلقوں میں بھی میری پہونچ تھی، میں نے پوری قوت کے ساتھ مولوی صاحب کی مدافعت کی، میں نے شد و مد کے ساتھ کہا کہ جہاں تک اُردو زبان و ادب کی خدمت و ترقی کا تعلق ہے، پورے دکن میں ایک شخص بھی اُن کی برابری نہیں کر سکتا بلکہ بہت سے ادیب اور اہلِ قلم جن کو اُردو دانی کا دعویٰ ہے۔ مولوی صاحب کے پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہیں۔

میرا یہ کہنا کہ "میں نے مولوی صاحب کی مدافعت کی" یقیناً چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ میں کیا اور میری مدافعت کیا! مگر کسی حق بات کی تائید و حمایت کے لئے لغت میں "مدافعت" کے علاوہ کوئی اور موزوں لفظ ہی نہیں ہے! جن دنوں کی یہ بات ہے، اس وقت تک مولوی صاحب کی خدمت میں مجھے شرفِ نیاز بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ جب اُن کی خدمت میں آنا جانا ہوا، تو ان باتوں کے ذکر کا کوئی محل ہی نہ تھا، اور محل بھی ہوتا تو میں اس اوچھے پن کے لئے آمادہ نہ ہوتا، اب اُن کے مرنے کے بعد اظہارِ واقعہ کے طور پر یہ باتیں درمیان میں آ گئیں۔

غالباً ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے، جب کانپور میں اُردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ کانفرنس کے صدر سر شیخ عبدالقادر اور مشاعرے کے صدر نواب جمشید علی خاں رئیس باغپت تھے، میرا قیام اُن دنوں حیدر آباد دکن میں تھا۔ کانفرنس اور مشاعرے والوں کی طلبی بلکہ اصرار پر شدِ رحال کرتا ہوا، کانپور پہنچا، دو دن اور دو رات کا مسلسل سفر، اُس کے بعد فوراً ہی کانفرنس کی شرکت!

مولوی سید محمد جامع مرحوم حیدر آباد دکن میں کسی محکمہ کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے! ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، اپنے وطن کانپور میں رہتے تھے، افتخار آباد میں اُن کی چھوٹی سی کوٹھی تھی، بڑے ہی وضعدار، علم دوست اور خوش ذوق انسان تھے، مولوی عبدالحق سے اُن کا بڑا یارانہ تھا، حسنِ اتفاق کہ انہی کے مکان میں مولوی صاحب اور اُن کے چند ساتھی قیام فرما ہوئے اور وہیں راقم الحروف بھی ٹھیرا! زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مولوی صاحب کے ساتھ رہنے، کھانے پینے اور بیٹھنے اُٹھنے

کا اتفاق ہوا۔

اُردو کانفرنس بہت کامیاب رہی اور کانفرنس سے زیادہ دھوم کا مشاعرہ ہوا، مشاعرہ ختم ہوا تو حکیم اسرار احمد صاحب کریوی نے کہا کہ مولوی عبدالحق صاحب صبح سویرے مہگاؤں جا رہے ہیں، مولوی صاحب کا ارشاد ہے کہ "ماہرالقادری اور آسان دانش بھی انجمن کی خاطر میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا کریں، وہاں کل شب میں چھوٹا سا مشاعرہ ہوگا۔ ۔ ۔" مولوی صاحب کے حکم کو کون ٹال سکتا تھا، اُردو کے خدمت گزاروں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جس کے امیر مولوی عبدالحق صاحب تھے، ٹرین کے ذریعہ منوری اسٹیشن پر اُترا، اور وہاں سے تانگوں میں بیٹھ کر سب لوگ مہگاؤں پہنچے! یہ گاؤں نہیں مسلمان شرفاء کا چھوٹا سا قصبہ نکلا جہاں کے لکھے پڑھے لوگ زیادہ تر محکمہ پولیس میں ملازم تھے! ہم جب اسٹیشن سے بستی کی طرف روانہ ہوئے ہیں تو راستہ میں امرودوں کے باغات ملے، امرودوں سے درخت لدے ہوئے تھے بلکہ یوں کہئے خوب بہار دے رہے تھے۔ الٰہ آباد یہاں سے دور نہ تھا، بہت سے بہت دس بارہ میل ہوگا۔

مولوی عبدالحق کھانے کے بہت شوقین تھے، میزبانوں سے سرسوں کے ساگ کی فرمائش کی! مغرب کے بعد دسترخوان بچھا، کھانا آیا۔ دو رکابیوں میں سرسوں کا ساگ بھی تھا! کھانے والے دس بارہ سے کیا کم ہونگے، سرسوں کا ساگ ایک ایک نوالہ جوگا بھی نہ نکلا، مولوی صاحب نے سرسوں کے ساگ کی خالی رکابی اٹھائی، مطلب یہ تھا کہ سرسوں کا ساگ اور دے کر آؤ، مگر اس کے جواب میں پلاؤ، قورمہ، کھیر اور شامی کباب لائے چلے جا رہے ہیں' لیکن سرسوں کا ساگ نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ساگ کے انتظار میں سب لوگ کھانا کھا کر اُٹھ بھی گئے، میزبانوں سے کمرہ خالی ہوا تو مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا۔

> "تم نے دیکھا۔۔ (میں نے اثبات میں سر ہلایا) یہ عجیب آدمی نکلے! ارے بھئی! پلاؤ اور قورمہ تو دعوتوں میں کھاتے ہی رہتے ہیں' ہم نے تو دیہاتی کھانے سرسوں کے ساگ کی فرمائش کی تھی، شہروں میں یہ نعمت کہاں میسر آتی ہے۔۔۔ مگر ان لوگوں نے ساگ کے معاملہ میں نزاکت کی حد ہی کر دی۔ ۔ ۔"

مشاعرے کے بعد مولوی صاحب موٹر کار کے ذریعہ الٰہ آباد چلے گئے، اور وہاں ڈاکٹر نجم الدین جعفری کے یہاں قیام کیا۔

انجمن ترقی اُردو کا دفتر دلی منتقل ہو جانے کے بعد، مشاعروں کے سلسلہ میں جب بھی میرا دلی آنا ہوتا تو مولوی صاحب کے یہاں ضرور حاضری دیتا، بڑے تپاک اور بزرگانہ شفقت سے ملتے، ۱۹۴۱ء میں مولوی صاحب کے ایما سے، کراچی کے مشاعرے اور کانفرنس میں شرکت کی، پیر الٰہی بخش اُن دنوں وزیر تعلیم تھے، اُن کوٹھی کے سامنے ایک بنگلہ میں شعراء کا قیام تھا، پیر حسام الدین صاحب راشدی سے اسی سفر میں پہلی بار ملاقات ہوئی، سندھ میں وہ مولوی صاحب کے سب سے زیادہ معتمد علیہ اُردو کے کارکن کا اُن کے رفیق کار سمجھے جاتے تھے۔ مولوی صاحب کے ساتھ ہمراہ، پیر صاحب موصوف کے یہاں کئی بار دعوتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ بھی ملا۔

۱۹۴۵ء میں ناگپور میں نہایت شاندار پیمانے پر اُردو کانفرنس منعقد ہوئی، نواب صدیق علی خاں، حکیم اسرار احمد کریوی' ابراہیم علی خاں فنا اور سید صلاح الدین بہاری اس کانفرنس کے رُوحِ رواں تھے! ودیا مندر اسکیم کے مقابلہ میں سب سے زیادہ فعال اور مستحکم محاذ ناگپور ہی میں قائم تھا، مولوی صاحب نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ "یہ ناگ پور نہیں "جاگ پور" ہے، اس شہر میں اُردو کی ترقی اور بقا کے لئے بڑی بیداری پائی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔" اکانفرنس میں بڑی پرجوش تقریریں ہوئیں، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ناگپور کا ذرہ ذرہ "اُردو، اُردو" پکار رہا ہے۔

ناگپور کا آل انڈیا مشاعرہ بھی یادگار رہے گا۔ پورا پنڈال ہزارہا سامعین سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ تو مبالغہ ہے کہ تل دھرنے

کی بھی کہیں جگہ نہ تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ سامعین پھیل کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ میری ایک نظم (اُردو) جو مولوی صاحب کو بھی پسند تھی۔ اُس کے لئے سامعین نے فرمائش کی! میں نے عرض کیا مجھے یہ نظم پوری طرح یاد نہیں ہے، آوازیں آئیں کہ جتنے شعر بھی یاد ہوں، سُنائیے! اتنے میں ایک صاحب نے میرا چھپا ہوا کلام میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس میں یہ نظم بھی تھی جس کے تین شعر یہ ہیں:۔

موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اُردو ۔۔۔ طبعِ دشمن پر مگر پھر بھی گراں ہے اُردو
اس کو قوموں کے تمدن نے کیا ہے پیدا ۔۔۔ کون کہتا ہے کہ قلعہ کی زباں ہے اُردو
کیا مٹائے گا کوئی اس کو مٹانے والا ۔۔۔ دل میں آنکھوں میں، خیالوں میں نہاں ہے اُردو

دوسرے دن صبح کو بک اسٹال والے نے مجھ سے کہا کہ آپ کے مجموعہ کلام کے کئی درجن نسخے ہمارے پاس موجود تھے اور صرف چند نسخے کل تک فروخت ہوئے تھے مگر آپ نے اپنی کتاب میں دیکھ کر جو "اُردو" پر نظم سُنائی تو اس کے بعد تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ بک گئے اس کانفرنس کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولوی صاحب جو کھانے کے معاملہ میں متنوع اور نفیس ذوق رکھتے تھے۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ایک وقت میں معمولی پکا ہوا صرف ایک سالن ہوتا تھا، مولوی صاحب نے کھانے کے معاملہ میں اپنے لئے خاص اہتمام پسند نہیں فرمایا، وہ ذرا سا اشارہ بھی کر دیتے تو سب کچھ ہو سکتا تھا!

میں بھی ۱۹۴۲ء میں دلی آگیا، انجمن ترقی اُردو کا دفتر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں تھا۔ اور یہی کوٹھی مولوی صاحب کی اقامت گاہ تھی۔ وہاں بار ہا آنا جانا ہوا، ایک بار مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے، پرسوں گاندھی جی یہاں تشریف لائے تھے، میں نے اُن سے کہا کہ اُردو کے ساتھ سی۔ پی میں بڑا ظلم ہو رہا ہے، گاندھی جی نے جواب دیا۔
"پر میری تہکیک[1] (تحقیق) میں تو یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔۔۔۔"

میں نے (مولوی صاحب نے) جواب دیا کہ آپ نے تو ملزموں سے تحقیق فرمائی ہے، اس پر گاندھی جی نے کہا کہ آپ اس مسئلہ کے بارے میں ضروری مواد میرے پاس بھجوا دیں! چنانچہ مولوی صاحب نے پوری مسل (FILE) مرتب کر کے مہاتما جی کی خدمت میں بھیج دی مگر جب نیتوں میں فساد پیدا ہو جائے تو پھر کوئی دلیل و حجت کام نہیں آتی!

دلی میں کئی بار مولوی صاحب نے مجھے دوپہر اور رات کے کھانے پر بلایا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے کھانا کھلا کر شعر سُننے کی کبھی فرمائش نہیں کی۔ ورنہ عام طور پر شاعروں کو شعر خوانی کے لئے ہی دعوتوں میں بلایا جاتا ہے! انجمن ترقی اُردو کے دفتر میں مولوی صاحب کے بعد سب سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر شخصیت علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی کی تھی، اُن سے پہلی بار ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی۔ جب وہ دکن تشریف لے گئے تھے اور مہاراجہ سرکشن شاد بہادر یمین السلطنۃ نے اُن کے اعزاز میں طرحی مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ طرحی مصرعہ تھا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علامہ دتاتریہ کیفی سے استفادہ کی خاطر میں زبان کی ضرب الامثال اور محاوروں کے بارے میں گفتگو چھیڑتا، مگر وہ اس گفتگو کو مختصر فرما کر بلکہ بات کاٹ کر، اپنی طویل نظمیں سنانا شروع کر دیتے! پرانے ہندوؤں میں پنڈت امرناتھ ساحر اور علامہ دتاتریہ کیفی اُردو کے حامی بلکہ عاشقِ زار تھے! اور اب پنڈت تا رتشی اس مسند کو سنبھالے ہوئے ہیں!

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جو بپتا پڑی کہ اس آشوبِ قیامت کے سامنے سنہ ستاون کا غدر

[1] مولوی صاحب نے گاندھی جی کے لہجہ کی نقل اتارنے کی کوشش فرمائی!

بھی گرد ہو کر رہ گیا، تو راقم الحروف کو بھی اس شعر کی معنویت سے دوچار ہونا پڑا ؎

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

مگر "یادِ وطن" کے سمجھانے کو کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر ٹھکرا دینا پڑا ۔۔۔ ہائے!

وطن چھوڑ آئے، چمن چھوڑ آئے
وہ آغوشِ گنگ و جمن چھوڑ آئے (م۔ق)

آہ! اس ذکر نے کتنی چوٹوں کو ابھار دیا اور کتنے زخموں کو ہرا کر دیا۔

مفسدوں کی نگاہ میں انجمن ترقی اردو اور انگریزی "ڈان" کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ انہی کے دفتروں کو سب سے زیادہ تباہ کیا گیا، مولوی صاحب، ہندوستان میں رہنا بھی چاہتے تو انہیں وہاں کون رہنے دیتا، یا تو وہ مارے جاتے، یا جیل بھیج دیے جاتے!

کراچی میں مولوی صاحب کی خدمت میں بار بار حاضری کا موقعہ ملا، میں نے اُن کو کبھی بھی خالی بیٹھا ہوا نہیں پایا، وہ لکھتے ہوتے یا پڑھتے ہوتے! انجمن کے دفتر میں مولوی صاحب کے علاوہ اختر میاں جونا گڑھی سے بھی ملاقات ہو جاتی، جو اپنے علم وفضل، علمی تحقیق و تدقیق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے عظیم شخصیت تھے!

ایک صاحب تھے علی شبّر حاتمی، حیدرآباد دکن میں انھوں نے انجمن ترقی اردو کے لئے زمین آسمان ایک کر دیے تھے، مولوی صاحب کے عقیدت مندوں کا کچھ شمار نہیں، مگر اُن کا فدائی اور جاں نثار علی شبّر حاتمی سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا! مولوی صاحب اُن کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، افسوس ہے کہ چند سال سے وہ لاپتہ ہیں، سندھ میں حکومت کے اشتراک سے بڑے پیمانہ پر غلہ کا کاروبار کیا تھا۔ اس میں کوئی ایسا نازک مرحلہ آیا کہ وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایکا ایکی غائب ہو گئے، مولوی صاحب کو اُن کی گمشدگی کا بڑا صدمہ ہوا، علی شبّر کے بیوی بچوں کی مولوی صاحب ہمیشہ خبر گیری اور مدد کرتے رہے ہاں! تو یہی علی شبّر حاتمی، مولوی صاحب کی طرف سے دعوت اور جلسہ کا پیام لیکر آیا کرتے تھے، شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم کو انجمن ترقی اردو نے بلایا، تو اُس جلسہ کے لئے مولوی صاحب کے ایما پر میں نے نظم کہی، مولوی صاحب نے اس نظم کو کو پسند فرما کر اُس کا عنوان نظم کے اس مصرعہ:۔

حکم ہو جائے کہ اُردو کا چلن اب عام ہو

کو تجویز فرمایا، یہ نظم انجمن کی طرف سے چھاپی گئی، اور جلسہ میں تقسیم کی گئی، سامعین نے اس نظم کا خاصہ خیر مقدم کیا، مگر جب میں نے اپنے کلام پر اشاعت سے قبل نگاہِ انتخاب ڈالی، تو اسے خارج کر دینا پڑا کہ اس میں واقعیت زیادہ اور شعریت کم تھی!

تقریباً چھ سال سے مولوی صاحب کے یہاں میرا آنا جانا نہیں تھا، کیوں نہیں تھا؟ یہ داستان الم انگیز ہے اور عبرت خیز بھی، اگر میں اس کو چھپا جاؤں تو قومی جرم کا مرتکب ہوں گا! ہوا یہ کہ انجمن ترقی اردو کے بارے میں بعض ثقہ اور ذمہ دار اصحاب کی زبانی بعض ایسے اضطرابات کا علم ہوا، جو حیرت انگیز تو تھے ہی تکلیف دہ بھی تھے! عام طور پر مولوی صاحب کے سوءِ مزاج کی شکایت سُنی گئی جس کا سبب پیرانہ سالی ہی ہو سکتا ہے بعض اہل الرائے نے ان معاملات کو سُلجھانے کی بھی کوشش کی مگر ایک شخص جس کو مولوی صاحب بہت چاہتے تھے، اُس کا ذکر آتے ہی وہ آتش زیر پا ہو جاتے یہ کہ "جو کوئی اس کا مخالف ہے وہ میرا مخالف ہے"

میں نے اسی وجہ سے مولوی صاحب کی خدمت میں آنا جانا ترک کر دیا تھا کہ ان مسائل کا ذکر چھڑ گیا اور میرے منہ سے کوئی بات نکل گئی، تو کہیں میں بھی اُن کی خفگی کا نشانہ نہ بن جاؤں اور بدمزگی کی نوبت نہ آجائے اس لئے میں نے دور رہنے ہی میں بھلائی دیکھی۔

انجمن ترقی اُردو کے یہ اضطرابات اُلجھتے ہی چلے گئے۔ میں نے بعض حضرات سے کہا کہ مسٹر چرچل کی مثال ہمارے سامنے ہے، دوسری جنگِ عظیم اسی بوڑھے مدبر کے حوصلے اور حسنِ تدبیر کی بدولت انگلستان اور اتحادیوں نے جیتی ہے، مگر جنگ کے بعد انگریز قوم نے چرچل کے ہاتھ سے زمامِ کار لے لی۔ مولوی صاحب نے اُردو زبان کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے، وہ اپنی جگہ مُسلم ہے، اُردو زبان کے وہ بہت بڑے محسن ہیں، ان کو آپ سونے کے چبوترے پر بٹھا دیجئے۔ زندگی کے آخری دور میں ان کے لئے ایسا انتظام کر دیا جائے کہ وہ ہر ممکنہ آسائش اور اطمینان و فراغت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں، مگر انجمن ترقی اُردو ایک قومی ادارہ ہے اُسے شخصی احترام پر بھینٹ چڑھنے سے بچائیے! انجمن کے اربابِ حل وعقد شدید دل گرفتگی کے باوجود حد درجہ احترام ہی کا پاس ولحاظ کرتے رہے اور اس اقدام کی جرأت نہ کر سکے۔

مولوی سید تقی الدین مرحوم سے مولوی صاحب کے پرانے تعلقات تھے، اُردو کالج کی انہی نے بنا ڈالی تھی۔ ان کو مولوی صاحب نے کھڑے کھڑے علیحدہ کر دیا۔ یہی صورت سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ پیش آئی ہاشمی صاحب مولوی صاحب کے انتہائی مخلص رفیق کار تھے، کم از کم ۳۵ سال سے وہ ہر مرحلہ پر مولوی صاحب کے دست و بازو بنے رہے! پیر حسام الدین راشدی جن کی کوششوں سے انجمن ترقی اُردو کو یہ عمارت الاٹ ہوئی تھی انجمن اور کالج کی رسّہ کشی اور ان افسوسناک حالات کو دیکھ کر وہ بھی چیخ اُٹھے! ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر معین الحق جیسے مخلص اور بے غرض کارکن بھی ان الجھنوں کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوئے! مولوی صاحب نے انہی دنوں اپنا ایک خاص نمائندہ مسٹر اسکندر مرزا کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لائیں اور انجمن کی مجلس منتظمہ کو توڑ دیں۔ مگر مولوی صاحب کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی! مولوی صاحب کوئی شک نہیں انجمن ترقی اُردو کے معمار اور محافظ و سرپرست تھے لیکن انہی کے مزاج وطبیعت کے ہاتھوں انجمن کو جس خار زار سے گزرنا پڑا[1]، اُس کا سبب اُن کی وہ پیرانہ سالی تھی جسے حدیث شریف میں "ارذل العمر" کہا گیا ہے،

مولوی صاحب نہ مذہبی آدمی تھے، نہ مذہبی مسائل سے انہوں نے کبھی کوئی واسطہ رکھا اور نہ دینی معاملات اُن کے فکر و عمل کے موضوع تھے۔ مگر علالت کے زمانہ میں انہوں نے "عائلی کمیشن" کی تائید کر کے، دینی طبقوں کو ملول کر دیا، مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنے ہفت روزہ "صدقِ جدید" میں اس خبر پر "دانا کی نادانی" کا عنوان قائم کیا اور لکھا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق، جس طرح ہمیشہ مذہبیات سے الگ تھلگ رہے ہیں، اب بھی انھیں ایسا ہی رہنا چاہیئے تھا۔ آخر عمر میں انھوں نے یہ کیا کیا!

زندگی کی جھلکیاں

مولوی عبدالحق کا مولد و منشا ہاپوڑ[2] ہے، یہ ضلع میرٹھ کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ جو دلی سے پچیس میل دُور ہے ہاپوڑ اتر پردیش (یو۔ پی) میں غلہ کی سب سے بڑی منڈی ہے، لاکھوں من غلہ بڑی بڑی کھتیوں اور کوٹھیوں میں محفوظ رہتا ہے، غلہ پر سٹہ کی جو گرم بازاری رہتی ہے، اُس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چند گھنٹوں میں لاکھوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں، مولوی معشوق حسین اطہر جو شاعر سے زیادہ عروضی تھے، ہاپوڑ ہی کے رہنے والے تھے، اور مشہور مزاحیہ شاعر اکبر بھی اسی خاک سے اٹھا اور میرٹھ میں پیوندِ زمین ہو گیا۔

[1] پیر صاحب کے علاوہ کراچی کے سابق میئر حکیم محمد احسن کی جد وجہد بھی اس معاملہ میں شریک تھی۔

[2] ایک اخبار میں مولوی صاحب کا وطن سرانواں بھی بتایا گیا ہے، جو ہاپوڑ کے قریب کوئی بڑا گاؤں ہے۔

مولوی عبدالحق کے ایک بھائی ضیاء الحق تھے۔ جواب سے تقریباً چالیس سال پہلے خاصے مشہور تھے۔ شہرت اس کی کہ ہندوستان کے والیانِ ریاست کے معاملات میں وہ بڑا اونچا کھیل کھیلتے تھے!

مولوی عبدالحق نے علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی اور سرسید احمد خاں مرحوم سے ملنے جلنے اور ان کے قریب رہنے کے مواقع انہیں میسر آئے، مولانا حالی اور علامہ شبلی سے بھی مولوی صاحب نے فیض اٹھایا، تعلیم سے فارغ ہو کر وہ حیدر آباد دکن چلے گئے، اور وہاں آصفیہ ہائی اسکول میں صدر مدرسی کی خدمت پر مامور کئے گئے! اسی مدرسہ آصفیہ میں ڈیڑھ دو مہینے ہم نے بھی گزارے ہیں، اس کو بھی بتیس سال ہونے کو آئے! نواب افسر الملک بہادر (کمانڈر انچیف افواج آصفی) کے داماد میجر ممتاز یار الدولہ بہادر اس مدرسہ کے بانی اور سرپرست تھے، ان کا ارادہ مدرسہ کی طرف سے ایک ماہنامہ جاری کرنے کا تھا، اس کی ادارت کے لئے انھوں نے مجھے منتخب فرمایا، مگر یہ ارادہ بس زینتِ فکر و خیال ہی بنا رہا! میجر ممتاز یار الدولہ اپنے کو "دکن کا سرسید" سمجھتے تھے، کوئی شک نہیں وہ اپنی دھن کے پکے اور لگن کے سچے تھے، ان کی سادہ لوحی کے بعض لطیفے بھی مشہور تھے!

مدرسہ آصفیہ کے بعد مولوی صاحب حکومت دکن کے محکمہ تعلیمات میں مہتمم (ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز) ہو گئے، اور پھر اپنی خداداد قابلیت اور محنت و خلوص کے سہارے ترقی ہی کرتے چلے گئے، اورنگ آباد کالج کے وہ برسوں پرنسپل رہے ہیں اور جامعہ عثمانیہ میں شعبہ اردو کی پروفیسری کو بھی ان کی شخصیت نے شرف بخشا ہے۔

شروع شروع میں "ترقی اردو" مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھا، ۱۹۱۲ء میں یہ شعبہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا اور انھوں نے اپنی محنت، قابلیت، جانفشانی اور شخصیت سے اس شعبہ کو ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا ادارہ بنا دیا! انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق ایک دوسرے کے ساتھ وہی تعلق اور شہرت رکھتے تھے، جو ربط اور شہرت گل و بلبل، شمع و پروانہ اور چاند اور چکور کو حاصل ہے۔

مولوی صاحب نثر نگاری میں سرسید اور حالی کے مقلد تھے۔ شبلی کے علم و فضل کا بھی انھیں اعتراف تھا مگر شبلی کی شعر العجم پر تنقید کا آغاز مولوی صاحب کے رسالہ "اردو" ہی سے ہوا۔ منشی محمد امین زبیری نے شبلی نعمانی کی جو داستان معاشقہ چھاپی تھی اس کو مولوی صاحب کی رضامندی حاصل تھی۔ شبلی پر تنقید و تعریض انھیں ناگوار نہ گزرتی تھی مگر حالی پر نقد و احتساب کو وہ کسی عنوان برداشت نہ کر سکتے تھے۔

مولوی صاحب کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی اور بے تکلفی ہے، وہ تکلف کے ساتھ گھما پھرا کر اینچ پینچ سے بات کہنے کے عادی نہ تھے، ان کی تحریروں میں سلجھاؤ اور روانی کے ساتھ دل نشینی بھی پائی جاتی ہے، نہ بات کو اتنا طول دیتے کہ طبیعت اکتا جائے اور نہ اس قدر ایجاز و اختصار سے کام لیتے کہ طبیعت گھٹنے لگے۔

مصنفین اور مولفین کی کتابوں پر مولوی صاحب کے مقدمے اور تقریظیں بڑی جاندار ہیں "Conflict between Religion & Science" ڈریپر کی بہت مشہور کتاب ہے، جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے اب سے تقریباً نصف صدی قبل کیا تھا۔ یہ ترجمہ اپنی جگہ خود ایک علمی و ادبی شاہکار ہے، اس کتاب (معرکہ مذہب و سائنس) پر مولوی صاحب کا مقدمہ پڑھنے کی چیز ہے!

اپنے "ہم عصروں" کی مولوی صاحب نے جس خوبی کے ساتھ کردار نگاری کی ہے، اس کا اردو زبان و ادب میں ایک مقام ہے، خاص طور سے اپنے باغ کے ہندو مالی کو تو انھوں نے زندہ جاوید بنا دیا ہے! اب سے چار سو سال قبل دکن میں جو اردو بولی

جاتی تھی۔ اُس کے بعض شاعروں کے شعروں کی شرح میں مولوی صاحب نے جس کاوش و تحقیق سے کام لیا ہے، اس پر وہ اردو دنیا کی طرف سے مبارکباد کے اور شکر گزاری کے مستحق ہیں، اُن کی مرتب کی ہوئی "قواعد اُردو" بھی بڑی جامع گرامر ہی!
رسالہ "اُردو" اُن کی ادارت میں تقریباً چالیس سال تک نکلتا رہا ہے، اس رسالہ کے تحقیقی مقالے اور خاص طور سے کتابوں پر تنقیدیں اور تبصرے اُردو زبان میں یادگار رہیں گے، حکومت دکن کے میٹرک کے نصاب میں اُن کی مرتبہ کی ہوئی کتاب برسوں شامل رہی ہے، اُس میں ایک جگہ مولوی صاحب نے "درخت بوتا" لکھ دیا تھا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے جرأت کر کے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کر ہی دیا کہ "درخت بوئے نہیں لگائے جاتے ہیں، ہاں! بیج بویا جاتا ہے"، اس پر مولوی صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے، زبان سے کچھ نہیں کہا۔
انگلش اُردو ڈکشنری بھی مولوی صاحب کا قابل قدر کارنامہ ہے، مگر اس کے دیباچہ میں اُنہیں اپنے معاونین کے نام ضرور ظاہر کرنے چاہئیے تھے، قابلِ اعتماد اصحاب کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب کے لائق شاگرد شیخ چاند مرحوم کا اس ڈکشنری کی تسوید میں بہت کچھ ہاتھ تھا۔
میں ضلع بلند شہر (یو۔پی) کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں، مضمون نگاری شروع کی تو اپنے نواح کے محاورے استعمال کرتے ہوئے میں بہت جھجکتا تھا کہ کہیں مجھ پر دیہاتی ہونے کا الزام نہ آجائے، مولوی عبدالحق صاحب کا ایک مقالہ میر مہدی مجروح پر جب میری نظر سے گزرا تو اُس میں "جنگی پیالہ" پڑھ کر میں چونکا کہ یہ تو ہمارے علاقہ کی خاص زبان ہے، ہر بڑی چیز کو "جنگی" بولتے ہیں، مثلاً "جنگی آدمی" "جنگی ٹوپی" "جنگی گھڑی" اُس دن سے میری وہ جھجک جاتی رہی، اور اب میں ترت پُن، چھلا، جھری، مچیٹا، گنکا پھری، سکورا، بادیہ، پٹ پٹیجنا (جگنو) ادنت، دُبدا، گھپلا ـــــ جیسے لفظ بے تکلف بولتا اور لکھتا ہوں۔
مولوی صاحب کا اُردو رسم الخط میں یہ انداز تھا کہ وہ "یونیورسٹی" کو "یونی ورسٹی" گاؤں کو "گانو" اور پاؤں کو "پانو" لکھتے تھے اور غالباً ہاتھ کو "ہات" بھی! اُن کا یہ انداز عام طور پر مقبول نہ ہو سکا۔
مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ساری زندگی لکھنے پڑھنے ہی میں گزار دی، محنت کر کے اُن کے اندر اور تازگی اور توانائی آتی تھی، اس بڑھاپے میں بھی کئی طویل مقالے لکھے! کاہلی اور آرام طلبی سے اُنہیں بیر تھا۔
مولوی صاحب شعلہ بیان خطیب اور بلند پایہ مقرر نہ تھے۔ مگر اپنی بات بڑے سلیقہ سے کہتے، تقریر رُک رُک کر کرتے اور ایک ایک گھنٹہ کی تقریر میں بھی اپنے موضوع سے ادھر اُدھر نہ ہوتے، ناگپور میں "زبان و ادب" پہ تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بڑی نازک بات کہی فرمایا "نثر نگاری کا کمال یہ ہے کہ آدمی جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اُسے ہو بہو بیان کر دے!"
کراچی کے وائی، ایم سی ہال میں جلسہ ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب آغا خاں نے نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر یہ مشورہ دیا کہ پاکستان کی قومی زبان عربی ہونی چاہیے، اس پر مولوی صاحب نے طنز کی، بولے "انگریز کے زمانے میں انگریزی ہم پر مسلط رہی، اب پاکستان میں کہا جا رہا ہے کہ عربی زبان اختیار کرو تو کیا ہم ساری عمر پتھر ہی ڈھوتے رہیں گے"۔ کورنگی کے مشاعرے کی صدارت کرتے ہوتے مختصر سی تقریر کی۔۔۔ فرمایا "مشاعروں کی داد نے شاعروں کو بنایا بھی ہے اور بگاڑا بھی ہے۔۔۔!"
مولوی صاحب سنجیدہ اور متین تھے مگر اپنے بے تکلف دوستوں میں خاصے شوخ طبع نظر آتے، نواب منظور جنگ بہادر حیدرآباد دکن میں تعلقدار (کلکٹر ضلع) تھے۔ منظور جنگ نے بڑی شگفتہ اور باغ و بہار طبیعت پائی تھی، خود ہنستے، دوسروں کو

ہنساتے۔ نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن کے دربار میں اُن کی رسائی اُن کی بذلہ سنجی کے سبب ہوئی، مولوی صاحب سے ان کا بڑا گہرا یارانہ تھا۔ اس قسم کے بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا ہو جاتا۔ تو مولوی صاحب لطیفوں کی خوب خوب پھلجھڑیاں چھوڑتے اور تکلف و سنجیدگی کی بساط تھوڑی دیر کے لئے تہ کر کے رکھدیتے۔

مولوی صاحب سر سید احمد خاں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ مگر اس تاثر کا تعلق ادب و انشا سے تھا۔ سر سید کی مذہبیت کا مولوی صاحب نے اثر قبول نہیں کیا، اُن کے ڈاڑھی تھی، "مولوی" اُن کے نام کا جزُ تھا۔ لیکن وہ مذہبیت سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ پرائیویٹ صحبتوں میں مذہب پر اُن کی زبان سے پھبتیاں بھی سُنی گئیں مگر انھوں نے اپنی تحریروں میں مذہب کے خلاف ایک حرف بھی نہیں لکھا؟ زندگی کی آخری ساعتوں میں مسلمان کے قلب میں کتنی رقت، خوفِ خدا اور توبہ و انابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت کا اتنا احساس کہ وہ سچ مچ رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے ——— لیکن مولوی صاحب نے بسترِ علالت سے جو خط رقم فرمایا، اُس میں لکھا:۔

The doctors have failed.
My condition is getting worse
I have given the doctors an
ultimatum of four days.
Ayub is un-approachable and
God is too far.

(ڈاکٹر ناکام ہو گئے، میری حالت ابتر ہوتی جارہی ہے، میں نے ڈاکٹروں کو چار دن کا الٹی میٹم دیدیا ہے، ایوب تک رسائی محال ہے اور اللہ بہت دُور ہے)

یہ بھی ایک اعجوبہ ہی ہے کہ "بابائے اُردو" نے زندگی کے آخری ایام میں اپنے درد و غم کا اظہار انگریزی زبان میں کیا۔

بعض اخبارات نے مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے شادی نہیں کی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتے تھے، اپنے گھر والوں کے شدید اصرار پر انھوں نے شادی کی اور بادلِ ناخواستہ دُولھا بنے، مگر بیوی سے بے تعلق رہے، مولوی صاحب کو فراغت و اطمینان اور خوش حالی کے ماحول میں کام کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع ملتے رہے، اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کے مقبرے کے قریب وہ جس مکان میں رہتے، شاندار تھا، وسیع و کشادہ اور آرام دہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے آس پاس کا منظر بڑا حسین تھا، اب سے تیس سال پہلے اُن کی تنخواہ چودہ سو روپیہ کے لگ بھگ تھی، پھر نصاب میں اُن کی کتابیں شامل تھیں، اُس کی خاص رائلٹی انہیں مل جاتی، امتحانات کی کاپیاں جانچنے کی آمدنی اس پر مُستزاد! اُن کی مجموعی آمدنی دو ہزار سے کیا کم ہوگی، تنہا جان، بیوی بچوں اور عزیزوں کا کوئی بکھیڑا نہیں، وہ بڑی آسائش بے فکری، اور اطمینان و فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے، موٹر، بنگلہ، نوکر چاکر، اچھا کھانا، اچھا پہننا! کہاں حیدرآباد دکن اور کہاں کوئٹہ، انھوں نے گرمی گزارنے اور پھل کھانے کے لئے کوئٹہ تک کا سفر بھی کیا ہے۔ دلی میں ڈاکٹر انصاری کی شاندار کوٹھی اُن کی اقامت گاہ تھی اور وہاں ہر طرح کی آسائش انھیں میسر تھی ——— اُردو پہ مولوی صاحب کا احسان ہے اور مولوی صاحب پر اُردو کا احسان ہے کہ اسی زبان کی خدمت کی بدولت اُن کو اتنی عزت، شہرت اور خوش حالی نصیب ہوئی۔

مولوی صاحب کی شخصیت بڑی باوقار تھی، سر راس مسعود ہوں یا سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری ہوں یا مہاراجہ کشن پرشاد، تمام اکابر اُن کی عزت کرتے تھے!

پاکستان کے محترم صدر جناب محمد ایوب خاں (بالقابہ) نے مولوی صاحب کی جو پذیرائی فرمائی ہے اور احترام و قدر شناسی کا جو سلوک کیا ہے، اُس نے شاہانِ سلف کی علم دوستی کی یاد تازہ کر دی ہے!

اُردو مولوی صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھی، زندگی تھی، دین و ایمان تھی، اُردو کی ترقی ترویج کے لئے اُنھوں نے مستقل مزاجی کے ساتھ ساٹھ سال تک جد و جہد کی ہے، اُردو کے مشن کے علاوہ، انھوں نے کسی دوسری تحریک اور مقصد سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھا، وہ جو قاآنی نے کہا ہے:—

رسم عاشق نیست بایک دل، دو دلبر داشتن

تو مولوی عبدالحق نے "محبوبۂ اُردو" کے سوا اور کسی سے دل ہی نہیں لگایا، انھوں نے اُردو سے جو پیمانِ وفا باندھا تھا اُسے مرتے دم تک نباہا! مولوی صاحب کو اس کا شدید صدمہ تھا کہ پاکستان میں اُردو کو اس کا جائز حق بھی نہ مل سکا، اسی صدمہ کو لئے ہوتے وہ اس دنیا سے رُخصت ہو گئے!

بقیہ مضمون صفحہ ۴۰ سے آگے:—

اگر میرے ارد گرد اپنے بھائیوں کو رونے والے (بہنوں بھائیوں) کی کثرت نہ ہوتی تو میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتی (یہ دیکھ کر قدرے تسلی ہوتی ہے کہ اوروں کے بھائی بھی مرے ہیں اور وہ بھی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح پورے کر رہے ہیں)

ألا یا صخر إن ابکیت عینی　　فقد اضحکتنی زمناً طویلا

اے صخر بھائی! اگر تو نے اب میری آنکھوں کو رُلایا ہے تو (کیا ہوا۔ اس سے پہلے) ایک لمبے عرصہ تک تم مجھے ہنساتے بھی تو رہے ہو۔

دفعت بک الخطوب وانت حیٌّ　　فمن ذا یدفع الخطب الجلیلا

تم زندہ تھے تو تمہارے طفیل میں مصیبتیں اور آفتیں دور کیا کرتی تھی، افسوس اب کون بڑی مصیبت کو دور کرے گا؟

اذا قبح البکاء علی قتیل　　رایت بکاءک الحسن الجمیلا

تجھ پر رونا ہر طرح قابل صد ستائش ہے جب کہ بعض مقتولوں پر رونا اچھا نہیں لگتا

ہماری نظر میں!

ضمیمہ "اُردو نامہ سہ ماہی" کراچی
نمونۂ

لُغاتِ اُردو

مُرتبہ:- ترقی اُردو بورڈ کراچی، ضخامت ۴۶ صفحات، خوش نما جلی ٹائپ، بڑا سائز (قیمت درج نہیں) "اُردو نامہ" کا سالانہ چندہ چار روپے،
ملنے کا پتہ:- "اُردو نامہ" شاہراہ قائدین، پی، ای، سی، ایچ، سی، کراچی ۲۹

"ترقی اُردو بورڈ کراچی" اس قدر شہرت حاصل کر چکا ہے کہ اُس کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں! یہ بورڈ "لُغاتِ اُردو" کی تسوید و تدوین کا کام تقریباً تین سال سے انجام دے رہا ہے، جس کی مجلس ادارت کو مشاہیر اہلِ قلم اور زبان دانوں کا تعاون حاصل ہے، اس مجلس کے بعض ارکان باقاعدہ تنخواہ یاب بھی ہیں۔

—— مجلسِ ادارت "لُغاتِ اُردو" ——

جناب ممتاز حسن (صدر) ڈاکٹر مولوی عبدالحق - سابق مدیر اعلیٰ (اعزازی) وصدر مجلس ادارت، ڈاکٹر سید عبداللہ (رکن) ڈاکٹر عندلیب شادانی (رکن) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (رکن) محمد طاہر فاروقی (رکن) ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (رکن) جوش ملیح آبادی (رکن، مدیر لُغت و مشیر ادبی) ڈاکٹر شوکت سبزواری (رکن، مدیر لُغت) ڈاکٹر محمد شہید اللہ (رکن و مدیر لُغت) سید ہاشمی فرید آبادی (رکن سابق) قائم رضا نسیم امروہوی (نائب مدیر) شان الحق حقی (رکن و معتمد مجلس ادارت)

"لُغاتِ اُردو" کی اسی مجلس ادارت نے نمونہ کے طور پر "لُغت" کا ایک نمونہ کتابی شکل میں پیش کیا ہے جس کا پیش لفظ "ترقی اُردو بورڈ" کے لائق صدر جناب ممتاز حسن نے لکھا ہے، اس کے بعد اُن "اصول" کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، جو بورڈ نے ترتیبِ لُغت کے سلسلہ میں وضع کئے ہیں۔

"۲- لُغت چونکہ اُردو زبان کی ہے لہٰذا اس میں صرف ایسے الفاظ شامل ہونے چاہئیں، جو مستعمل ہوں یا کبھی مستعمل رہے ہیں، اجنبی اور غیر مُستند الفاظ خارج ہونگے۔"

یہ "اصول" اپنی جگہ درست ہے مگر واضعینِ لُغت کو اس قسم کے چند "اجنبی اور غیر مُستند الفاظ" مثال میں ضرور پیش کرنا چاہیے تھے۔ تاکہ اس نمونۂ لغت پر رائے دینے والوں کو اندازہ ہو جاتا کہ "مجلس ادارت لُغات" کن لفظوں کو اجنبی اور غیر مُستند سمجھتی ہے!

"۳- جو الفاظ اہل حرفت، یا اہل فن کے مخصوص گروہ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کی رسائی سے باہر ہوں، وہ خارج رکھے جائیں۔"

اس "اصول" کے سلسلہ میں بھی چند مثالیں پیش کرنا ضروری تھیں کہ فلاں قسم کے الفاظ "لُغت" میں شامل نہیں کئے گئے۔

"۱۲- تلفظ اور املا میں تغیر و تصرف کی مختصر تاریخ حسب ضرورت مع حوالہ بیان ہوگی۔"

مگر

صفحہ ۳۵ اور ۳۶ پر "اصلیت" کا جو بیان ہے اس میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ یہ لفظ "اصلیّت" بروزن "مرحمت و مسکنت" (ی - بغیر تشدید کے) بھی بولا جاتا ہے ——— اسی طرح "سیّد" "میّت" "مندر" اور "کٹھن" جیسے لفظوں کا جو اصل زبانوں (عربی اور ہندی) میں صحیح تلفظ ہے، اُس کے اظہار کے بعد، وہ تلفظ ضرور لکھنا چاہئیے جو اُردو میں عوام کی بول چال اور روزمرہ میں شامل ہے مثلاً ہندی کا صحیح تلفظ "مندر" ("د" کسرہ کے ساتھ بروزن "منزل") ہے، مگر اُردو میں اسے "مندر" ("د" پر زبر کے ساتھ، بروزن "مسکن") بولتے ہیں، اور یہی تلفظ "اردو" کا صحیح تلفظ ہے!

"اُصولِ لغت" کے بعد "علامات و اشارات" دیئے گئے ہیں مثلاً :-

——— اسم مذکر کے لئے اَمذ اسم مونث کے لئے امث اضافت کے لئے اضا ———

جگہ اور وقت کی طوالت سے بچنے کے لئے دُنیا کی ہر لُغت میں "علامات و اشارات" سے کام لیا جاتا ہے، اس خصوص میں بھی ہمیں چند گزارشیں کرنی ہیں یہ کہ "پہلوی" کو "پہلوی" ہی لکھا جاتے "پہلو" نہ لکھا جاتے! "پہلو" اُردو کا ایک معروف لفظ ہے، پڑھنے میں یہ "التباس" خواہ مخواہ کھٹک سی پیدا کرے گا۔ پھر اس طرح صرف ایک حرف "ی" کا اضافہ ہوتا ہے! اور یہ لفظ (پہلوی) زیادہ مقامات پر استعمال بھی نہ ہوگا۔

"رجوع کرو" کی علامت جو "رک" مقرر فرمائی گئی ہے، اس کی بجائے "رجوع" لکھا جائے، تو زیادہ اچھا ہے "مقابلہ کرو" کی "علامت" "قب" کی جگہ "مقا" زیادہ سہولت کا باعث رہے گی ——— جب "عربی" کے لئے "ع" اور فارسی کے لئے "ف" اور "پراکرات" کے لئے "پ" علامت مقرر کی گئی ہے، تو "لاطینی" میں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ اس کے لئے "ل" یا "لط" کی جگہ "لاط" کو علامت قرار دیا گیا ہے۔

"ابر" (صفحہ ۵، ۶) کے سلسلہ میں جو الفاظ دیئے گئے ہیں، اُن میں "ابر آذاری" اور "ابرِ بہمن" تک ملتا ہے مگر حیرت ہے کہ "ابر نیساں" جیسے معروف لفظ کا ذکر نہیں آیا۔

"اپج" (صفحہ ۸) کے معنیٰ "نہایت درجہ کا پاجی . . ." بالکل صحیح ہیں، مگر یہ معنیٰ یوں لکھے جاتے ——— "نہایت (پرلے) درجہ کا پاجی . . ." تو مفہوم کی اور زیادہ اچھی وضاحت ہو جاتی۔

صفحہ ۱۱ پر "لاپروائی" نظر آیا، اُردو میں "لاپروائی" اور "بے پروائی" دونوں بولتے ہیں مگر ان دونوں لفظوں میں، "بے پروائی" صحیح تر ہے، واضعین لغت کو "بے پروائی" لکھنا چاہئیے تھا! ہاں "ل" کی تختی میں "لاپروائی" اُردو لفظ کی حیثیت سے ضرور لکھا جائے گا۔

صفحہ ۱۳ پر "ادھر" کے معنیٰ بیان کئے گئے ہیں اس میں "اِدھر اُدھر" کیسے چھوٹ گیا ——— "میاں! دعوت میں رشتہ دار تو کوئی نہیں آیا، اِدھر اُدھر کے لوگ آکر شریک ہو گئے" ایسے موقعوں پر "اِدھر اُدھر" سے مراد ہے "غیر لوگ" ——— نتھو خیرے ——— اس میں قدرے "تحقیر" کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔

"ارتھی" ——— بانسوں کا ٹھٹر جس پر ہندو مُردے کو مرگھٹ لے جاتے ہیں" (صفحہ ۱۴) مگر ہندو اپنے مُردوں کو "ارتھی"

ؐ ہماری گزارش سے یہ اندیشہ پیدا نہ کیا جائے کہ "علمیت" اور "علویت" کو بھی لوگ "اصلیت" کی طرح بولنے لگیں گے۔ ان لفظوں کی "ی" کو بالتشدید ہی بولا جاتا ہے۔ (ماہر القادری)

ؑ "رجوع" میں "رک" کے برابر ہی جگہ صرف ہوگی (م - ق)

پہ رکھ کر صرف جلانے کے لئے مرگھٹ ہی نہیں لے جاتے، بلکہ دریا میں "ارتھی" کو بہاتے بھی ہیں! اس لفظ کی شرح یوں ہونی چاہئیے تھی

"ارتھی ——— بانسوں کا ٹھٹر جس پر ہندو مردے کو جلانے کے لئے مرگھٹ یا دریا میں بہانے کے لئے لے جاتے ہیں"

یا پھر "ہندو کا جنازہ جو بانس کے ٹھٹر پر لے جایا جاتا ہے" اسی تشریح پر اکتفا کیا جائے، اس سے "ارتھی" کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے، مرگھٹ اور دریا کا ذکر ہی نہ کیا جائے۔

"اب" کے بیان میں "اب تب" ضرور آنا چاہئیے، مریض کی آخری حالت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ——— "اس کی بیوی کا آخری وقت ہے اب تب ہو رہی ہے"۔

"اسرار" (صفحہ ۱۵) کے معنی "غیبی اُمور" دُرست نہیں، یا یوں کہئیے کہ بہت ہی کھینچ تان کر ان معنوں کو ایک حد تک اس لفظ (اسرار) کا ترجمان کہا جاسکتا ہے! اس کی سند میں "سب رس" کی عبارت اور کلیات نظیر اور ضرب کلیم سے جو شعر پیش کئے گئے ہیں، اُن سے "غیبی اُمور" کے نہیں "راز کی باتوں" اور "چھپی ہوئی چیزوں" کے معنی نکلتے ہیں۔

"... یمن کا لشکر جو ظہورِ اسلام سے کچھ پہلے خانہ کعبہ پر چڑھ آیا تھا" (صفحہ ۲۰) یہ غلط فہمی مغرب کے اہل قلم اور مستشرقین کی پھیلائی ہوئی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانی اسلام" قرار دیتے ہیں، اور حضورؐ کی بعثت کو ظہور اسلام سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم کی رُو سے پہلا انسان (آدم) جو پیدا ہوا وہ دینِ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوا، اور تمام انبیاء کرام "اسلام" ہی کے مُبلغ اور علمبردار تھے، افسوس ہے کہ اسلام کے بارے میں "مستشرقین کے اس تصور کا اثر بعض مُسلم مفکرین تک نے قبول کیا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُسی "اسلام" کو پیش فرمایا، جو ہر دور میں نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ پیش ہوتا رہا ہے، اس لئے اس عبارت میں:—

"ظہورِ اسلام" کی جگہ "آنحضرتؐ کی بعثت" لکھا جانا چاہئیے!

"اصطفا" برگزیدہ ہونا، منتخب ہونا نقائص سے پاک وصاف اور فضائل سے آراستہ ہونا (صفحہ ۲۳) نبی اور رسولؑ بے شک برگزیدہ اور معصوم ہوتا ہے مگر اصطفا کے لغوی معنیٰ "نقائص سے پاک ہونا" محلِ غور ہیں۔

صفحہ ۲۸ پر اصل اور راس المال کے معنیٰ میں "مول" لکھا ہے اُس پر اعراب کا ہونا ضروری تھا ——— اس طرح "مُول"!

"اصلاح" (۳۱-۳۲-۳۳) کے جہاں معنی بیان کئے گئے، اور حجامت بنانے کو "اصلاح سازی" کہا گیا ہے وہاں "اصلاح خانہ" بھی ضرور لکھنا چاہئیے تھا:— اس طرح:—

"اصلاح خانہ ——— نائی کی دکان" "Hair cutting saloon"

صفحہ ۳۴ پر "اصلح" کے معنی کے ساتھ اگر یہ لکھ دیا جاتا ——— "انگریزی کے Survival of the fittest کا ترجمہ اُردو میں "بقائے اصلح" کیا گیا ہے" ——— تو "اصلح" کے معنی اور زیادہ واضح ہو جاتے ——— "عرب" کی تختی میں "بقائے اصلح" کی شرح کی جاسکتی ہے مگر اس "ترکیب" میں اصل لفظ "اصلح" ہے۔

"اُصولِ دین": ——— اللہ، رسول اور قیامت پر ایمان رکھنا" (صفحہ ۳۹) "قیامت" کے بعد "وغیرہ" بڑھا دینا ضروری ہے، ورنہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ کیا "قرآن" پر ایمان رکھنا، "اُصولِ دین" میں شامل نہیں ہے! اسی قسم کے دوسرے اعتراضات بھی ہو سکتے ہیں!

"لغت" میں "عروض" کی بحروں کے نام تو لکھے ہیں مگر مثال میں "اشعار" نہیں دیئے گئے۔ "بحر" کے نام کے ساتھ، مثال میں شعر بھی ضرور درج کرنا چاہیے!

کوئی شک نہیں قدیم دکنی اردو کی کتابیں ہماری زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہیں، ہم ان تمام قدیم اہل قلم اور شاعروں کا احسان مانتے ہیں، مگر اس "لغت" میں دکنی شاعری کے جو شعر مثال میں پیش کئے گئے ہیں، ان کی زبان اتنی نامانوس ہے کہ عوام تو کیا خواص بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتے، مثلاً:-

پریاں کا جھومنا، جھوم ہے نرتے تن
کھسی ہتی سو سنگھار اور آبرہن (ص ک)

پون اب وطن میں دھر یا تھا قرار
نہ کوئی پات ہلتا، بن ہنجہار (ص ۲)

—— یا ——

ملا وجہی کی "سب رس" کی یہ عبارت:-

"اپنیاں کو اپنے کرنا، اپنا مال دریغ نا دھرنا"

"لغت" سے استفادہ کرنے والوں کو کتنی الجھن میں ڈال دے گی، ان شعروں اور عبارتوں کو سند میں پیش کرنے سے کیا فائدہ جن کے مفہوم و معنی پڑھنے والوں کے لئے "چیستاں" بنے رہیں! قدیم دکنی شعرا کے "صاف شعر" البتہ سند میں پیش کئے جا سکتے ہیں، یا وہ "لفظ" جن کی سند اردو کے دوسرے شاعروں کے یہاں نہ ملتی ہو!

حکومتِ آصفیہ میں کم و بیش ۸۰ سال اردو زبان حکومت اور دفتر کی زبان رہی ہے، دارالترجمہ اور عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، اس لئے وہاں کے اس دور کی دفتری اور علمی و فنی مانوس و قابل قبول اصطلاحات "لغتِ اردو" میں آنی چاہئیں! مثلاً:-

"مجاریہ، موصولہ، مرافعہ، وقعتِ اعذار، مراسلہ، مقدمہ، تہذیب، مثل، قابلِ پیشی رفت
صادر، میزانیہ، صدرِ میزان، جامعہ، مستجل"۔۔۔۔۔

اس قسم کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحیں "اردو لغت" میں آنے کے قابل ہیں، دکن کی عام بول چال کے بعض لفظ بھی واضعینِ لغت کے غور و توجہ کے مستحق ہیں، مثلاً لکھنؤ اور دلی میں کھانے اور پینے کے تنباکو کو "تنباکو خوردنی" اور "تنباکو نوشیدنی" بولتے ہیں مگر دکن میں "پینے کے تنباکو" کے لئے "گڑاکو" کا لفظ بولا جاتا ہے۔

واضعین لغت کی اس پر بھی نظر رہنی چاہیے کہ جن اساتذہ کے کلام اور ارباب قلم کی تحریروں سے "سند" لی جاتی ہے ان سے بھی زبان و محاورہ کی بھول چوک ہو گئی ہے، مثلاً سر سید احمد خاں جیسے زبان داں نے "ہاتھ کی ہتھیلی" اور "اٹلی کا انگریز" لکھا ہے اسی نمونۂ لغت میں صفحہ ۱۵ پر علامہ اقبال کا ایک شعر لفظ "اسرار" (نکات، باریکیاں۔۔۔) کی سند میں پیش کیا گیا ہے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخ امم جس کی ہے تفصیل

اس شعر میں "سے" غلط استعمال ہوا ہے، "کا" کہنا تھا، یوں:-

میں شعر کے اسرار کا محرم نہیں لیکن

یا تو اس شعر کو مثال میں پیش کرنا ہی نہیں چاہیے تھا اور پیش کیا تھا تو فٹ نوٹ میں اس تسامح کی طرف اشارہ کر دینا ضروری تھا!

"نوکریں، چاکریں، ماما، اصیلیں، اِدھر اُدھر ہیں" (صفحہ ۴۰)

یہ ناصر نذیر فراق دہلوی کی عبارت ہے، جس کے حوالہ میں "مضامین فراق" لکھا ہے، حالانکہ "مضامین ناصر نذیر فراق" یا "مضامین فراق دہلوی" لکھنا چاہیے تھا کہ "مضامینِ فراق" سے اردو کے مشہور شاعر اور نقاد فراق گورکھپوری کی طرف بھی خیال جا سکتا ہے

"میر کے زمانہ میں تو بے شک اردو لفظوں کی جمع" اس طرح بولی جاتی تھی:—

جہاں اب "خارزاریں" ہو گئی ہیں وہاں پہلے بہاریں ہو گئی ہیں

مگر ناصر نذیر فراق نے یہ مضمون بہت سے بہت ساٹھ ستر سال پہلے لکھا ہو گا، اُس وقت "نوکر" اور "چاکر" کا بصیغہ "مونث" دلّی میں بولا جانا بہت کچھ محلِ غور ہے! "نوکر" مذکر ہے جس کا مونث "نوکرنی" یا "نوکرانی" ہے اور جس کی جمع "نوکرنیاں" اور "نوکرانیاں" بولی جاتی ہے اور "چاکر" بھی مذکر ہے جس کی تانیث اردو زبان میں نہیں ملتی، ناصر نذیر فراق کی مذکورہ بالا عبارت سے اردو زبان سیکھنے والوں اور نوخیز نسل کو "نوکر چاکر" کی تذکیر و تانیث کے باب میں شدید غلط فہمی بلکہ انتشار سے دوچار ہونا پڑے گا! واضعینِ لغت کو سند میں اشعار اور نثر کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے، اس کی بھی احتیاط برتنی چاہیے کہ جس چیز کو وہ سند میں پیش کر رہے ہیں، اس میں تو زبان و محاورہ کا کوئی سُقم نہیں ہے۔

"صوم" کی جمع نہ عربی میں آتی ہے اور نہ اردو میں! انشاء کے اس شعر کو:—

معلّم ملک سدرہ، سرورِ مسعود کمال صدر مصلاّ، مکمل اصوام (صفحہ ۳۷)

"نمونۂ لغت" میں درج کر کے جو "اصوام" کے معنی بیان کئے گئے ہیں، تو یہ انشاء کا "شاعرانہ تصرف" ہے جو نہ روزمرہ بن سکا ہے، نہ محاورہ، اور عوام ہی نہیں خواص نے بھی اسے قبول نہیں کیا، ضرورتِ شعری کے لئے انشاء نے "صوم" کی جمع اپنی طبیعت سے گھڑ لی ہے! شعرا اور نثر نگار، چاہے وہ کتنے ہی بڑے درجہ کے کیوں نہ ہوں، اگر ان کے "تصرفات" میں کوئی حُسن نہ پایا جائے اور خلافِ اصول بھی ہوں، تو اُن کو نظر انداز کر دینا چاہیے ——— "اصوام" وجدان کو کتنا ناگوار گزرتا ہے۔

لغت مُرتب کرنے والوں کی زبان دانی اور لغت دانی کی استعداد و قابلیت اور ژرف نگاہی اُن لفظوں کی تشریح سے ظاہر ہوتی ہے، جو الفاظ کسی "کیفیت" کے حامل ہوتے ہیں، مثلاً اس "نمونۂ لغت" میں ہم نے "انگڑائی" کو تلاش کیا، مگر یہ لفظ نہیں ملا! لفظ "انگڑائی" اس نمونہ لغت میں ہونا چاہیے تھا!

بہرحال "مجلس ادارت لغات اردو" کو "رمسانا، کسمسانا، انگڑائی، جھرجھری، پھریری، ہچکی" جیسے الفاظ کی تشریح میں بڑی دقّتِ نظر سے کام لینا پڑے گا!

واضعینِ لغت پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ آج کل کے نئے لکھنے والے زبان و محاورہ کی جو سامنے کی غلطیاں کرتے ہیں، اُن کی وہ "لغت" میں تصریح و تصحیح فرما دیں، مثلاً:— "اٹنا" اور "پٹنا" میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، ہم نے کتنی جگہ اس طرح لکھا ہوا دیکھا ہے:—

"کتابوں سے میز "اَٹ گئی"

اور انگریزی کے "NOR" کا اردو میں ترجمہ "نہ ہی" جو چل پڑا ہے ——— اگر واضعینِ لغت کا ذوق اور وجدان "نہ ہی"

میں ناگواری محسوس کرتا ہو، تو اس کی تصحیح بھی کر دینی چاہیئے!

تمبا کو یا تمباکو، توتا یا طوطا، تیار یا طیارہ اُس یا اوس، پہنچنا یا پہونچنا، ہاتھ یا ہات، پاؤں یا پانو، پتہ یا پتا (ADDRESS) بُرقع یا بُرقعہ، دھکیلنا یا ڈھکیلنا، سوچنا یا سونچنا، ٹھرا یا ٹھیرا، تماشہ یا تماشا، گڑھنا یا گھڑنا...... اس قبیل کے الفاظ کا واضعین لغت کو اپنے اجتہاد سے کوئی "ایک املا" متعین کرنا ہوگا اور جس لفظ کے دونوں طرح لکھنے اور بولنے کی ضرورت محسوس کی جائے، تو اُس کے بھی وجوہ ظاہر دینے چاہئیں! اُردو میں رسم الخط کی یکسانی کا مسئلہ علماء لغت ہی کے طے کرنے کا ہے!

اسی طرح

وجہ کی جمع "وجوہ" تصنیف کی جمع "تصانیف" ایجاد کی جمع "ایجادات" اسی قبیل کی "جمع" کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ اُن کو مونث بولا جائے یا مذکر!

جن مصنفین اور شاعروں کے کلام اور تحریر سے "لغات اُردو" میں سند لی جائے گی، اُن میں جناب جوش ملیح آبادی کا نام بھی نظر آیا، جوش صاحب کے کلام سے سند لی جا سکتی ہے مگر ہمیں اس ضمن میں اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ حضرت امیر مینائی جو بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ زباں داں تھے، اُستاذ الاساتذہ تھے، عربی اور فارسی کے عالم اور بھاشا کے جاننے والے تھے جن کا کلام "سند عالی" اور "سند صحیح" کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے اپنی وضع کردہ "لغت" میں اپنا کوئی ایک شعر بھی سند و مثال میں پیش نہیں کیا ——— یہ بات اس لئے کہی گئی ہے کہ جوش صاحب اس ادارہ "لغت" کے رُکن ہی نہیں "مُدیر" اور "مشیر ادبی" بھی ہیں۔

"نمونۂ لغات اُردو" میں صدر یا سکریٹری کو کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کام کی تفصیل ضرور پیش کرنی تھی، ورنہ تین سال کی مُدت میں چھ لاکھ روپیہ کے مصارف سے ۴۶ صفحات کا "نمونۂ لغات" مُرتب ہونا، بہت کچھ عجیب لگتا ہے اور وسوسوں کو اپنی ہی تنگ نظری اور کمزوری کا سبب ٹھیرا کر حسن ظن اور اچھی توقعات کے لئے زمین ہموار کرنی پڑتی ہے۔

"نمونۂ لغات اُردو" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو زبان میں "لغت" کی یہ سب سے زیادہ جامع اور کارآمد کتاب ہوگی، یہ "لغت"[1] جدید انداز پر مُرتب کی گئی ہے، واضعین لغت نے بڑی کاوش و تحقیق سے کام لیا ہے، خاص طور سے لفظ کے مادہ اور مصدر کی تحقیق، عالمانہ تحقیق ہے الفاظ کے معنیٰ بڑے سلیس اور آسان لفظوں میں بیان کئے گئے ہیں! مجلس ادارت لغات اُردو کے ارکان اُردو دُنیا کی طرف سے تبریک و تحسین کے مُستحق ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی مدد فرمائے کہ وہ اپنی بلند تمناؤں وسیع حوصلہ اور مجوزہ اسکیم کے مطابق "لغات اُردو" کے عظیم الشان کارنامہ کو سرانجام پہونچا کر، تدوین لغت کے میدان میں بھی اُردو زبان کو دوسری زبانوں کا ہمسر و عناں اور ہم پایہ بنا دیں (آمین)

[1] میں "لغت" کو مونث بولتا ہوں (م۔ق)

ماہر
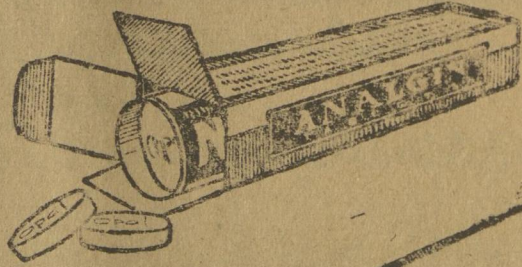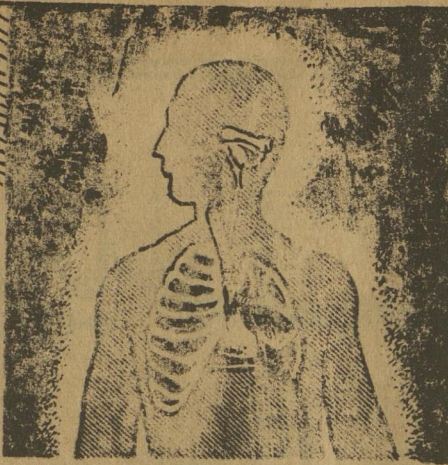
کیا آپ جانتے ہیں کہ؟

ہمارے پھیپھڑے ایک اوسط مدتِ عمر میں قریباً پچاس کروڑ مرتبہ پھیلتے اور سکڑتے ہیں۔

- ہماری آنکھوں میں ایسی جراثیم کش رطوبت ہے جو ناک اور حلق میں پہنچکر ان لاتعداد جراثیم کو فنا کر دیتی ہے جو ہر سانس کے ساتھ ہمارے نظامِ تنفس میں داخل ہوتے ہیں۔
- ہماری سانس لینے والی نالیوں میں لاکھوں چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے ایک لیسدار رطوبت خارج ہوتی ہے جو سانس کے ساتھ جانیوالی گرد کے مہلک ذرات کو جذب کر لیتی ہے ورنہ یہ ذرات چند لمحوں میں سانس کی نالیوں کو بند کر کے ہماری ہلاکت کا باعث بن جائیں۔
- ہماری سانس کی نالیوں میں خوردبینی بالوں سے مرتب ایک نہایت جامع نظامِ صفائی موجود ہے جو فی سکنڈ بارہ مرتبہ جاروب کشی کر کے ان خطرناک ذرات کو نظامِ ہضم میں پہنچا دیتا ہے جہاں اُنکے مہلک اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔
- سانس کی نالیاں پھیپھڑوں کی ۵۰ کروڑ تھیلیوں کو جراثیم اور مٹی سے پاک ہوا پہنچاتی ہیں جسکی وجہ سے استعمال شدہ خون کی کاربن ڈائی اکسائڈ حیات بخش آکسیجن میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

نزلہ، زکام کی حالت میں ہوائی نالیاں بند ہونے لگتی ہیں اور سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ سعالین کا استعمال سانس کی نالیوں کو صاف کر کے بلغم کو خارج کرتا ہے اور ہمارے پیچیدہ نظامِ تنفس کو تقویت دیکر نزلہ، زکام اور کھانسی سے نجات دلاتا ہے۔

سعالین

نزلہ، زکام اور کھانسی کے لئے

ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز پاکستان

کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چٹاگانگ

UNITED

HSU-12/554

آدم جی کاٹن ملز لانڈھی کراچی

کے-ٹو
سب سے
بلند و بالا
سگریٹ
K2
CIGARETTES
کے-ٹو بھی
یہ سگریٹوں میں سر بلند شمار ہوتے ہیں
پریمیر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ-کراچی

ماہر القادری

نیا
تبت
پنک
ٹوتھ پیسٹ
اس میں جراثیم کش ہائیڈیمیکس شامل ہے
TIBET
PINK TOOTHPASTE
with quick-acting HYDEMAX
KOHINOOR CHEM
TIBET
PINK TOOTHPASTE
... جو دانتوں کی حفاظت کیلئے ضروری ہے۔
تبت پنک ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے اب آپ
دانتوں کی خرابی اور مسوڑھوں کی تکلیف سے محفوظ
رہیں گے۔ اس میں زوداثر ہائیڈیمیکس شامل ہے
جو جراثیم ختم کرکے دانتوں کو صاف اور صحت مند رکھتا ہے اور
منہ میں ایک خوشگوار مہک پیدا کر دیتا ہے۔
یہ نیا ٹوتھ پیسٹ آج ہی استعمال کرکے دیکھئے!
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ — کراچی۔ ڈھاکہ
آرائشِ جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے
united
TPP 69/733

جلد ۱۳

فاران کراچی

شمارہ ۸

ایڈیٹر:- ماہر القادری

نومبر ۱۹۶۱ء

ترتیب

چندہ سالانہ
چھ روپے

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

قیمت فی پرچہ
۵۰ پیسے (۸)

پرنٹر و پبلشر:- مسرور حسین

مطبوعہ: مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقش اول

اس واقعہ کا اظہار تحدیثِ نعمت کے طور پر کیا جا رہا ہے کہ "فاران" کے بعض اداریئے (نقش اول) دینی اداروں اور اشاعتی مرکزوں نے کتابی صورت میں افادۂ عام کے لئے چھپ لئے ہیں، اور ان کتابچوں کے خاطر خواہ اچھے نتائج ظہور میں آئے ہیں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کا فضل اور محض اُس کا کرم ہے کہ مجھ جیسے بے علم اور بے عمل کی تحریروں کو قبول و اثر کی استعداد اور خدمتِ دین کی توفیق میسر آئی ہے، اللہ تعالیٰ چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا انسانوں کے اندازوں اور ظن و تخمین کے علی الرغم اللہ تعالیٰ گھانس کے تنکے میں اتنی قوت پیدا کر سکتا ہے کہ وہ طوفان کا رُخ موڑ دے اور خاک کے ایک حقیر ذرے کی چمک سے پورا ماحول جگمگا اٹھے، اللہ تعالیٰ فریبِ نفس سے محفوظ رکھے کہ ایسے موقعوں پر انسان اللہ تعالیٰ کے فضل کو اپنا "ذاتی کارنامہ" سمجھنے لگے ——— تو یہ غلط فہمی اجر و ثواب، تو ایک طرف رہا، الٹی وبال کا سبب بن جاتی ہے اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے! ہم اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا عجزِ بندگی، اپنی درماندگی، اور قلتِ نفس، پیش کرتے ہوئے، اُس کی بارگاہ سے حرکتِ عمل اور اس کے ساتھ ہی اخلاصِ عمل کی بھیک مانگتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں۔

پاکستان میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ "انکارِ حدیث" کا فتنہ ہے، جو نمایاں طور پر اُبھر رہا ہے، ہم نے اب سے دس سال قبل "فاران" میں اس فتنہ کی نشاندہی کی تھی، اُس وقت اس "شجرِ خبیث" کی روئیدگی کا آغاز تھا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ پودا جھکڑ پکڑ گیا اور اب اس میں شاخیں پھوٹنے لگی ہیں! اپنے نتائج کے اعتبار سے "انکارِ سُنّت" کا یہ فتنہ قادیانیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے! یہ فتنہ "قرآن" کا نام لے کر خود قرآنِ کریم کے خلاف مجوسی سازش ہے، اس فتنہ کے "علم کلام" نے قرآنِ کریم کی معروف اصطلاحوں تک کو مسخ کر کے رکھ دیا، یہاں تک کہ "اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت" کے مفہوم و تصور اور عقیدہ و یقین کو اُلٹ دیا ہے، علامہ اقبال نے جس "حیلہ پرویزی" کی طرف اشارہ کیا تھا، یہ فتنہ اُسی حیلہ پرویزی اور فلسفۂ مزدکیت کا مبلغ و ترجمان ہے!

تحریک "باطنیت" کے داعی کوئی شک نہیں ضلالت و بے دینی کے مبلغ تھے، مگر ان کمبختوں کے پاس ظاہری علوم تو تھے لیکن اس دور کا "فتنۂ انکارِ حدیث" ان متداول علوم سے بھی یکسر محروم ہے، سرتاپا "جہل مرکب" جسے افسانوی اندازِ بیان نے خوش نما بنا دیا ہے۔

اس فتنہ میں اُن لوگوں کے لئے بے شک کشش ہے، اور خاصی پُر زور کشش بلکہ "کہربائیت" ہے، جو صوم و صلوٰۃ اور دین کے دوسرے فرائض و واجبات کو پس پُشت ڈال کر اور دین کی اخلاقی قدروں کو ٹھکرا کر "مومنِ صالح" بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، یہ دعویٰ یقیناً کھلا ہوا مضحکہ ہے مگر "فتنۂ انکارِ سُنّت" کے علم کلام میں "صالحیت" کے معنیٰ کچھ اور ہیں، وہاں صالحیت اور تقویٰ کی بنیاد اخلاق پر نہیں، نظامِ معیشت پر ہے، اُس معیشت پر جس کا "پیغمبر" (؟) کمیونسٹ کارل مارکس کو سمجھتے ہیں!

فتنۂ انکارِ حدیث کمیونزم اور مغرب کی مادی قدروں کو بہ یک وقت غذا پہونچاتا ہے، اس کی اسکیم ہی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے "اُسوۂ حسنہ" کو (خاک بدہن گستاخ) مشتبہ اور بے اعتبار ٹھیرا دیا جائے تاکہ تقویٰ اور صالحیت کا دینی معیار اور انسانیت
کے لئے زندگی کا نمونہ ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے!

"فتنۂ انکارِ حدیث" نے اللہ اور رسول ؐ کے مقابلہ میں "مرکزِ ملت" کا منصب ایجاد کر کے، ضلالت کو اس کی آخری حد تک پہونچا دیا
اس ٹولی (بزمِ طلوعِ اسلام) کے سرغنہ اور اس گمراہی کے داعی نے "مرکزِ ملت" کے پردے میں بڑی گہری چال چلی ہے وہ
یہ کہ اس طرح یہ فتنہ احتساب کے اندیشہ سے مطمئن اور بے فکر ہو کر اپنا کام کرتا ہے!

اس فتنہ کا مثبت جواب اور ایجابی تردید یہ ہے کہ ہم مسلمان سُنّتِ رسول ؐ کو بنیادی عقیدے کے طور پر جو دین میں حُجّت سمجھتے
ہیں، تو یہ عقیدہ ہماری زندگیوں میں بھی عملی طور پر جھلکنے لگے اور قال پوری طرح حال بن جائے! سُنّتِ رسول ؐ قرآن کی عملی تشریح ہے
اس تشریح سے بے نیاز ہو کر نہ تو قرآن سمجھ میں آسکتا ہے، اور نہ قرآنی احکام کی تعمیل ہو سکتی ہے! جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
رسالت سے انکار کے بعد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کوئی وزن نہیں رکھتا، اسی طرح سُنّتِ رسول ؐ کو نظر انداز کر کے، قرآن کریم کو نہ صحیح
طور پر سمجھا جا سکتا ہے، اور نہ اُس کے احکام پر خاطر خواہ عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے سُنّتِ رسول ؐ سے گریز، خود قرآن سے گریز ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار، قرآنِ کریم کی کھلی ہوئی تکذیب ہے (معاذ اللہ) اور اس تکذیب کے بعد قرآن
سے ہدایت و سعادت کی بجائے ضلالت کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے بارے میں جمہور اُمت نے کبھی اختلاف کیا ہو، حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کی اطاعت تو منصوص ہے، اس میں سرے سے اختلاف اور چُنیں چُناں کی گنجائش ہی نہیں ہے، قرآنِ کریم بار بار رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، حضور ؐ کے اُسوۂ حسنہ کو انسانیت کے لئے معیار ٹھیراتا ہے اور دو ٹوک لفظوں میں کہتا ہے کہ
یہ نبی قرآنِ کریم کی محض تلاوت ہی نہیں کرتے، یہ کتاب و حکمت کے معلم بھی ہیں اور انسانوں کا تزکیہ نفس بھی فرماتے ہیں ——
تو اللہ تعالیٰ کے تفویض کئے ہوئے منصب کی بنا پر حضور ؐ نے جو کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور صحابہ کرام ؓ کے نفوس کا تزکیہ کیا، یہی
"سُنّتِ نبوی" کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ دین میں حُجّت ہے، یہی صراطِ مستقیم ہے، راہِ نجات ہے، منزلِ ہدایت اور جادۂ خیر و فلاح
ہے، جو کوئی سُنّتِ نبوی ؐ کا انکار کرتا ہے، وہ نجات و ہدایت سے منہ موڑ کر اور خیر و صداقت سے منحرف ہو کر، ضلالت کی طرف
اُمت کو بلاتا ہے!

فتنۂ انکارِ حدیث کی اس ضلالت کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں "قرآنِ کریم" کے مفہوم و معنی کی تحریف
ہو رہی ہے، فتنۂ باطنیت کے دورِ عروج میں بھی قرآنِ کریم اس قدر مظلوم نہیں رہا، جیسا اب ہے! ایک شخص کے ہاتھ میں قلم ہے
اور اس کی تحریروں کی اشاعت کے اسباب و ذرائع میسر ہیں، قانونی طور پر اس کی کوئی روک ٹوک نہیں، چند بے دین لوگ اس کے
ارد گرد جمع ہو گئے ہیں ——— بس پھر کیا ہے قلم کی افسانوی شوخی اور ہوائے نفس قرآن کے مفہوم و معنی کے ساتھ بیک وقت
مذاق بھی کر رہی ہے اور ظلم بھی! (سنت نبوی کے دشمنوں کے لئے گرم سے گرم لہجہ بھی نرم ہی ہے)

منصب نبوت نمبر

اس فتنہ کی تردید میں بعض اچھی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور دینی رسالوں میں مضامین بھی آتے
رہتے ہیں، جن کے اچھے نتائج ظہور میں آئے ہیں ——— مگر اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی
جا رہی تھی کہ اس ٹولی کی پھیلائی ہوئی قریب قریب تمام غلط فہمیوں کو علمی انداز میں واضح کیا جائے، اور عقل و نقل اور درایت و
روایت کی دلیلوں کے ساتھ اس فتنہ کو پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے!

اللہ تعالیٰ کے فضل سے مشہور و مقبول ماہنامہ "ترجمان القرآن" (اچھرہ لاہور) کے معرکۃ آرا "منصب نبوت نمبر" نے اس ضرورت کو پورا کر دیا، ترجمان القرآن کا یہ "شمارۂ خاص" فتنۂ انکارِ سُنّت کے لئے "ضربِ کلیم" بن کر نمودار ہوا ہے!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اسلامی دُنیا کے عظیم مُفکّر ہیں، اُن کا قلم سالہا سال سے ہر محاذ پر دین کی مدافعت کر رہا ہے اور صرف مدافعت ہی نہیں اُن کے قلم نے باطل کی فصیلوں میں رخنے بھی ڈال دیئے ہیں۔ مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے اصابتِ فکر و نظر کے ساتھ بیان و اظہار کی خوبیاں بھی عطا فرمائی ہیں، اُنکا اندازِ تحریر بڑا ہی دلنشین اور اثر انگیز ہوتا ہے اُن کی تحریروں میں بڑی جاذبیت اور غضب کی روانی و سادگی پائی جاتی ہے!

"منصب نبوت نمبر" کے آغاز میں فتنۂ انکارِ سُنّت کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور چند صفحوں میں اس فتنہ کی تاریخ کا ست نکال کر رکھدیا ہے، یہ چند صفحے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت قیمتی ہیں، ذہن میں کبھی نہ ہو تو منصب نبوت نمبر کا یہ ابتدائی حصہ فتنۂ انکارِ حدیث کے بارے میں دل و دماغ کو مطمئن کر دیتا ہے کہ یہاں حق سے انحراف اور ضلالت کے سوا اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی، یہ تحریک آغاز ہی سے گمراہی کی بنیاد پر اٹھی ہے! اور ہمارے دور میں ایک جاہل کے قلم نے تو اس ضلالت کو انتہا تک پہونچا دیا ہے!

ایک ڈاکٹر صاحب جو بدقسمتی سے فتنۂ انکارِ حدیث میں مُبتلا ہیں، انھوں نے احادیث نبوی ؐ کے بارے میں جو اپنے شبہات، مغالطے اور اعتراضات پلش کئے ہیں، اُنکے جوابات منصب نبوت نمبر" میں جن دلیلوں کے ساتھ دیئے گئے ہیں، وہ پڑھنے کے لائق ہیں! اس مراسلت کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ منکرین سُنّت کا دین کے بارے میں سوچنے کا انداز کیا ہے؟ اُنکے ذہن و فکر کی کجی کتنی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہے! اُن کا دینی مطالعہ کس قدر ناقص اور سطحی ہے؟ اس گروہ کا درصل مشن کیا ہے؟ یہ اُمّت کو کس راستے پر لے جانا چاہتے ہیں؟

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی دینی غیرت، "منصب نبوت نمبر" میں پوری طرح بیدار اور فعال نظر آتی ہے، انھوں نے بعض مقامات پر اتنی سخت پکڑ کی ہے اور اس فتنہ کو اس قوت کے ساتھ جھنجوڑا ہے کہ اس مُزدکی صنم کدے کی بنیادیں تک ہل گئی ہیں۔

مولانا مودودی کا قلم زمانہ دراز سے حق کی حمایت اور باطل کی تردید کرتے کرتے اس فن میں چابکدست اور مشاق ہو گیا ہے، مخالف کی دلیلوں کو مولانا موصوف اس قوت کے ساتھ توڑتے ہیں کہ ان دلیلوں کی ساری جان نکل جاتی ہے! "منصب نبوت نمبر" میں مولانا موصوف اُس مجاہد کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، جس کو فتح و کامیابی کی پہلے سے بشارت مل گئی ہو، فتنۂ انکارِ حدیث کے لئے انھوں نے گریز کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑا، اُسے ہر موڑ پر اعترافِ شکست ہی کرنا پڑا ہے، اب یہی ہٹ دھرمی، کٹ حُجتی اور بے ضمیری تو اسے وحیِ الٰہی بھی مطمئن نہیں کر سکتی۔

ترجمان القرآن کا "منصب نبوت نمبر" اس کا مُستحق ہے کہ اُسے مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے، دینی رسالے اور اخبارات اس کے اقتباسات اپنے یہاں چھاپیں، اس کے مضامین یکجا یا علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوں خاص طور سے ہائی کورٹ کے جج صاحب کے فیصلہ پر مولانا نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے اس کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہیئے تاکہ ہمارے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن صاف ہو سکیں!

ترجمان القرآن کا "منصب نبوت نمبر" فتنۂ انکارِ سُنّت کے خس و خاشاک کے لئے برقِ باطل سوز بن کر منظرِ عام پر آیا ہے، اس کے مطالعہ سے لاکھوں پڑھنے والوں کے ذہن صاف ہوں گے اور سُنّتِ رسول ؐ دینی حجت بن کر ایمانوں کی تازگی اور استقامت کا سبب بنے گی ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

"منصب نبوت نمبر" اسی شرارِ بولہبی سے چراغِ مصطفوی ؐ کے ستیزہ کار اور نبرد آزما ہوا ہے۔ اور "چراغِ مصطفوی" ہی کو فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے

۲۶ ستمبر سنہ ۶۱ء   ماہر القادری

مولانا ظفر احمد عثمانی

اسلام میں
عورت کا عائلی مقام

"عورت کا عائلی مقام" ــــــــ اس نام کی ایک کتاب ــــ "فاران" میں تبصرے کے لئے بھیجی گئی ہے، یہ کتاب خاتون اکیڈمی، بہار کالونی، جمشید روڈ کراچی نے شائع کی ہے جس پر "محترمہ ممتاز جہاں بیگم صدیقی" کا نام مصنف کی حیثیت سے درج ہے!

اس کتاب کا "تعارف" جناب سید وحید قیصر ندوی نے لکھا ہے جس میں ممتاز جہاں بیگم کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"ممتاز جہاں بیگم قدیم طرز کی خالص معاشرتی پردہ نشین خاتون ہیں، دینی علوم و فنون پر ان کو بڑی اچھی دسترس ہے اور ساتھ ہی لکھنے کا بھی عمدہ سلیقہ ہے، آپ کا تعلق میرٹھ ڈویژن کے ایک بلند مرتبت گھرانے سے ہے، جس سے مجھے ذاتی تعارف حاصل رہا ہے، یہ گھرانا علمی اور مادی دونوں اعتبارات سے بڑا ہی نامور ہے ۔۔۔۔۔!

"ممتاز جہاں کے والد گھر داماد ہو کر خسر کے ہاں ہی رہے، مگر یہ گاڑی زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی اور ان کی والد کی زندگی عائلی اعتبار سے قطعی ناکام ہو گئی، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں اُن کے والد کی کسی بے جا روش کو دخل تھا یا گھر دامادی کے اس غلط ماحول کا یہ فطری نتیجہ تھا۔ تاہم ممتاز جہاں کو میں نے ہمیشہ اپنے باپ کا شاکی پایا۔ اس طرح قدرت نے انہیں عائلی مسائل پر غور و فکر کرنے اور اس کی پیچیدگیوں کا حل سوچنے کے از خود ہی کافی مواقع بہم پہونچا دیئے"۔

"۔۔۔ زندگی کے ان تجربات نے عائلی مسائل اور وراثت کے معاملات پر گہرے غور و فکر کے مواقع مہیا کئے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی تصنیف میں ان حالات کا بڑی حد تک حصہ ہے، ورنہ یقیناً موصوفہ اتنی بلند پایہ کتاب پیش نہ فرما سکتیں ۔۔۔"

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد وحید قیصر ندوی صاحب کو ہم نے "محترمہ ممتاز جہاں بیگم صدیقی" کا پتہ معلوم کرنے کے لئے خط لکھا، مگر وہاں سے جواب نہیں آیا، دو ہفتہ کے انتظار کے بعد یاد دہانی کی گئی، قیصر صاحب کو لکھا گیا کہ آپ آخر کتاب کی مُصنفہ کا پتہ بتانے سے گریز کیوں کر رہے ہیں، یہ آپ کی کیا روش ہے؟؟ ہمارے اس دوسرے خط کے جواب میں صاحب موصوف نے لکھا :۔

"ماہر بھائی! تسلیم و نیاز! ــــــــ

آپ کے دو خط آئے، مگر میں یہاں تھا ہی نہیں کہ وقت پر آپ کو جواب دیتا، جواب میں غیر معمولی تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں، جن محترمہ کا آپ نے

پتہ پوچھا ہے، اُن کا اصرار ہے کہ میں کسی کو اُن کا پتہ نہ بتاؤں، اس لئے افسوس ہے کہ میں اُن محترمہ کا پتہ بتلانے سے قاصر ہوں ؎

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

"فاران" پابندی سے مل رہا ہے، جس کے لئے شکر گزار ہوں، اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا — فقط والسلام

اخلاص مند

وحید قیصر ندوی — یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء

ایک خاتون تقریباً ڈھائی سو صفحہ کی کتاب لکھتی ہیں، جسے منظرِ عام پر لایا جاتا ہے، اور اُن کا اور اُن کے خاندان کا زور و شور سے تعارف کرایا جاتا ہے، مگر خود تعارف نگار (نام نہاد) مصنفہ کا پتہ بتانے سے گریز فرماتے ہیں، اور اس "اخفا" کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مصنفہ کا اصرار ہے کہ میں کسی کو اُن کا پتہ نہ بتاؤں!

یہ کیا معمہ ہے؟ یہ کیسی "پُراسرار تصنیف" ہے؟ یہ کس بات کی "پردہ داری" ہے؟ اس کتاب کے صفحہ ۲۱۵ پر یہ عبارت نظر آئی:—

"میں اس وقت اس موضوع پر نہ تو باقاعدہ ریسرچ کر سکی ہوں"۔

دراصل کتاب میں "کر سکا ہوں" چھپا ہے، "کر سکی ہوں" قلم سے بنایا گیا ہے، اس کتاب میں کتابت کی متعدد غلطیاں ہیں، آخر اسی سہوِ کتابت (کر سکا ہوں) کی تصحیح کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی! ؎ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں!

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ کتاب کسی خاتون کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اسے ایک ڈاڑھی مونچھوں والے "مرد" نے لکھا ہے، جو فتنۂ انکارِ حدیث کی ضلالت میں مبتلا ہے! یہی "فراڈ" اس کتاب کی بنیاد ہے، اور اس بنیاد پر جو عمارت اٹھائی گئی ہے، اُسے "دھوکہ کی ٹٹی" ہی ہونا چاہیے!

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج!

اس کتاب (عورت کا عائلی مقام) پر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے جو عالمانہ تبصرہ فرمایا ہے، اُس کے لئے ہم صاحب موصوف کے شکر گزار ہیں، اللہ تعالیٰ اس حق گوئی کا دارین میں اُنہیں اجر عطا فرمائے گا! یہ تبصرہ مفصّل ہے، مدلّل ہے، اور عام فہم ہے، اس تبصرہ کے کسی جزء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر مجموعی طور پر یہ مقالہ کتاب و سنّت کا آئینہ دار اور ائمہ فقہ کے اصول کا ترجمان ہے، اس میں کتاب اللہ کے علاوہ حدیث و فقہ کے روح و مزاج اور دین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، یہ مقالہ اس کتاب پر ایک سنجیدہ، عالمانہ اور محققانہ تبصرہ ہے جس میں خشیتِ الٰہی اور دین کی خیر خواہی اور اُمت کی فلاح و بہبود کا جذبہ کار فرما ہے۔

(م - ق)

خاتون اکیڈمی کراچی نے ممتاز جہاں بیگم صدیقی کے نام سے ایک کتابچہ "عورت کا عائلی مقام" شائع کیا ہے جس کا تعارف سید

وحید قیصر ندوی کے قلم سے ہے جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ "اس موضوع پر جتنی کتابیں اب تک میری نظر سے گزری ہیں ان سب سے بہترین کتاب ہے" ان کے علاوہ دوسرے ایسے لوگ بھی جنھوں نے کتاب و سنت و فقہ کو باقاعدہ پڑھا پڑھایا نہیں اس کتابچہ سے مغالطہ میں پڑ گئے ہیں اس لئے اس کا جواب دینا ناگزیر ہوا بالخصوص اس لئے بھی کہ اس کتابچہ کے صفحہ ۴۴ پر میرا نام لیکر مجھے اس طرف ...

قیصر صاحب نے ممتاز جہاں بیگم صدیقی کا تعارف ایسا واشگاف کیا ہے جس سے میرٹھ ڈویژن کے رہنے والوں پر حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ یہ کتابچہ کسی عورت کے قلم کا شاہکار نہیں بلکہ کوئی مستور ہے اس پردہ زنگاری میں! اس کتابچہ کے دیکھنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس کا لکھنے والا محض اس وجہ سے کہ اس کی بیوی ایک ایسے رئیس کی نواسی تھی جس کی صلبی اولاد زندہ نہ تھی صرف بھائی بھتیجے حیات تھے جن کے سامنے شرعاً نواسیوں کو میراث نہیں مل سکتی تھی عائلی کمیشن رپورٹ کی حمایت پر کمر بستہ ہو گیا کہ اس میں پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کو صلبی اولاد اور عصبات کی موجودگی میں وارث مان لیا گیا ہے اگرچہ اس کو اس حمایت کی ضرورت باقی نہ رہی تھی کیوں کہ رئیس نانا نے خیر خواہوں کے مشورہ سے نواسیوں کے نام اپنی جائداد وقف کر دی تھی اور اس طرح نواسیوں کو اس سے کہیں زیادہ مل گیا جو عائلی کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر ملتا مگر شاید اس کو اپنے آئندہ ہونیوالے نواسے نواسیوں کا فکر دامن گیر ہوا ہو گا جس نے اس کمیشن رپورٹ کی حمایت پر آمادہ کر دیا لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف اور اصول شریعت کا احترام ہوتا تو اس "تجدد" کی پیروی اور حمایت کی بجائے وہ اپنے نواسے اور نواسیوں کے لئے وہی کر دیتا جو بیوی کے نانا نے کیا تھا کہ اپنی کُل جائداد اور مکانات بیٹی کے اور اس کی اولاد در اولاد کے نام وقف کر دیتا تو بھائی بھتیجے وارث نہ ہوتے مگر آج کل رونا تو اس بات کا ہے کہ دلوں سے خوف خدا جاتا رہا قانون شریعت کا احترام بھی قلوب میں نہ رہا ہر شخص دین کے معاملہ میں عقلی تیر تکے چلانے کو تیار ہے۔ چاہے قرآن صحیح طریقے سے پڑھنا بھی نہ آتا ہو سمجھنا تو درکنار۔ اس تمہید کے بعد اول چند مقدمات کا بطور اصول موضوعہ بیان کر دینا ضروری ہوا انہی کو اس کتابچہ میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور جو شخص اصول ہی کو ٹھکرا دے اس سے فروعات میں الجھنا بیکار ہے۔ امید ہے کہ ان اصول ہی سے اس پوری کتاب کا لغو ہونا ناظرین پر واضح ہو جائے گا۔

مقدمہ اولیٰ دلائل شرعیہ جن سے احکام معلوم کئے جاتے ہیں چار ہیں۔ (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہؐ (۳) اجماع (۴) قیاس۔ کتابُ اللہ سے مراد قرآن کریم ہے جو نقل متواتر سے مصاحف اور سینوں میں محفوظ چلا آ رہا ہے، سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اقوال و احوال و افعال مراد ہیں جو سند صحیح یا حسن سے ائمہ حدیث کی کتابوں میں مدون و محفوظ ہیں جن کی صحت یا حُسن کے بارے میں حضرات مجتہدین اور محدثین ہی کا فیصلہ مانا جائے گا۔

اجماع سے مراد مجتہدین کا اجماع ہے۔ سب سے زیادہ قوی صحابہ کا ان کے بعد تابعین کا اور تبع تابعین وغیرہم کا اجماع ہے اور جب کسی مسئلہ میں سلف سے چند اقوال منقول ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سلف کا اس پر اجماع ہے کہ ان اقوال سے باہر جانا باطل ہے اس کو اجماع مرکب کہا جاتا ہے۔

(تنبیہ) بعض معتزلہ وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اجماع کا ثبوت دشوار ہے کیونکہ ایک لاکھ صحابہ سے کسی مسئلہ کا منقول ہونا آسان نہیں۔ انھوں نے یہ سمجھا ہو کہ سارے صحابہ مجتہد تھے حتیٰ کہ ماعز اسلمیؓ اور غامدیہ کو بھی مجتہدین میں شمار کر لیا گیا جو حدِ زنا میں رجم کئے گئے تھے اور جس صحابی سے بھی ایک دو حدیث یا ایک دو مسئلے منقول ہو گئے اسے بھی مجتہد مان لیا گیا۔ اس بات کا لغو ہونا ظاہر ہے علامہ

ؒ اگرچہ پوری املاک کو اس طرح تقسیم کر کے اصلی وارثوں کو محروم کر دینا بھی گناہ ہے مگر قانون کی شرعی مخالفت اس سے اشد گناہ ہے، اور اگر صرف ایک تہائی تک نواسے نواسیوں کو دے دیتا تو وہ شرعاً جائز بلکہ موجب اجر ہوتا۔ (فاران)

ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور علامہ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین میں تصریح کی ہے کہ مجتہدین اور فقہا صحابہ کا عدد بیس سے زیادہ نہیں تھا جن میں خلفاء اربعہ اور عبداللہ بن مسعود ۔عبداللہ بن عمر ۔عبداللہ بن عباس ۔ زید بن ثابت ۔ معاذ بن جبل ۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت انس و ابوہریرہ رضی اللہ عنہم زیادہ مشہور ہیں ان کے سوا چند اور بھی ہیں ۔ باقی صحابہ مجتہد و فقیہ نہ تھے وہ ان حضرات ہی کی طرف رجوع کرتے اور ان سے ہی فتویٰ لیتے تھے تابعین میں بھی مجتہدین کی تعداد زیادہ نہ تھی اسی طرح تبع تابعین میں ، اور انکے بعد تو مجتہدین بہت کم ہوئے ہیں اور بجز ائمہ اربعہ ۔ امام ابوحنیفہؒ ۔ امام مالکؒ ۔ امام شافعیؒ ۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے بقیہ مجتہدین کے مذاہب نہ پوری طرح مدون ہوئے نہ محفوظ ہیں' اس لئے اُمت کا اجماع ہو گیا ہے کہ حق ان مذاہب میں منحصر ہے ۔

قیاس سے مراد یہ ہے کہ قرآن و سُنت میں جس چیز کے متعلق ایک حکم کسی علت کی بنا پر دیا گیا ہے وہی علت دوسری چیز میں پائی جائے تو اس پر بھی وہی حکم لگایا جائے جو صل کا حکم تھا ۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی ۔ سونا ۔ گیہوں ۔ جو ۔ نمک کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں سے کسی کو اس کی جنس کے عوض بیع کرو تو دست بدست برابر سرابر بیع کرو زیادتی ربا ہے اگر جنس بدل جائے مثلاً چاندی کو سونے سے گیہوں کو جو سے بدلو تو زیادتی کمی جائز ہے ۔ دست بدست ہونا ضروری ہے اسی پر چاول کو قیاس کیا گیا ہے کہ چاول کو چاول کے عوض بدلا جائے تو یہاں بھی برابری شرط ہے اور دست بدست ہونا بھی کیوں کہ حدیث میں جن چھ اشیاء کا نام لیا گیا ہے ان میں علت ربا اتحاد جنس و قدر ہے اور یہ علت چاول چاول سے بدلنے میں بھی موجود ہے قیاس ہر کس و ناکس کا معتبر نہیں صرف مجتہدین کا معتبر ہے جو علوم قرآن و علوم حدیث و اقوال فقہاء سابقین سے پوری طرح واقف اور قواعد و محاورات عربیت و اسالیب کلام اور معرفت علل احکام و طرق استنباط میں ماہر ہوں ۔ محض عقلی قیاس جس کی بنیاد کتاب و سُنت پر نہ ہو شریعت میں کوئی چیز نہیں ۔ جن آیات و احادیث میں ظن و قیاس کی مذمت وارد ہے اس سے وہی قیاس و ظن مراد ہے جس کی بنیاد صرف اپنی ذاتی رائے پر کتاب و سُنت پر نہ ہو ۔

مقدمہ ثانیہ جو لوگ حدیث کو حجت شرعیہ نہیں مانتے اسی طرح جو فرقے (خوارج معتزلہ اور ظاہریہ) اجماع و قیاس شرعی کو نہیں مانتے اُن کے خلاف کو قادح اجماع نہیں مانا گیا ۔

مقدمہ ثالثہ جس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہو اس کی مخالفت بعض دفعہ کفر ہے اور جس مسئلہ پر تابعین و تبع تابعین وغیرہ کا اجماع ہو چکا ہو اس کی مخالفت فسق ہے اس میں کچھ تفصیل بھی ہے' جو کتب اصول سے معلوم ہو سکتی ہے ، اجماع بلا دلیل نہیں ہوتا اہلِ اجماع کے پاس کوئی نص ضرور ہوتی ہے جو اجماع کے بعد ثبوتاً یا دلالۃً قطعی ہو جاتی ہے ۔

مقدمہ رابعہ جس صحابی کا نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہونا معلوم ہے اس کی تفسیر حدیث مرفوع کے حکم میں ہے یعنی اس کو تفسیر رسولؐ میں شمار کیا جائے گا جب کہ اس کا تعلق آیت کے شان نزول سے ہو ۔ یا ایسی بات سے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اور قیاس کا اس میں کوئی دخل نہیں (تدریب الراوی ص۶۳ و مقدمۃ الاعلاء)

مقدمہ خامسہ جس حدیث کو قرن صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں سب علماء و فقہاء نے قبول کیا ہو وہ بحکم متواتر ہے (احکام القرآن للجصاص) اس کا انکار بعض دفعہ کفر ہے اور فسق سے کسی حال میں خالی نہیں ۔

مقدمہ سادسہ جس مسئلہ میں نص موجود نہ ہو اس میں صحابی مجتہد کا قول حجت ہے اس کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جائے گا اور اگر یہ قول صحابہ میں مشہور ہو گیا ہو اور سب نے تسلیم کر کے سکوت کیا ہو تو جمہور فقہاء کے نزدیک یہ اجماع ہے جس کا ماننا

واجب ہے البتہ اگر صحابہ میں اتفاق نہ ہو بلکہ اختلاف ہو تو بعد والے مجتہدین کو اختیار ہے کہ جس قول کو چاہیں لے لیں لیکن صحابہ کے اقوال سے باہر جانا اور نئی شق نکالنا جائز نہیں کیونکہ وہ اس اجماع مرکب سے باطل ہو چکی ہے۔
(التوضیح مع التلویح ج ۲ صفحہ ۱ ۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۸)

مقدمہ سابعہ، حدیث قرآن کی شرح ہے اور فقہ حدیث و قرآن دونوں کی شرح ہے قیاس مجتہد کتاب و سنت کی مراد کو ظاہر کرتا ہے کوئی نئی بات پیدا نہیں کرتا فقہاء کے قول "القیاس مظہر لا مثبت" کے یہی معنی ہیں سنت، رسول اور اسوۂ حسنہ کو الگ کرکے قرآن کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا کیونکہ سنت اور اسوۂ حسنہ قرآنی احکام کی تعمیل کی اولین اور مکمل ترین شکل تھی۔ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ نئے نئے مسائل کے متعلق دینی احکام معلوم کرنے میں اسوۂ رسول ایک پل بھر کے لئے بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا کیونکہ اسلام مجرد نظریہ نہیں بلکہ اپنے ساتھ اسوۂ حسنہ اور سیرت رسول کی ٹھوس مثال بھی رکھتا ہے ٹھوس مثال کو چھوڑ کر مجرد نظریہ ہر زید و عمر کے ہاتھ کا کھلونا بن سکتا ہے"

مقدمہ ثامنہ اب رہا اجتہاد تو اجتہاد مقید کا دروازہ کھلا ہوا ہے علوم قرآن و علوم حدیث و اقوال فقہاء سابقین سے واقف ہو کر محاورات عربیہ و اسالیب کلام میں مہارت تامہ حاصل کرکے کسی مجتہد مطلق کے بیان کردہ علل احکام و اصول استنباط و فروع فقہیہ کو سامنے رکھ کر نئے مسائل کے احکام آج بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں اور برابر معلوم کئے جائیں گے لیکن یہ اجتہاد بھی ایسا سستا نہیں ہے کہ ہر کلرک اور بیرسٹر اور جج اور مولوی فاضل وغیرہ مجتہد بن بیٹھے جیسا آجکل ہو رہا ہے بلکہ اس کے لئے بھی شرائط ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے مجتہد مطلق اور مجتہد مقید کیلئے ان شرائط کا ضروری ہونا امت کا متفق علیہ مسئلہ ہے جن پر کتب ائمہ شاہد عدل ہیں (ملاحظہ ہو طبقات الفقہاء و الفوائد البہیہ و رسوم المفتی وغیرہ)

مقدمہ تاسعہ، مسائل شرعیہ غیر منصوصہ میں حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور بقیہ خلفاء راشدین کی تقلید واجب ہے حدیث صحیح میں ہے اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر اتباع کرو ان دو کا جو میرے بعد (خلیفہ) ہوں گے ابوبکرؓ و عمرؓ علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین عضوا علیہا بالنواجذ۔ میری سنت اور خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو لازم سمجھو اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ یہ خیال غلط ہے کہ حضرات خلفاء راشدین نے کبھی کوئی حکم نص کے خلاف بھی دیا ہے جن مسائل میں نص موجود ہے وہ ہمیشہ نص کا اتباع کرتے تھے مسائل غیر منصوصہ میں البتہ اجتہاد کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق ان کا اجتہاد دوسروں کے اجتہاد سے مقدم ہے وقال عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما فی خطبۃ بحضر من الصحابۃ والتابعین الا ان ماسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصاحباہ فہو دین وننتہی الیہ وماسن سواہما فانا نرجیہ۔ خلیفہ راشد عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں صحابہ اور تابعین کے سامنے فرمایا۔ سن لو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے دو رفیقوں (ابوبکرؓ و عمرؓ) نے طریقہ جاری کیا ہے وہ دین ہے اور وہی ہمارا منتہائے مقصد ہے ان دو بزرگوں کے سوا جو طریقہ دوسروں نے جاری کیا ہے ہم اس کو پیچھے رکھیں گے"

مقدمہ عاشرہ، خلفاء راشدین کے علاوہ دوسرے امراء و سلاطین و حکام اسلام اگر نماز کے پابند ہوں شعائر اسلام کا پورا احترام کرتے ہوں ان کی اطاعت صرف امور انتظامیہ میں لازم ہے امور تشریعیہ میں ان کو دخل دینے کا حق نہیں ان کے حکم سے امور تشریعیہ میں وجوب یا حرمت پیدا نہ ہوگی۔ امام نووی نے ایک دفعہ فتویٰ دیدیا تھا کہ اگر امام کسی دن کے روزہ کا حکم دے تو اس دن روزہ رکھنا واجب ہے اس زمانہ کے سب علماء نے مخالفت کی اور انکے فتوی کو رد کیا (فیض الباری ج ۲ ص ۲۷۸) اور امور

انتظامیہ میں بھی ان کی اطاعت وقتی ہوتی ہے جب تک برسرِ حکومت رہیں گے اطاعت لازم ہے ان کے انتقال یا معزولی کے بعد اطاعت لازم نہ رہے گی البتہ اگر بعد میں آنے والا حاکم یا امیر دوبارہ وہی حکم دے تو اس کی اطاعت کی جائے گی۔

غلط فہمی ۱ کا جواب

ان اصول کی تمہید کے بعد کتابچہ مذکورہ کا جواب شروع کرتا ہوں وباللہ التوفیق سب سے پہلے اس کے مصنف نے علماء کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلی غلط فہمی تو یہ ہے کہ اس قسم کی اصلاحات کو مغرب کی نقالی اور مرعوبیت کا نتیجہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کا جواب خود اس کتابچہ ہی کے صفحہ ۱۸ پر موجود ہے جہاں حکومت کو مشورہ دیا گیا ہے کہ "آرڈی ننس میں بعض اصطلاحات رومن لاء سے مستعار لے کر استعمال کی گئی ہیں۔ حالانکہ ان کے مترادف الفاظ فقہ حنفی میں موجود ہیں اور لوگ ان سے مانوس ہیں"۔ جب کسی قانون میں اسلامی الفاظ کو چھوڑ کر رومن لاء کے الفاظ استعمال کئے جائیں گے لامحالہ اس کے پڑھنے والے کو یہ خیال پیدا ہوگا کہ قانون بنانے والے کمیشن نے احکام اسلام کو اسلامی کتابوں سے نہیں بلکہ انگریزی کتابوں سے حاصل کیا ہے اور واقعہ بھی اسکی مطابقت کرتا ہو تو پھر غلط فہمی کیسی؟ رہا یہ کہ پوتے کی میراث کا مسئلہ یورپ میں نہیں اور طلاق کا مسئلہ یورپ نے اسلام سے سیکھا ہے اس کا جواب ظاہر ہے کہ یورپ نے طلاق کا مسئلہ ہم سے سیکھ کر جو قیدیں لگائی ہیں وہی صورت کمیشن نے اختیار کی ہے اور پوتے کی میراث میں اجماع امت کی مخالفت کر کے یورپ کے اس نظریہ کی نقالی کی گئی ہے کہ حکومت کو مذہبی مسائل کی تبدیلی کا حق ہے۔ تعدد ازدواج کے توحد (MONOGAMY) کا مسئلہ بھی سراسر یورپ سے لیا گیا ہے قرآن کریم سے جس طرح اس توحد کو غلط طریقہ پر سمجھا گیا ہے اس کی حقیقت آئندہ اوراق میں واضح ہو جائیگی

دوسری غلط فہمی اور جواب

دوسری غلط فہمی یہ دکھلائی گئی ہے کہ مقتدر چودہ علماء کرام کو شکایت ہے کہ تعدد ازدواج کے معاملہ میں تو ہمارے ارباب حل وعقد کو پابندیاں عائد کرنے کی اس قدر سخت ضرورت محسوس ہوئی لیکن قرآن نے جن برائیوں سے صریح الفاظ میں منع کیا ہے ان میں سے کسی کو قانون کے ذریعہ روکنے کی انھوں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔۔۔۔۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ "کسی خاص برائی کے خلاف سرگرم عمل نہ ہونا اس کے لئے وجہ جواز نہیں ہے کہ دوسری برائیوں کے خلاف بھی سرگرمی نہ دکھائی جائے (الخ) مگر سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے ان برائیوں کا مٹانا ضروری ہے جن کے وجود سے پاکستان کا اسلامی حکومت ہونا مخدوش ہو رہا ہے یا ان کا جن کے وجود سے پاکستان کی اسلامیت پر ضرب نہیں پڑتی؟ یقیناً ہر صاحب عقل پہلی برائیوں کے قلع قمع کو ترجیح دے گا۔ یہی مقتدر چودہ علماء نے ارشاد فرمایا ہے۔ ہر مسلمان دل سے یہ چاہتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اس کی ایسی شان ہونی چاہیئے کہ ہر نووارد یہ محسوس کرے کہ اب یہاں انگریزی حکومت نہیں بلکہ اسلامی حکومت ہے مگر افسوس ہے کہ کمیشن کو اس کا احساس نہیں اس نے نکاح وطلاق پر وہ پابندیاں لگا کر جو یورپ میں رائج ہیں پاکستان کی اسلامیت کو اجاگر نہیں کیا بلکہ یورپ سے اور زیادہ قریب کر دیا اس کے بعد بڑے معصومانہ انداز سے کہا گیا ہے کہ ہم عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ آئین وقانون سے محروم ہیں اس لئے ان برائیوں کی روک تھام کی جارہی ہے جو متعدی قسم کی ہیں جن سے دوسروں پر ظلم ہو رہا ہے (الخ) گویا فحاشی۔ عریانی۔ عصمت فروشی۔ شراب خوری۔ رشوت ستانی بے ایمانی۔ بے حیائی۔ بداخلاقی۔ ان کے نزدیک متعدی برائیاں نہیں۔ ان سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا حالانکہ یہی وہ اسباب ہیں جن سے چوری۔ ڈکیتی۔ اغوا۔ بردہ فروشی۔ رشوت جیسے جرائم ملک میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئے ہیں اور یہی پاکستان میں عیسائیوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ جب میں ڈھاکہ میں تھا بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کا رونا روتی تھیں کہ ہمارا سارا زیور گھوڑ دوڑ جوئے میں اور زنان بازاری سے بیگنیں پڑھانے میں لگا دیا ان کو نہ ہمارے کھانے کی فکر ہے نہ کپڑے کی۔ بنگال میں عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں۔ تعدد ازدواج کا وہاں رواج ہے مگر اس کی وجہ سے عورتیں

کو وہ مصیبت نہ تھی جو ریس کورس کے جوئے اور عصمت فروشی کے اڈوں سے تھی۔

تیسری غلط فہمی اور اس کا جواب

تیسری غلط فہمی مداخلت فی الدین یعنی دین میں دخل اندازی کے خیال کو بتلایا گیا اور کہا گیا ہے کہ یہ دو صد سالہ انگریزی غلامی کی یادگار کے طور پر ہمارے دماغوں سے اب تک محو نہیں ہوا پھر اس کا جواب دیا گیا ہے لیکن اب پاکستان بن جانے کے بعد اگر موجودہ مسلم حکومت مباحات میں ضروریات اور مصالح کی بنا پر اصلاح کی خاطر کوئی پابندی عائد کرتی ہے اس کو مداخلت فی الدین نہیں کہا جاسکتا۔ پھر نکاح اور طلاق اور پوتے کی میراث کے مسائل کو ہفتہ میں دو دن گوشت پر پابندی اور قواعد ٹریفک کی پابندی پر قیاس کیا گیا ہے۔ مصنف کتابچہ کی اسلامی تاریخ پر نظر نہیں اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ علمائے سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں بھی مسلمان بادشاہوں کی مداخلت فی الدین کو برداشت نہیں کیا گیا۔ اکبر بادشاہ نے ذبیحہ گاؤ کو بند کرنا چاہا تھا تو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مخالفت کی اور ذبیحہ گاؤ کو ہندوستان میں شعار اسلامی قرار دیا اور اپنے مکتوبات میں بار بار اس پر زور دیا کہ اس حکم کی مخالفت کی جائے اور ذبیحہ گاؤ کو جاری کیا جائے مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی میں اور شاہ امان اللہ خاں نے کابل میں متجددانہ نام نہاد اصلاحات جاری کرنا چاہیں تو علماء نے برابر مخالفت کی اور اس حق گوئی کی پاداش میں بہت سے علماء قتل اور قید ہوئے۔ حکومت شام نے عورتوں کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق دینا چاہا علمائے اس پر سخت احتجاج کیا۔ کیا ان کے دماغوں پر بھی انگریزی حکومت کی دو صد سالہ غلامی کا ہوا سوار تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ سلاطین و امراء کو انہی مباحات میں قانون سازی کا اختیار رہے جو امور انتظامیہ کی قسم سے ہوں امور شرعی میں پابندیاں عائد کرنے کا حق نہیں ملاحظہ ہو مقدمہ عاشرہ یہیں سے اس قیاس کی غلطی بھی واضح ہوگئی کہ ہفتہ میں دو دن گوشت پر پابندی لگانا اور ٹریفک کے قواعد کا لوگوں کو پابند کرنا وغیرہ وغیرہ مداخلت فی الدین نہیں تو نکاح وطلاق اور پوتے کی میراث جیسے مسائل میں دخل دینا بھی دین میں مداخلت نہیں جواب ظاہر ہے کہ وہ امور انتظامیہ کی قسم سے ہیں اور یہ امور تشریعی کی جنس سے ہیں اس لئے قیاس غلط ہے۔ اس کے بعد علامہ صبحی محمصانی کی کتاب فلسفۃ التشریع فی الاسلام سے طویل عبارت کا ترجمہ دیا گیا ہے جس سے حسب ذیل امور کو ثابت کیا گیا ہے جن کی شرح بھی میں ساتھ ساتھ کردوں گا کہ مصنف نے کس عبارت سے کیا ثابت کرنا چاہا ہے اور اس مسئلہ کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

(۱) "خلیفہ یا سلطان نے کبھی بھی قانون سازی سے پہلو تہی نہیں کی۔"

جواب ان کی قانون سازی عموماً امور انتظامیہ تک محدود تھی البتہ خلفاء راشدین مہدیین صاحب اجتہاد بھی تھے اس لئے وہ امور دینیہ میں بھی اجتہاد کرتے تھے جو سلاطین صاحب اجتہاد نہ تھے وہ امور تشریعیہ میں فقہاء ومجتہدین کے مشورہ پر چلتے تھے۔

(۲) "اس قانون سازی کا جواز اور رعیت پر اس کی پیروی کا واجب ہونا۔ کتاب اللہ سنت رسول اللہ ؐ اور اجماع سے ثابت ہے"

جواب اسی تفصیل کے ساتھ جو دفعہ اول میں بیان کی گئی ہے۔ اس دفعہ ۲ میں مصنف کتابچہ نے سنت اور اجماع کو حجت مان لیا ہے اس کو ذہن نشین کر لیا جائے کیوں کہ آگے چل کر میراث و نکاح وطلاق کے مسئلہ میں سُنّت اور اجماع دونوں کو پیچھے ڈال دیا اور عقلی تیر تکوں سے کام لیا ہے۔

(۳) "صحیح حدیثوں میں موجود ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔"

جواب مگر اس میں بھی ایک قید ہے جس کو حذف کر دیا گیا ہے وہ یہ کہ امراء نماز کے پابند ہوں۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے اوپر ایسے لوگ بھی حکومت کرنے والے ہونگے جن کی بعض باتیں اچھی ہونگی کچھ بری ہوں گی۔ صحابہؓ نے عرض کیا تو ہم ان سے قتال نہ کریں فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں امام نووی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ خلفاء پر خروج کرنا جائز نہیں جب تک، وہ قواعد اسلام میں تبدیل و تغیر نہ کریں۔ ج ۲ ص ۱۲۸۔

(۴) اس پر اجماع بھی رہا ہے مسلمان خلفاء نے بہت سے مسائل میں اجتہاد کیا ہے اور انکا اجتہاد بالاتفاق قبول کرلیا گیا اور شریعت اسلامی کا جزو بن گیا۔"

جواب خلفاء راشدین مجتہد تھے ان کو امور تشریعیہ میں بھی اجتہاد کا حق تھا جب کہ نص موجود نہ ہو اور دوسروں سے انکا اجتہاد ہمیشہ مقدم رکھا جائے گا ملاحظہ ہو مقدمہ تاسعہ بقیہ امراء و سلاطین کا اجتہاد امور انتظامیہ میں قبول کیا گیا ہے جب کہ کسی نص کے خلاف نہ ہو۔ جیسے دفتروں کا قیام و ترتیب خراج وصول کرنا قید خانوں، جیلوں اور انتظامی محکموں کی تنظیم وغیرہ۔

(۵) "احکام کا تبدیلی کا حق۔ خلفاء نے بعض ایسے احکام کی تبدیلی کرنے میں بھی پہلو تہی نہیں کی جو نصوص سے ثابت تھے جب کہ شرعی سیاست یا مصلحت عامہ اس کی مقتضی ہوئی تمثال میں حضرت عمرؓ کا قحط سالی میں چوروں سے حد ساقط کر دینا مؤلفۃ القلوب کا حصہ صدقات میں سے ساقط کر دینا۔ زنا میں شہر بدر کرانے کی سزا موقوف کر دینا شمار کیا گیا ہے۔

خلفاء راشدین نے احکام شرعیہ میں تبدیلی نہیں کی

یہ دفعہ بالکل غلط ہے خلفاء کو تبدیلی احکام کا حق ہرگز نہیں اور نہ انھوں نے ایسا کیا۔ جو مثالیں حضرت عمرؓ کے احکام کی بیان کی گئی ہیں ان میں تبدیلی احکام کا شائبہ بھی نہیں۔ حضرت عمرؓ کا قحط سالی میں چوروں کے ہاتھ نہ کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کھانے کی چیزیں چرائیں تو ہاتھ نہ کاٹا جائے کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کپڑے۔ برتن۔ زیور۔ نقدی وغیرہ چرائیں تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے لاقطع فی زمن المجاعۃ (الجامع الصغیر ص ۱۶۱ ج ۲) بھوک کے زمانہ میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ اسی کو امام احمد بن حنبل اور عبدالرزاق و ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے درمختار میں تصریح ہے کہ ایام قحط میں کھانے پینے کی چیزیں چرانے میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا کیوں کہ بظاہر وہ مضطر ہوگا۔ اور ایسی حالت میں کھانے کی چیزیں لینے کی گنجائش ہے ص ۳۰۶ ج ۳ پس یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے کسی نص کے حکم کو بدلدیا بلکہ جیسا ابو امامہؓ باہلی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا ویسا ہی حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے یہ حکم سنا تھا اسی طرح مولفۃ القلوب کے حصہ کو صدقات سے ساقط کرنا اس لئے تھا کہ مولفۃ القلوب باقی نہ رہے تھے کیونکہ مولفۃ القلوب وہ ہیں جن کی تالیف قلب کی حکومت اسلام کو ضرورت ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار قریش کی حمایت اور طرفداری سے بعض قبائل عرب کو روکنے کی ضرورت تھی اس لئے ان قبائل کے سرداروں کو تالیف قلب کے طور پر صدقات میں سے کچھ دیا جاتا تھا جب حکومت اسلام کو اس قسم کی تالیف کی ضرورت نہ رہی تو مولفۃ القلوب باقی نہ رہے۔

جب مسلمانوں کا پورے عرب پر تسلط ہو گیا مکہ بھی فتح ہو گیا اور قیصر و کسریٰ کی طرف اسلامی فوجیں پیش قدمی کرنے لگیں تو اب حکومت اسلام کو ان مولفۃ القلوب کی کیا ضرورت باقی رہی جن کو کفار قریش سے توڑنے کے لئے کچھ رقم دی جاتی تھی؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ آجکل صدقات میں غلاموں کا حصہ نہیں رہا کیونکہ جہاد ہی نہیں ہو رہا ہے جو غلاموں کا وجود ہو۔ یہی حضرت عمرؓ کے اس قول کا مطلب ہے لیس الیوم مولفۃ کہ آج کل مولفۃ القلوب کا وجود نہیں رہا اور صحابہؓ نے اس پر اجماع و اتفاق کیا یہ مطلب نہیں کہ مولفۃ القلوب کا وجود مانتے ہوئے انکے حصہ کو ساقط کر دیا گیا ورنہ لازم آئے گا کہ خلیفہ صرف حکم رسول ہی کو نہیں بلکہ قرآنی

احکام کو بدل سکتا ہے کیونکہ مؤلفۃ القلوب کا حق حدیث ہی نہیں بلکہ قرآن میں منصوص ہے اور اس کا قائل تو منکر... حدیث بھی نہیں کہ خلیفہ قرآنی احکام کو بھی بدل سکتا ہے۔" رہا حد زنا میں تغریب عام ایک سال کے لئے شہر بدر کرنا تو حضرت عمرؓ نے بتلا دیا کہ یہ حد زنا کا جزو نہیں بلکہ سیاست اور تعزیر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس سے زجر و تنبیہ ہوتی تھی اب اس سے زجر و تنبیہ نہیں ہوتی بلکہ زانی دوسرے شہر میں جاکر اور بھی آزاد ہو جاتا ہے اس لئے اب یہ سیاست ضروری نہیں بلکہ امام کی رائے پر ہے۔ حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ یہی حنفیہ کا مذہب ہے کیونکہ نص قرآن میں غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے جلد مائۃ (سو کوڑے مارنا) حد مقرر کی گئی ہے حدیث سے اس پر زیادتی کرنا اور تغریب عام کو حد قرار دینا اصول کے خلاف ہے۔ اس زیادتی کو سیاست اور تعزیر پر محمول کرنا ضروری ہے اسی حقیقت کو حضرت عمرؓ نے واضح فرمایا ہے اس کو تبدیلی حکم قرار دینا اصول سے ناواقفیت کا اقرار کرنا ہے۔

(۶) شریعتِ اسلامیہ پر خلیفۂ وقت ایک دوسرے پہلو سے بھی اثر انداز ہوتا تھا وہ یہ کہ لوگوں کو کسی خاص مسلک یا مخصوص اجتہاد کی پیروی کا حکم دے سکتا تھا پھر اس کتاب میں اموی اور عباسی خلفاء کی مثال دی گئی ہے کہ وہ ان تمام مذاہب و مسالک کے لوگوں سے جنگ کرتے تھے جو ان کے اور ان کی سیاست کے خلاف ہوتے تھے فاطمی خلفاء اسماعیلی مذہب کی حمایت کرتے تھے اموی خاندان کے سلاطین شافعی مذہب کی حمایت کرتے تھے ایرانیوں نے شیعہ امامیہ کی یمنیوں نے شیعہ زیدیہ کی وہابیوں نے مذہب حنبلی کی اور عثمانی خلفاء نے فقہ حنفی کی جانب داری کی ..... (الخ)

جواب خلفاء راشدین کو چھوڑ کر دوسرے خلفاء سلاطین کے طرز عمل سے استدلال کرنا جس قسم کی ذہنیت کا پتہ دے رہا ہے ظاہر ہے حالانکہ درمیان میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ ابوجعفر منصور خلیفہ نے ارادہ کیا تھا کہ لوگوں کو موطا امام مالک کے اتباع کا حکم دیں لیکن امام مالک نے ان کو منع کیا کہ ایسا نہ کریں (کیونکہ حضرات صحابہ مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے اور ہر جگہ کے مسلمانوں نے ان صحابہ کا اتباع کیا جو ان کے سامنے تھے تو لوگوں کو ان کے طریقہ پر عمل کرنے دو) ہم مقدمہ عاشرہ میں بتلا چکے ہیں کہ خلفاء راشدین کے بعد دوسرے خلفاء امراء کی اطاعت صرف انتظامی امور میں لازم ہے تشریعی امور میں ان کو دخل دینے کا حق نہیں نہ اطاعت واجب۔ بلکہ امور تشریعیہ میں مجتہدین کا اتباع کیا جائے گا۔ اب اگر کسی مملکت میں ایک ہی مجتہد کا مذہب رائج ہو اکثریت اس کی پیرو ہو تو سلطان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی مملکت کا قانون عام اس مجتہد کے مذہب پر بنائے اور اگر دوسرے ائمہ کے مقلدین بھی کافی تعداد میں موجود ہوں تو انکے لئے جدا قاضی مقرر کر دیا جائے چنانچہ ہم کو تاریخ سے معلوم ہے کہ ترکی سلطنت کے زمانہ میں اگرچہ حکومت کا سرکاری مذہب حنفی تھا مگر مصر و حرمین کے اندر شافعی اور مالکی قضاۃ بھی موجود تھے اور اہل ذمہ کے لئے تو قاضی اہل ذمہ کا مستقل باب ہمارے فتاویٰ موجود ہے اس سے حکومت وقت کے لئے علمی طور پر اجتہاد کا حق حاصل ہونا کس طرح ثابت ہو گیا؟ یہ مسلّم ہے کہ اجتہادی مسائل میں سے کسی مسئلہ میں کسی خاص مجتہد کے قول پر عمل کرنے کا حاکم وقت حکم دے دے تو وہ متعین ہو جاتا اور اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے لئے حاکم وقت کا مجتہد ہونا یا فقہاء وقت سے مشورہ کرنا ضروری ہے سلطنت ترکی کا المجلۃ العدلیہ علماء کی کونسل نے مرتب کیا تھا اسی طرح فتاویٰ عالمگیری بھی علماء اور فقہاء نے مدون کیا تھا حنفیہ نے جہاں یہ کہا ہے کہ قضائے قاضی رافع اختلاف ہے وہاں اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ قاضی کے لئے کیا شرائط ہیں۔ علامہ صبحی نے اس کا اقرار کیا ہے کہ خلیفہ اسلامی حکومت کے طریقہ کا پابند ہوتا ہے اور وہ طریقہ معاملات مملکت میں مشورہ کرتا ہے قرآن کریم میں ہے وشاورھم فی الامر۔ وامرھم شوریٰ بینھم (اس کا مطلب وہی ہے جو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ امور انتظامیہ میں مشورہ مراد ہے) امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض معاملات

میں صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور آپ کے بعد خلفاء بھی امانت دار اہل علم (یعنی فقہاء) سے ان مباح امور میں جن کے لئے کتاب و سنت میں کوئی تصریح موجود نہیں ہوتی تھی مشورہ فرمایا کرتے تھے تاکہ آسان صورت اختیار کی جاسکے (اس کے ساتھ ہی بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب کسی کے پاس کوئی نص یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی تو نص پر عمل کیا جاتا تھا مشورہ پر نہیں) اور حضرت عمرؓ بن الخطاب کے متعلق خاص طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں اور اجتہادات میں مشورہ پر عمل کرتے تھے ان کے متعلق سب سے زیادہ مشورہ کرنے کی شہرت ہے (اسی کے ساتھ بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اہل شوریٰ قراء یعنی علماء و فقہاء ہوتے تھے خواہ جوان ہوں یا بوڑھے جن مسائل میں نص موجود نہ ہو ان میں خود حضرت عمرؓ کا اجتہاد بھی کافی تھا کیونکہ وہ مجتہد تھے اور ان کی تقلید کا امت کو حکم بھی دیا گیا ہے مگر وہ احتیاطاً اپنے اجتہاد کے ساتھ دوسرے فقہاء کا مشورہ بھی شامل کر لیا کرتے تھے ان کے بعد والے امراء و سلاطین اگر مجتہد نہ ہوں تو ان کو امور تشریعیہ میں اجتہاد کا حق نہیں بلکہ علماء و فقہاء زمانہ سے مشورہ کرنا ضروری ہے اس کے بعد قیادت کے صالح اور غیر صالح ہونے کی بحث فضول ہے امور تشریعیہ میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ ضرر عام کو دفع کرنا۔ مفاسد کو دفع کرنا وغیرہ امور انتظامیہ کی حد تک امراء و سلاطین کے اختیار میں شامل ہے اور تشریعیہ میں اقوال مجتہدین پر عمل کیا جائے گا اگر فقہ حنفی میں کسی مشکل کا حل نہیں ملتا تو دوسرے فقہاء کے اقوال میں اس کا حل تلاش کیا جائیگا مگر یہ کام بھی علماء اور فقہاء وقت کے مشورہ سے ہونا ضروری ہے ۔۔

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب الحیلۃ الناجزہ میں مذہب مالکی کے ذریعہ عورتوں کی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو خود کتب مالکیہ سے ان کا مذہب معلوم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مکہ مدینہ کے مالکی علماء سے استفسار کیا ان سے امام مالک کے مذہب کی پوری تحقیق کی پھر اپنے زمانہ کے سربرآوردہ حنفی علماء کی رائے دریافت کی اس طرح کئی سال کی تحقیق و تدقیق کے بعد الحیلۃ الناجزہ کے نام سے کتاب شائع کی گئی۔ عائلی کمیشن کے ارکان میں سب کو معلوم ہے کہ علماء زمانہ میں سے صرف ایک عالم کو لیا گیا تھا اور اس کے اختلافی نوٹ کے باوجود غیر اہل علم کی رائے کو ترجیح دی گئی ۔ رہا یہ کہ زمانہ کی مشکلات کو تو حل کرنا ہی پڑے گا اگر علماء نے ان کا خود کوئی حل پیش نہ کیا اور دوسرے لوگوں کو ان کا حل پیش کرنا پڑا تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں تک دینی حدود اور مذہبی قیود کے مطابق ہوگا (ص۴۲) اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ترکی حکومت نے ایک زمانہ میں المجلۃ العدلیہ مرتب کرنے کے لئے علماء کی کونسل مقرر کی تھی اور اس سے پہلے سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ عالمگیریہ مدون کرنے کے لئے چالیس مقتدر منتخب علماء کی مجلس مقرر کی تھی اسی طرح حکومت پاکستان کو شرعی امور کے بارے میں اہتمام کرنا چاہیئے تاکہ خوبی و عمدگی کے ساتھ کام پایہ تکمیل کو پہونچے ۔ ویسے ہر عالم فقیہ و مفتی اپنی جگہ پر جتنا اس سے ہوسکتا ہے کام کر ہی رہا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس طرح کام کی تکمیل نہیں ہوسکتی ہر عالم کو نہ تمام مشکلات کا علم ہوسکتا ہے اور نہ وہ تنہا سب کو حل کرسکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ حکومت پاکستان اس کے لئے مقتدر منتخب علماء کی ایک کونسل مقرر کرے پھر عہدہ قضا قائم کرے جس کا مطالبہ تقسیم ہند سے پہلے برطانوی حکومت میں بھی کیا گیا تھا۔ عائلی مسائل کا حل اور اس خصوص میں نزاعات و مقدمات کا تصفیہ قاضی شرع کے بغیر بہت دشوار ہے !

(۷) اس کتاب میں لکھا ہے "یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست کی کوئی ثنویت نہیں ہر مسئلہ جو پیدا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی پہلو سے اپنا تعلق مذہب سے بھی رکھتا ہے (ص۴۳)

اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ عجیب مغالطہ ہے جو عام طور سے زبان زد ہوگیا ہے مگر حقیقت سے اکثر لوگ بے خبر ہیں یہ مسلم ہے کہ ہر مسئلہ کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب کے ساتھ ہوجاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب سے تمام

مسائل کا تعلق یکساں درجہ کا ہے مذہب میں عقائد - عبادات - معاملات - اخلاق - سیاسیات سب ہی شامل ہیں - مگر کون نہیں جانتا کہ عقائد اور عبادات و اخلاق کا درجہ بڑھا ہوا ہے اور ان کو دعوت اور تعلیم و تربیت کی راہ سے قوم میں رائج کیا جاتا ہے معاملات و سیاسیات حقہ حکومت اور قانون کے ذریعہ رائج کئے جاتے ہیں پھر ان میں جن امور کے متعلق نصوص اور دینی فیصلے موجود ہیں ان سے باہر جانا جائز نہیں - نئی نئی صورتوں کے متعلق امور تشریعیہ میں علماء اور فقہاء کے مشورہ سے اور امور انتظامیہ میں تجربہ کار مبصرین کے مشورہ سے قانون بنایا جاسکتا ہے اس کا نام ثنویت نہیں - بلکہ فرق مراتب ہے ؎

گر فرق مراتب نکنی زندیقی - مصنف کتاب نے مولانا احتشام الحق صاحب کے جواب میں بھی ص ۱۶۵ پر یہی کہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا نے معاملات اور عبادات میں تعارض کیسے سمجھ لیا کیا ایک چیز معاملہ اور معاہدہ ہوتے ہوئے عبادت نہیں ہوسکتی؟ جواب ظاہر ہے کہ نیت نیک سے معاملات میں ثواب مل جانا اور بات ہے مگر وہ عبادات میں داخل نہ ہوں گے یہ ثنویت نہیں بلکہ فرق مراتب ہے

(۸) "حاملان دین متین کا طبقہ وقت کی ضروریات اور اس کے تقاضوں سے بالکل ہی بے خبر ہے اور وہ بے خبر ہی رہنا چاہتا ہے" ص ۴۲

اس کا جواب یہ ہے کہ

یہ بھی ایک چلتا ہوا فقرہ ہے جو ہر محفل میں بے تکلف بولا جاتا ہے مگر اس کی تشریح آج تک کسی زبان سے سننے میں نہیں آئی - وقت کے تقاضے سے ایک مراد تو یہ ہو سکتی ہے کہ سائنس نے جو ترقی کی ہے صنعت و حرفت نے جو شکل اختیار کر لی ہے ہم اس کو اپنائیں - ایٹمی تجربہ گاہیں قائم کریں بڑی بڑی صنعتیں - زراعت کے جدید طریقے اختیار کریں - آواز سے زیادہ تیز رفتار طیارے بنائیں - انجینیرنگ اور طب کے شعبے میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ہم بھی انہیں اپنائیں اور نئی نئی ایجادات کریں - ارضیات - کیمیا طبعیات وغیرہ میں نئے نئے انکشافات کریں - جدید ترین اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کریں وقت کے تقاضے کے اس مفہوم کا ہر شخص حامی ہے اس کی اہمیت اور ضرورت سے کوئی انتہائی احمق ہو گا جو انکار کرے گا - خلفاء عباسیہ و اندلسیہ اور سلاطین اسلام نے ہر زمانہ میں ان تقاضوں کو اپنایا اور حریف قوموں سے ان چیزوں سے بڑھ چڑھ کر رہی ہے - علماء دین نے کبھی اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا بلکہ حکومت کی سرپرستی میں ایک طبقہ نے خود ان فنون میں حصہ لیا اور نام پیدا کیا - اور چونکہ تقسیم عمل کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس لئے یہ ضروری نہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک و امام شافعی اور امام احمد بن حنبل امام بخاری اور مسلم و ترمذی طحاوی بیہقی دارقطنی وغیرہم نے بھی ان فنون میں مہارت حاصل کی ہو اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً علوم قرآن و حدیث و فقہ تشنۂ تکمیل رہ جاتے بس جیسے ہر ڈاکٹر - انجنیر - سائنسدان - مولوی - محدث اور مفتی - فقیہ نہیں بن سکتا اسی طرح ہر مولوی مفتی و محدث ہو کر انجنیر - ڈاکٹر - سائنسداں نہیں ہو سکتا ہے ؎ ہر کسے را بہر کارے ساختند - وقت کے تقاضے کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ماضی کے دین و عقائد - تہذیب و تمدن اور ثقافت و سیاست سے بس نام کا تعلق رکھیں نظریاتی اور عملی دونوں حیثیت سے اپنے آپ کو زمانہ کے چلتے ہوئے نظام کے مطابق بدل ڈالیں تو پھر سوال یہ ہو گا کہ یہ تبدیلی کن تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے؟ مغرب کے طریقہ پر یا روس کے طرز پر؟ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آج جن چلتے ہوئے نظاموں کو دیکھ کر ہم اپنے دین تہذیب و تمدن اخلاق و روایات و تاریخ کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائیں گے کل کسی دوسرے ابھرنے والے نئے نظام کے ہاتھوں وہ ختم نہ ہو جائے گا؟ اور جو قوم آئے دن بدلنے والے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے ہی کو زندگی کی ترقی سمجھے گی وہ اس تبدل و تغیر میں اپنی قومی زندگی کو سلامت بھی رکھ سکے گی؟ ہمیں یقین ہے کہ اس دوسرے مفہوم کو وہ لوگ بھی غلط سمجھتے ہوں گے جن کی زبان پر صبح و شام وقت کے تقاضوں . . . . کے الفاظ جاری رہتے ہیں - درحقیقت اس دوسرے مفہوم کو اپنانے کا مطلب قومی خودکشی

کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ایسی قوم دنیا کی قیادت کا تصور بھی نہیں کر سکتی بس وہ ہر غالب اور چلتے ہوئے نظام اور تہذیب کی حاشیہ بردار بن کر رہ جاتی ہے۔ وقت کے تقاضوں کا آئے دن کا تغیر تبدل اس کی قومی خصوصیات کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے اسی کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے:۔

حدیث بےخبراں است بازمانہ بساز　　　زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

اکبر الہ آبادی نے فرمایا:۔

ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے نے تمہیں　　　مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

اسد ملتانی مرحوم نے کتنی سچی بات اکس خوبی کے ساتھ نظم کی:۔

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر

وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:۔ لن یصلح آخر ھذہ امۃ الا ما اصلح اولھا (ترجمہ) اس امت کے پچھلوں کی اصلاح اسی راستہ سے ہو سکتی ہے جس سے پہلوں کی اصلاح ہوئی ہے، اس تمہید کے بعد ان مسائل کی تحقیق شروع ہوتی ہے، جن میں مصنف کتابچہ نے عائلی کمیشن کی غلط حمایت کی ہے اور وہ چار مسئلے ہیں (۱) یتیم پوتے کی وراثت (۲) تعدد ازدواج (۳) طلاق (۴) اور نکاح کی عمر۔

یتیم پوتے کی وراثت!

مصنف کتابچہ کو تسلیم ہے کہ فقہاء اسلام کا یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ "دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ اس کے چچا وارث ہوتے ہیں یعنی دادا کی صلبی اولاد کے سامنے صلبی اولاد کی اولاد محروم ہے" جب یہ فقہاء کا متفقہ مسئلہ ہے تو اس کی مخالفت اجماع کی مخالفت ہے جس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ملاحظہ ہو:۔

(۱) مقدمہ اولیٰ۔ رہا یہ کہ ائمہ مجتہدین نے اپنے اجتہاد کو کبھی حرف آخر قرار نہیں دیا انھوں نے تاکید کی ہے کہ اگر قرآن و سنت سے ہمارے اجتہاد کی غلطی واضح ہو جائے تو ہمارے خیال کو رد کر دو۔"

یہ وہی مغالطہ آفرینی ہے جس سے اس کتابچہ میں کام لیا گیا ہے گفتگو اجماع میں ہو رہی ہے اور مجتہدین کے اقوال وہ پیش کئے جا رہے ہیں جو انھوں نے قیاسی مسائل کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں جو دلائل شرعیہ میں چوتھے نمبر کی دلیل ہے۔ اصول فقہ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ اجماع تیسرے نمبر کی دلیل ہے اور وہ بہر حال قیاس واجتہاد سے مقدم ہے۔ اجماع کے بارے میں سب کا اتفاق ہے اس کی مخالفت جائز نہیں اگر مصنف کتابچہ کو ہمت ہے تو صحابہ و تابعین میں سے کسی کا قول اس اجماع کے خلاف دکھلائے ورنہ اس کی عقلی موشگافیاں دینی اعتبار سے ذرہ برابر وزن نہیں رکھتیں، اجماع کی دین میں کیا حیثیت ہے، اس کے بارے میں ہم اوپر گفتگو کر چکے ہیں۔ میراث کے اکثر مسائل اجماعی ہیں اور اجماع بجائے خود دلیل قطعی ہے جس کو ائمہ اصول نے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے تفسیر مظہری میں مسئلہ مذکورہ کے متعلق فرمایا ہے۔ واذا کان للولد الذکر عند الانفراد جمیع المال یحجب مع ولد ذکر صلبی اولاد الابن ذکوراً کانوا او اناثاً او مختلطین بالاجماع ج۲ ص۲۲ جب انفراد کی حالت میں بیٹا پورے مال کا مستحق ہوتا ہے تو صلبی بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے پوتیاں بالاجماع محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد مصنف کی یہ بحث کہ بیٹے کے سامنے پوتے کا محروم ہونا در اصل اس مسئلہ پر مبنی ہے کہ پوتا اولاد کے مفہوم میں براہ راست داخل نہیں پھر امام ابوبکر جصاص رازی کے قول سے اس کا ثبوت دینا کہ لفظ اولاد پوتوں کو بھی شامل ہے البتہ صلبی اولاد پر اس کا اطلاق حقیقۃً ہے اور

پوتوں پر مجازاً پھر اس پر یہ اشکال کرنا کہ اس صورت میں بیک وقت حقیقت و مجاز کا جمع کرنا لازم آئے گا اور امام جصاص کے اس جواب کو کہ دو۲ مختلف حالتوں کے اعتبار سے ایک لفظ دو۲ مختلف معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے کمزور بتلانا محض باطل اور لغو ہے امام جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ کرخی اور طحاوی کی طرح مجتہدین مذہب میں شمار کئے گئے ہیں ایسے لوگوں کا ان کے منہ آنا جن کو قرآن صحیح پڑھنے اور عربی صحیح بولنے اور لکھنے اور شعراء عرب کا کلام سمجھنے کا سلیقہ نہ ہو بجز شوخ چشمی اور دیدہ دلیری کے اور کیا ہے؟ عربی کا مشہور مصرع ہے علفتہ تبناوماء بارداً (میں نے اس کو چارہ دیا بھوسا اور ٹھنڈا پانی) یہاں علفتہ کو دو مفعولوں کے اعتبار سے دو مختلف معنوں اطعمت و سقیت میں استعمال کیا گیا ہے بخاری میں ہے[1] وکان ابن الناطور صاحب ایلیاء وھرقل اسقفا علی نصاریٰ الشام (یہاں لفظ صاحب کو ایلیا کے اعتبار سے بمعنی والی اور ہرقل کے اعتبار سے بمعنی دوست استعمال کیا گیا ہے) اس لئے جصاص کا جواب کمزور نہیں اس کو کمزور کہنے والا ہی محاورات عرب سے جاہل ہے۔ پھر جس طرح لفظ ولد پوتوں کو شامل ہے اب بھی تو دادا کو شامل ہے ابوہم آدم والام حوا۔ پھر باپ کے ہوتے ہوتے دادا کیوں محروم ہے[2]؟

وصیت کے مسئلہ سے مغالطہ

اس کے بعد وصیت کے مسئلہ سے مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر کسی نے یوں کہا کہ میں نے اپنے تہائی مال کی فلاں فلاں (زید و بکر) کی اولاد کو وصیت کر دی ہے۔ ان میں سے ایک کی تو صلبی اولاد موجود ہے اور دوسرے کے پوتے موجود ہیں تو اس وصیت میں ایک فلاں کی صلبی اولاد کو اور دوسرے کے پوتوں کو وصیت سے حصہ دیا جائے گا الخ ص۵۶۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر وصیت ایک شخص ہی کی اولاد کے لئے ہو اور اس کے ایک بیٹا ہے اور ایک پوتا دوسرے بیٹے سے جو موصیٰ لہ کے سامنے مرگیا تھا تو وصیت کس کو ملے گی؟ کیا کسی فقیہ نے اس صورت میں بھی پوتے کو مستحق وصیت قرار دیا ہے؟ اگر نہیں تو جس صورت سے مغالطہ دیا گیا ہے وہ محل نزاع ہی نہیں؟

اگر دو۲ شخص مر جائیں ایک کے بیٹے ہوں دوسرے کے پوتے ہوں تو کون کہتا ہے کہ دوسرے کے پوتے وارث نہ ہونگے؟ اسی طرح جب زید و بکر کی اولاد کے لئے وصیت کی گئی ہے اور زید کے بیٹے ہیں اور بکر کے پوتوں کو وصیت سے حصہ ملے گا کیونکہ اس کی اولاد میں پوتوں کو محجوب (محروم) کرنیوالا کوئی نہیں دو۲ شخصوں کی اولاد کے لئے وصیت کا حکم وہ ہے جو دو۲ شخصوں کی موت کا حکم ہے اور ایک شخص کی اولاد کے لئے وصیت کا وہ حکم ہے جو ایک شخص کی موت کا ہے دونوں کو خلط کر دینا اور ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا علم نہیں بلکہ جہل ہے تفسیر مظہری میں اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ صلبی اولاد نہ ہونے کی صورت میں پوتوں کا وہی حکم ہے جو صلبی اولاد کا ہے اجمعوا علیٰ ان اولاد الابن لھم حکم اولاد الصلب عند عدم الولد ۲ ص۲۷ اس کے بعد حقیقت و مجاز کی بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں اہل اجماع سے زیادہ کلام عرب کے محاورات کو جاننے والا اور قرآن و حدیث کا سمجھنے والا کوئی نہیں ہو سکتا مصنف کتابچہ نے مسئلہ وصیت کو بغیر سمجھے اتنا طول دیا ہے کہ چند صفحات لکھ مارے اور نقشے پر نقشے بناتا چلا گیا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ یک من علم رادہ من عقل باید۔ اس کتابچے کے صفحہ ۷۰ تک یہی مضمون چلا گیا ہے اور وصیت کے مسئلہ سے بار بار مغالطہ دیا گیا ہے جس کی حقیقت ہم نے واضح کر دی ہے

---

[1] ابن الناطور صاحب ایلیا و ہرقل نصاریٰ شام کا بڑا پادری تھا۔

[2] اس کے علاوہ اگر لفظ "اولاد" حقیقی معنیٰ کی رو سے صلبی بیٹوں اور پوتوں دونوں کو شامل ہے تو جس پوتے کا باپ زندہ ہو، اس کو بھی شامل ہے، اس کا تقاضا تو پھر یہ ہے کہ بیٹوں کے ساتھ پوتوں پوتیوں کو اور لڑکیوں کے ساتھ نواسے نواسیوں کا ہر حال میں حصہ ہو خواہ انکے ماں باپ زندہ ہوں یا وفات پاگئے ہوں، حالانکہ اسے مصنف کتابچہ بھی جائز نہیں سمجھتے جسکی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ انکی ذمہ داری قرآن و سنت کو مسخ کرنے اور ـــــ بگاڑنے کی ہے، ورنہ اگر صرف قرآن کا اتباع کرنا ہو تو مصنف کی تحقیق کے مطابق زندہ بیٹوں، زندہ بیٹوں کی اولاد کو بھی برابر کا حصہ دار بنانا پڑتا ہے (فاران)

دُوسرا مُغالطہ پھر کہا گیا ہے کہ اس بات کی دلیل کہ ولد کا لفظ صلبی اولاد اور پوتوں کے لئے حقیقی معنی ہی میں مستعمل ہوتا ہے حق تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے جس میں آدمی پر اس کی بہو کو حرام قرار دیتے ہوئے وحلائل ابناءکم الذین من اصلابکم (اور تمہارے ان بیٹوں کی بیٹیاں بھی تم پر حرام ہیں جو تمہاری صلب سے ہوں) اور اس آیت سے متفقہ طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ پوتے کی بیوی بھی حرام ہے یہاں پوتوں کو صلبی اولاد میں شمار کر لیا گیا ہے پھر حیرت ظاہر کی گئی ہے کہ یہاں تو بالاتفاق تمام ائمہ پوتوں کی صلبی اولاد بنا ڈالتے ہیں اور جب وراثت دینے کا وقت آتا ہے تو ان کے اولاد ہونے سے بھی انکار کر دیتے ہیں اسے آخر کیا کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی "دعویٰ علم" کو جہل مرکب کہا جاتا ہے یا پھر اس کو تجاہل عارفانہ کہا جائے گا کہ جان بوجھ کر عوام کو مغالطہ دیا جا رہا ہے اگر تفاسیر کو دیکھ لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ اس آیت سے جس طرح پوتوں اور نواسوں کی بیویاں حرام ہوتی ہیں اسی طرح ائمہ کے نزدیک رضاعی بیٹوں اور پوتوں کی بیویاں بھی حرام ہو گئی ہیں تو کیا ان کو بھی صلبی اولاد کہا جائے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ ابناءکم الذین من اصلابکم کا حقیقی مصداق تو صلبی بیٹے ہی ہیں مگر اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ یہاں من اصلابکم کی قید صرف متبنیٰ کی بیویوں کو خارج کرنے کے لئے بڑھائی گئی ہے کہ جاہلیت میں ان کو بھی صلبی بیٹوں پوتوں کی بہو کی طرح حرام سمجھتے تھے قال فی المظہری وحلائل ابناءکم یشتمل بعموم المجاز الفروع من ابناء الابناء والبنات وان بعدوا الذین من اصلابکم (اے من نسلکم) خرج بھذا القید المتبنیٰ فانھم کانوا یطلقون الابن علی المتبنیٰ ووجہ آخر ذکرہ لسروایات فی نزول الاٰیۃ حین نکح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امراۃ زید بن حارثہ ونزلت وما جعل ادعیاءکم ابناءکم ونزلت ماکان محمد ابا احد من رجالکم واما ابن الابن وابن البنت بواسطہ او بلا واسطہ فلم یخرجا بھذا القید لانھما من الاصلاب ولو بالواسطۃ ولان المراد النسل بطریق عموم المجاز) واما الابن بالرضاع وفروعہ فانھم وان خرجوا بھذا القید لکن حرمتہ حلائلھم ثبتت بنص الحدیث (المشہور) وعلیہ انعقد الاجماع ج۲ ص۷ اس میں تصریح ہے کہ پوتے اور نواسے کی بیویاں وحلائل ابناءکم میں عموم مجاز کے طور پر داخل ہیں اور الذین من اصلابکم سے بالاجماع یہاں نسل مراد ہے کیوں کہ اس قید سے متبنیٰ کی بیوی کو نکالنا مقصود ہے اور پوتا اور نواسا نسل میں داخل ہیں متبنیٰ نسل میں نہیں پس یہ دعویٰ غلط ہے کہ پوتے کو حقیقی معنی میں صلبی اولاد شمار کیا گیا ہے بلکہ عموم مجاز کے طریقے سے ابناء میں شامل کیا گیا ہے۔

تیسرا مغالطہ اس کے بعد عقل اور نقل دونوں کے خلاف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ درحقیقت وہ کلیہ ہی صحیح نہیں کہ متوفی کسی کا اقرب ہو تو وارث بھی اس کا اقرب ہوگا۔ (الخ)

دنیا جانتی ہے کہ قرب و بعد مقولۂ اضافت سے ہے جب ایک شے دوسرے کے قریب ہو گی وہ بھی اس کے قریب ہو گی اگر ایک دوسرے سے اقرب ہے لامحالہ دوسرا بھی اس سے اقرب ہوگا یہ نرالی منطق اب نکالی گئی ہے کہ ایک تو دوسرے سے اقرب ہو مگر دوسرا اس سے اقرب نہ ہو پھر اس پر یہ نتیجہ مرتب کر لیا گیا کہ قرآن میں ورثہ کے لئے قریب ترین ہونے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ قرآن کریم میں اقربوں کا لفظ متوفیوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے ہمارے فقہاء نے اسے ورثہ پر بھی چسپاں کر لیا (الخ) ص۳۲ - میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ ہر عاقل وہی کہے گا جو فقہاء نے کہا ہے مصنف کتاب کی منطق عقل و دانش سے کوئی مطابقت اور مناسبت نہیں رکھتی۔ پھر فقہاء نے جو کچھ کہا ہے وہی حدیث میں وارد ہے۔ ابدا بنفسک وابدا بمن تعول اول اپنے اوپر خرچ کرو پھر ان پر جن کا نفقہ تم پر واجب ہے۔

نیز حدیث میں ہے۔ الحقوا الفرائض باھلھا فما ابقت الفرائض فلاولیٰ رجل ذکر (متفق علیہ من حدیث ابن عباسؓ) مظہری ج ۲ ص ۲۴۷ پہلے اہل فرائض کو انکے حصے دے دو فرائض والوں سے جو باقی رہے وہ قریب ترین مرد کو دیا جائے۔ یہ حدیث صحیح ہے جس کو تمام صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے قبول کیا اور تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے جس کی مخالفت جائز نہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ اولیٰ و مقدمہ خامسہ) معلوم ہوا کہ اہل فرائض کے بعد عصبات میں الاقرب فالاقرب کا قاعدہ فقہائے نے اپنی رائے سے مقرر نہیں کیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ قاعدہ مقرر فرمایا ہے اور یہ حدیث متواتر ہے مصنف کتابچہ تسلیم کرتا ہے کہ یتیم پوتے کی صورت میں دادا تو اس کا اقرب ہے کیونکہ دادا اور پوتے کے درمیان واسطہ باقی نہیں رہا مگر بیٹے کے مقابلہ میں پوتا دادا کا اقرب نہیں ہوتا (ص ۶۲) تو پھر ارشاد رسولؐ کے مطابق دادا کا وارث اس صورت میں بیٹا ہی ہوگا پوتا نہ ہوگا کیونکہ وہ اقرب نہیں ہے۔

چوتھا مغالطہ

"رہا یہ کہ جب کوئی شخص ایک لڑکی اور ایک پوتی کو چھوڑ کر مرجائے تو بیٹی کو آدھا حصہ ملتا ہے اور پوتی کو چھٹا حصہ ملتا ہے باقی عصبات کو مل جاتا ہے یہاں پر یہ اصول ٹوٹ گیا صلبی بیٹی نے پوتی کو محروم نہیں کیا۔" ص ۶۴

یہ دعویٰ غلط ہے کیونکہ پوتی کو بیٹے کے برابر حصہ نہیں دیا گیا بیٹی کو آدھا پوتی کو چھٹا دیا گیا ہے اس سے اصول کیوں کر ٹوٹا؟ قاعدہ جب ٹوٹتا ہے کہ پوتی کو بیٹی کے برابر کر دیا جاتا ایک بیٹی کا آدھا حصہ ہوتا ہے تو وہ اس کو پورا مل گیا پھر چونکہ پوتی بھی ایک واسطے بیٹی ہے اس کو چھٹا حصہ دے کر دو بیٹیوں کا دو تہائی پورا کر دیا گیا۔ صحیح حدیث میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للبنت النصف ولابنة الابن السدس تکملة للثلثین وما بقی فللاخت متفق علیہ قال المظہری ولا یرثن مع الصلبیتین لاحراز ھما تمام الثلثین الا ان یکون بحذائھن او اسفل منھن غلام فیعصبھن ج ۲ ص ۲۴۷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس صورت میں کہ میت نے ایک بیٹی ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہو) یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ بیٹی کو آدھا پوتی کو چھٹا حصہ دیا جائے دو تہائی پورا کرنے کے لئے اور باقی بہن کو دیا جائے متفق علیہ اور اگر صلبی بیٹیاں دو ہوں تو پوتی کو کچھ نہ ملے گا کیوں کہ دو بیٹیوں نے دو تہائی پورا کر لیا ہے البتہ اگر پوتی کے ساتھ یا اس کے نیچے پوتا یا پڑپوتا بھی ہو تو وہ اس کو عصبہ بنا دے گا (کہ دو بیٹیوں کو دو تہائی دے کر باقی پوتی اور پوتے یا پڑپوتے کو دیا جائے گا) مظہری ج ۲ ص ۲۴۷

اس کو اصول کا ٹوٹنا نہیں کہتے کیونکہ صلبی بیٹی اہل فرائض میں سے ہے اگر ایک ہو تو نصف کی مستحق ہے دو ہوں تو دو تہائی کی مستحق ہیں اس سے زیادہ کی وہ مستحق نہیں اسلئے ایک بیٹی اور ایک پوتی کی صورت میں بیٹی کو اور لے کر چھٹا پوتی کو دے دیا گیا باقی عصبات کو ملے گا اگر صلبی بیٹیاں دو ہوں تو پوتی کو کچھ نہ ملے گا کیوں کہ بیٹیوں کا دو تہائی ان کو پورا مل چکا ہے البتہ اگر پوتی عصبہ بن جائے کہ اس کے ساتھ پوتا یا پڑپوتا بھی ہو تو اہل فرائض کے بعد باقی عصبات کا ہے اس لئے اس کو عصبہ ہونے کی بنا پر حصہ مل جائے گا۔ مگر جس شخص کو حدیث رسولؐ سے ہی انکار ہو اس کی عقل میں یہ بات کیوں کر آئے کہ پوتی کسی وقت عصبہ بھی بن جاتی ہے اور بیٹی کے ساتھ پوتا اس لئے وارث ہوتا ہے کہ بیٹی نصف یا دو ثلث سے زیادہ کی حق دار نہیں اور باقی عصبہ کا حق ہے۔ اور پوتا عصبہ ہے اور وہ پوتی کو بھی عصبہ بنا دیتا ہے نہ اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ تکملة للثلثین بھی ایک اصول ہے اس کے بعد وہ اس پر تعجب ظاہر کرتا ہے کہ "اگر پوتا مرجائے اور اسکا بیٹا بھی موجود ہو تو اقرب کے ہوتے ہوئے بھی دادا کو ورثہ مل جاتا ہے۔ یہاں اقرب (بیٹے) کے ہوتے ہوئے بھی دادا چھٹا حصہ لیجاتا ہے" ص ۶۶ مگر یہ تعجب اسی کو ہوگا جو حدیث کو نہیں مانتا حدیث صحیح متواتر میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ پہلے اہل فرائض کو حصہ دیا جائے باقی عصبہ اقرب کو دیا جائے الاقرب فالاقرب کا اصول عصبات میں ہے اہل فرائض میں نہیں اور ظاہر ہے کہ باپ اہل فرائض میں سے ہے باپ نہ ہو تو دادا اس کی جگہ اہل فرائض میں سے ہے اس کو چھٹا حصہ پہلے دیا جائے گا اس کے بعد عصبات میں الاقرب فالاقرب کے لحاظ

سے ترکہ تقسیم ہوگا؟ (ص۶۲) پر حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری مرحوم کے مضمون "محجوب لا ارث" کا حوالہ دے کر مصنف کتابچہ نے اپنا بھانڈا پھوڑ دیا کہ وہ جماعت منکرین حدیث سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرخیل ایک وقت میں حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری تھے جو حدیث کو دین میں حجت نہیں مانتے تھے اور نہ اجماع کے قائل تھے۔ یہ اپنی رائے سے اصول دین کو بدلنا چاہتے تھے ص۶۶ سے ص۷۲ تک علماء کے اعتراضات کا جواب اسی قسم کے خرافات سے دیا گیا ہے کہ قرآن میں متوفی کے لئے اقرب ہونے کی قید ہے وارث کے لئے نہیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق صلبی بیٹوں اور پوتوں میں کوئی فرق نہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں صلبی بیٹے کی بہو خسر پر حرام ہے، تو پوتے کی بہو بھی اسی طرح حرام ہے، ان تمام موشگافیوں کی لغویت ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ ایک کا اقرب ہونا دوسرے کے اقرب ہونے کو مستلزم ہے اور حدیث صحیح متواتر میں اس کو صراحتاً واضح کر دیا گیا ہے وحلائل ابنائکم میں من اصلابکم سے من نسلکم مراد ہے کیونکہ اس سے فقط متبنیٰ کی بیوی کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے ورنہ بطور عموم مجاز کے اسی سے رضاعی بیٹے پوتے کی بیوی بھی بالاجماع حرام ہے تو پوتے کا بیٹے کے برابر صلبی ہونا لازم نہیں آتا ایک بیٹی کے ہوتے ہوئے پوتی اس لئے چھٹا حصہ پاتی ہے کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ اہل فرائض کے لئے نہیں بلکہ عصبات وغیرہ کے لئے ہے بیٹی اور پوتی دونوں اہل فرائض میں سے ہیں اس لئے بیٹی کا نصف حصہ دے کر پوتی کو چھٹا حصہ ثلثین کی تکمیل کے لئے دیا گیا اس سے الاقرب فالاقرب کے اصول پر زد نہیں پڑتی اس لئے اگر دو بیٹیاں ہوں تو پوتی کو کچھ نہیں ملے گا کیوں کہ دو بیٹیوں نے دو تہائی پورا لے لیا ہے اب بیٹیوں کے فریضہ میں سے کچھ باقی نہیں رہا۔ البتہ اگر اس صورت میں پوتی کے ساتھ پوتا یا پڑپوتا بھی موجود ہو تو وہ قریب تر عصبہ ہونے کی وجہ سے باقی کا مستحق ہوگا اور اس کی وجہ سے پوتی بھی عصبہ ہو جائے گی اور ہم بتلا چکے ہیں کہ یہ سب اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں جن پر فقہاء کے اجماع نے قطعیت کی مہر لگا دی ہے فقہاء نے محض اپنی عقل سے یہ اصول نہیں گھڑے یہ منکرین حدیث کی ہی جرأت ہے کہ صلبی بیٹے کے ہوتے ہوئے بھی پوتے کو دادا کا اقرب بنانا اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں حالانکہ حیرت کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتوں اور نواسوں کو محروم کرنے میں ہمارے سارے ہی فقہاء شریک اور یک زبان ہیں (ص۷)

اس پر حیرت وہی کر سکتا ہے جو فقہاء کو اپنے اوپر قیاس کر کے یہ سمجھتا ہے کہ وہ بغیر کسی نص کے یوں ہی اجماع کر لیتے ہیں ہم بتلا چکے ہیں کہ اہل اجماع کے پاس کوئی نص ضرور ہوتی ہے چنانچہ اس مسئلہ نزاعی میں بھی ہم نے چند احادیث متواترہ کی نشاندہی کر دی ہے اور حدیث متواتر اور اجماع قطعی کی مخالفت کرنے والا اگر کافر نہیں تو اہل سنت والجماعت سے خارج تو یقیناً ہے! پھر میں پوچھتا ہوں کہ یتیم پوتے پوتی اور نواسے نواسی ہی کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ مصنف کتابچہ کی بیوی ایسے رئیس کی نواسی تھی جس کے بھائی بھتیجے زندہ تھے اور نواسی ان کے سامنے نانا کی میراث نہ پا سکتی تھی؟ آخر یتیم بھانجے اور بھانجی نے کیا قصور کیا؟ اگر کسی شخص کے بھائی بھتیجے زندہ ہوں اور اس کی بہن اس کے سامنے یتیم بھانجے چھوڑ کر مرگئی ہو ان کو بہن کا حصہ کیوں نہیں دلایا جاتا؟ اگر اس طرح ہر وارث کو اقرب بنایا جائے گا تو اہل فرائض اور عصبات کے بعد ذوالارحام کا باب ہی باقی نہ رہے گا جملہ ذوی الارحام اہل فرائض یا عصبات میں شامل ہو جائیں گے اور اس کا لغو و باطل ہونا ظاہر ہے کہ شریعت اسلامیہ میں سراسر تبدیل و تحریف ہے کہ ایک باب ہی وراثت کا اڑا دیا گیا جس پر امت کا اتفاق واجماع چودہ سو برس سے چلا آرہا ہے اسی کے بارے میں مولانا اصلاحی نے فرمایا تھا کہ جس نظریہ کے تحت کمیشن نے یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ دلانے کی سفارش کی ہے اس سے وہ سارے اصول منہدم ہو جاتے ہیں جو اسلام نے تقسیم ورثہ کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس پر مصنف کا یہ کہنا کہ مولانا نے بلا وجہ دو جگہ اسلام کا نام لیا ہے بہتر ہوتا اگر مولانا اس مسئلہ کی ذمہ داری اسلام پر ڈالنے کا ارتکاب نہ فرماتے بلکہ اس کی ذمہ داری فقہ پر ہی ڈالتے

جو اس ظلم کی ذمہ دار ہے ملا سر اسر الحاد ہے وہ مانتا ہی کہ اس مسئلہ میں سارے ہی فقہا متفق اور یک زبان ہیں اور ہم بتلا چکے ہیں کہ اہل اجماع نے بلا دلیل اجماع کبھی نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ میں تو حدیث صحیح متواتر کی روشنی میں اتفاق کیا ہے اب فقہ یا فقہاء کو ظالم قرار دینا ملحدانہ جرات کے سوا اور کیا ہے ؟ ہم نے مقدمہ اولی میں واضح کر دیا ہے کہ اجماع خود مستقل حجت شرعیہ ہے بعد والوں میں سے کسی کو بنائے اجماع کا علم ہو یا نہ ہو وہ ہرگز اجماع کو رد نہیں کر سکتے بلکہ بعض صورتوں میں اجماع کی مخالفت کفر ہے اور فسق سے تو کسی حال میں خالی نہیں ۔ پس فقہ یا فقہاء کو ظالم کہنے والا اپنے ایمان کی خیر منائے شریعتِ اسلامیہ ان تمام احکام کے مجموعہ کا نام ہے جو کتاب و سُنّت و اجماع امت اور قیاس مجتہدین سے ثابت ہوتے ہیں پس فقہ ، یا فقہاء کی طرف ظلم کو منسوب کرنا شریعتِ اسلامیہ کو ظالم قرار دینا نہیں تو اور کیا ہے ؟ اگر کسی مسئلہ کی حکمت یا علت کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو علماء محققین سے دریافت کرنا چاہیئے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ۔ حجۃ اللہ البالغہ میں باب الفرائض دیکھ لیا جاتا اور کسی محقق سے سمجھ لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ شریعت اسلامیہ میں باب میراث کن اصول پر مبنی ہے مگر آجکل نہ فقہ کو پڑھا جاتا ہے نہ اصول شریعت کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے بس چند تراجم و تفاسیر کا التاسید ھا مطالعہ کر کے ہر شخص دین میں دخل دینا اور فقہا سابقین کے منہ آنا چاہتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون

یتیموں کی مالی امداد کا طریقہ علماء نے فرمایا تھا کہ یتیموں کی مالی امداد اور بہبود کی دوسری باعزت صدہا شکلیں بھی ہیں حکومت انہیں اختیار کر سکتی ہے اس پر اعتراض کیا گیا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے تو ان بدنصیبوں کو محروم تسلیم کر لو پھر دوسرے طریقوں سے اس محرومی کو دھوتے پھرو (صـ۲۳) میں پوچھتا ہوں کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میّت کے تمام قرابت دار یتیموں کو میراث سے حصّہ مل سکتا ہے ؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جن کو محروم کیا جائے گا ۔ ان بدنصیبوں کی محرومی کو کس طرح دھویا جائے گا ؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ بتائے کہ ایک شخص کے یتیم پوتے نواسے پوتیاں نواسیاں بھی ہیں اور یتیم بھانجے بھانجیاں اور خالہ پھوپھی کے یتیم بچے اور بچیاں بھی ہیں ان سب یتیموں کو وہ کس حساب سے میراث کا حصہ دے گا ؟ در اصل اس کو حکومت اسلامیہ کے اصول ہی کی خبر نہیں ۔ حدیث صحیح موجود ہے جس کو اصحاب صحاح نے روایت کیا اور ہر زمانہ میں اُمت نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من ترک مالاً فلورثتہ ومن ترک کلاً او ضیاعاً فعلیّ والیّ ۔ جو شخص مال چھوڑ کر مر جائے وہ تو اس کے ورثہ کا ہے اور جو قرض کا بوجھ یا ضائع ہونے والے (بے سہارے قرابت دار) چھوڑ جاتے ہیں وہ میری ذمہ داری پر ہیں اور میری طرف آئیں ۔

دوسری حدیث میں ہے السلطان ولی من لا ولی لہ، جس کا کوئی ولی نہ ہو سلطان اس کا ولی ہے اسی پر خلفاء راشدین کا برابر عمل رہا ہے کہ تمام یتیموں اور بیواؤں کی پرورش بیت المال سے کی جاتی تھی اسی بیت المال سے جس سے بادشاہ اور وزیر اور قاضی وغیرہ اپنی تنخواہ وصول کرتے تھے اور جب بیت المال میں وسعت ہوتی تو یتیموں کے علاوہ غریب باپ کی زندگی میں بھی اس کے بچوں کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے یہ قانون مقرر کیا تھا کہ دودھ چھوٹنے پر بچہ کا وظیفہ مقرر کیا جائے جب معلوم ہوا کہ بعض لوگ وظیفہ جلدی وصول کرنے کے لئے وقت سے بہت پہلے بچوں کا دودھ چھڑاتے اور ان کو تکلیف دیتے ہیں تو یہ قانون مقرر کر دیا کہ پیدا ہوتے ہی بچہ کا وظیفہ بیت المال سے جاری کر دیا جائے ۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور حکومت میں ہر دن کی صبح کی نماز کے بعد ہر مسجد میں موذن اعلان کرتا تھا کہ جس کسی کے بچہ پیدا ہوا ہو وہ نام لکھوا دے تاکہ بچہ کا وظیفہ مقرر کیا جاوے اگر ممالک اسلامیہ شریعت کے اصول پر عمل پیرا ہوں تو یتیموں کی بدنصیبی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا ، ناداروں اور دوسرے ضرورت مندوں کی مدد کے لئے حکومتِ اسلامیہ کو اپنے بیت المال سے مصارف برداشت کرنے چاہئیں ، اس مقصد کے

کے لئے اصولِ شریعت میں تبدیلی اور تحریف کر کے یتیموں کی مدد نہیں کی جا سکتی، اس کا تو راستہ وہی ہے جو مصنف کتابچہ کے ناناکو خیرخواہوں نے مشورہ دیا تھا یعنی جس شخص کے قریبی رشتہ دار حاجت مند نہ ہوں اور یتیم پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں بھلبے بھانجیاں بے سہارا ہوں حکومت اس کو تاکید کرے کہ ایسے بے سہارے یتیموں کی اپنی زندگی میں بقدرِ ضرورت نگہداشت کرتا رہے اور بعد کے لئے وصیت کر دے کہ تہائی مال ان بے سہارے یتیموں کو دیا جائے۔ اگر اس قسم کا قانون بھی بنا دیا جائے تو علماء کو اعتراض نہ ہوگا کیوں کہ اپنی زندگی میں ہر انسان کو اپنی ملکیت اور جائداد وغیرہ میں جائز تصرف کا حق ہے اور اور قرابت دار یتیموں کا بھی اس پر حق ہے وفی اموالہم حق للسائل والمحروم اور بعد کے لئے تہائی مال میں وصیت کرنے کا بھی اسے حق ہے اور حکومت کو ان حقوق کی تاکید کا بھی حق ہے جب کہ یتیم نادار یا بیوہ عورتیں حکومت کے سامنے درخواست پیش کریں کہ ہمارا دادا یا نانا یا ماموں باوجود مال دار ہونے کے ہماری نگہداشت نہیں کرتا نہ اپنے بعد کے زمانہ کے لئے ہمارا انتظام کرتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم وہو العلیم الحکیم۔

نکاح کا رجسٹریشن

نکاح کی رجسٹری کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یونین کونسلیں نکاح رجسٹرار مقرر کریں گی اور یہ نکاح رجسٹرار ہی پڑھائیں گے اگر نکاح کوئی اور شخص پڑھائے تب بھی ان کو اطلاع دینا اور نکاح کو ان کے ہاں رجسٹری کرانا ضروری ہوگا۔ اگر نکاح کو رجسٹر نہ کرایا گیا تو یہ قابلِ سزا جرم ہوگا اس پر تین مہینہ کی قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ اس پر علماء نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کے جوابات بھی مصنف کتابچہ نے دیئے ہیں مگر اس نے اس بنیادی سوال کا جواب نہیں دیا کہ نکاح امور تشریعیہ کی قسم سے ہے اور انتظامیہ میں سے نہیں ہے اور خلفاء مجتہدین کے سوا دیگر امراء و حکام کو امور تشریعیہ میں دیئے کا حق نہیں نہ ان کی اطاعت لازم ملاحظہ ہو مقدمہ عاشرہ منا۔ رہا یہ کہ نکاح امور تشریعیہ میں سے ہے اس کی دلیل یہ ہو کہ نکاح سنت عبادت موکدہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو میرے دین کو پسند کرے وہ میری سُنّت کا اتباع کرے اور نکاح میری سُنّت ہے اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۵۲) ابونجیح سے روایت ہے جو شخص نکاح کی قدرت رکھتا ہو پھر نکاح نہ کرے وہ مجھ سے نہیں اور یہ مرسل حسن ہے (مجمع الزوائد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں اور عورتوں پر لعنت کی جو کہتے ہیں کہ ہم نکاح نہیں کریں گے اس کو امام احمد نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے (مجمع) طبرانی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے نکاح کر لیا اس نے نصف ایمان کو کامل کر لیا اب وہ باقی نصف میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے (مجمع الفوائد ج ۱ ص ۲۱٦) اور جو چیز نصف ایمان کو مکمل کرنے والی ہو وہ واجب یا سنت موکدہ سے کم نہیں اور اس کا امور تشریعیہ میں داخل ہونا ظاہر ہے بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں جو میری سُنّت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ درمختار میں تصریح ہے کہ شہوت کے وقت نکاح واجب ہے اور حالت اعتدال میں سنت موکدہ ہے جس کے ترک سے گناہگار ہوگا ج ۲ ص ۴۲۷۔ پھر شرعاً نکاح میں سہولت کا مدِ نظر رکھنا ضروری ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ (رواہ احمد والحاکم والبیہقی عن عائشہ رضی اللہ عنہا وصححہ السیوطی فی الجامع الصغیر ج ۱ ص ۲)

"سب سے بڑا بابرکت نکاح وہ ہے جس میں مؤنت (مشقت) کم ہو" پس جہاں تک ہو سکے نکاح میں آسانی اور سہولت کا سامان کرنا چاہیئے تاکہ ہر مسلمان بہ سہولت زنا سے بچ سکے نکاح میں جس قدر دشواریاں پیدا کی جائیں گی اسی قدر زنا کو ترقی ہوگی۔ عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں نکاح (کرنے) میں بس چار آدمیوں کی ضرورت ہے ایک وہ جو اپنی لڑکی کو نکاح میں دیتا ہو

ایک وہ جو نکاح کرتا ہو اور دو گواہ (اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور بیہقی نے روایت کیا ہو اور اس کی سند کو صحیح بتلایا) اس پر زیادتی کرنا اور نکاح خوان رجسٹرار اور رجسٹری کو لازم کرنا اور جو ایسا نہ کرے اس کو مجرم قرار دینا اور سزائے قید یا جرمانہ کا مستحق قرار دینا نکاح کو دشوار بنانا ہے اور نکاح کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے سے شہوانی جذبات کی تحریک کے دروازے کھلتے ہیں۔ موفق ابن قدامہ المغنی فرماتے ہیں اس میں اختلاف ہو کہ نکاح کے دو گواہ عادل ہونے چاہئیں یا فاسق گواہ بھی کافی ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ کے ہاں عادل ہونا ضروری ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک دو فاسقوں کی موجودگی بھی کافی ہے مگر دو مستور الحال گواہ سب کے نزدیک کافی ہیں کیونکہ نکاح گاؤں میں بھی ہوتا ہو اور جنگل میں بھی اور عام لوگ عدالت شرعیہ کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتے تو اس قسم کی قیود سے نکاح میں دشواری ہوگی اس لئے ظاہری حالت کا دیکھ لینا کافی ہے (ج ۷، ص ۳۴۱) آپ نے دیکھا کہ دیگر معاملات میں گواہوں کا واقعی طور پر عادل ہونا ضروری ہے مگر نکاح میں بالاتفاق ظاہر میں عادل ہونا کافی ہے تحقیقِ حال کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تاکہ نکاح میں دشواری نہ ہو اور امام ابوحنیفہ نے تو اس سہولت ہی کی بنا پر دو فاسقوں کی گواہی سے بھی نکاح کو درست مان لیا ہے گو قاضی کی عدالت میں ان کی شہادت سے نکاح ثابت نہ ہو سکے مگر صحت نکاح کے بعد زنا سے تو بچ جائے گا۔ الغرض نکاح ان سہ ضروریہ میں سے ہے بغیر نظام معیشت قائم نہیں ہو سکتا ان کو جہاں تک ہو سکے آسان تر کرنا چاہیئے شریعت نے نکاح اور زنا میں فرق کرنے کے لئے چند قیدیں نکاح میں بڑھا دی ہیں وہی کافی ہیں ان پر زیادتی کرنا کسی طرح درست نہیں۔ شرعاً نکاح خواں کی ضرورت ہے نہ رجسٹری کی بس دو گواہوں کے سامنے عورت یا اس کے ولی اور نکاح کرنے والے مرد کا ایجاب و قبول کافی ہے اس پر رجسٹری فیس کا اضافہ کرنا بے جا پابندی اور زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟ شریعت نے سہولت نکاح کے لئے مہر کی مقدار بہت کم مقرر کی ہے جو فقہاء حنفیہ کے نزدیک دس درہم (یعنی دو تولہ ساڑھے آٹھ ماشہ چاندی) ہے جس کی قیمت چند روز پہلے تین روپیہ ہی کے قریب تھی جو آج کل رجسٹرار نکاح کی فیس ہے اور شافعیہ کے نزدیک کوئی مقدار مقرر نہیں زوجین اپنی رضامندی سے جتنا چاہیں مقرر کرلیں ولو خاتما من حدید چاہے لوہے کی انگوٹھی بھی ہو پھر جن فقہائ نے کم سے کم مہر کی مقدار دس درہم بتائی ہے وہ بھی اس کے فوری ادا کو واجب نہیں کہتے بلکہ مہر معجل اور مؤجل کا اختیار دیتے ہیں ان تمام سہولتوں کو نظر انداز کرکے رجسٹرار نکاح خواں سے نکاح پڑھوانے یا بعد نکاح کے اس کے رجسٹر میں اندراج کرانے اور اس کو تین روپیہ فیس فوری ادا کرنے کا لزوم سہولت کو دشواری سے بدلنا ہے یا نہیں؟ کہا جاتا ہو کہ انتظامی مصالح سے آج بہت سے وہ منصب ضروری سمجھے جاتے ہیں جن کا شریعت اسلامیہ میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اگر انتظامی مصلحت سے نکاح کے لئے بھی ایک منصب نکاح خوان کا وضع کر دیا جائے اس میں کوئی شرعی قباحت لازماً نہیں (ص ۶۷) میں کہتا ہوں امور انتظامیہ کی حد تک ضروری منصب قائم کرنے کا سلاطین و امراء کو اختیار حاصل ہے بشرطیکہ واقعی ضرورت ہو فرضی نہ ہو؟ اور امور تشریعیہ میں ان کو دخل دینے کا یا کوئی ایسا منصب مقرر کرنے کا اختیار نہیں جس سے مقاصد شرعیہ فوت ہوتے ہوں۔ ہم اوپر وضاحت سے بتلا چکے ہیں کہ باب نکاح میں رجسٹرڈ نکاح خواں کے تقرر سے وہ سہولت تشدد سے بدل جاتی ہے جو نکاح کے بارے میں شریعت کو مد نظر ہے اس لئے ایسا منصب مقرر نہیں کرنا چاہئے بلکہ منصب قضا قائم کر دینا چاہیئے جو زمانہ خلفاء راشدین سے برابر چلا آرہا تھا ہندوستان میں انگریز نے اس کو سنہ ۱۸۰۸ء میں بند کیا ہو منصب قضا قائم کر دینے سے تمام عائلی جھگڑوں کے تصفیہ کی شرعی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سہولتیں بھی قائم رہتی ہیں جو نکاح کے باب میں مطلوب و مقصود ہیں!

تعدد ازدواج

اس مسئلہ میں مصنف کتابچہ نے اول تو دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم میں تعدد ازدواج کی صرف ایک جگہ اجازت آئی ہے اور وہ سورۃ النساء کی تیسری آیت ہے (صا۸) تو گویا قرآن کریم میں کسی حکم یا اجازت کا صرف ایک بار آنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اُسے بار بار آنا چاہیئے، یہ کتنی بے دانشی کی بات اور غیر قرآنی فکر ہے، پھر دعویٰ کیا ہے کہ یتامیٰ کے مفہوم میں نابالغ اور بالغ یتیم لڑکے لڑکیاں بالغ اور جوان بلکہ عمر رسیدہ بیوہ عورتیں سب ہی شامل ہیں میں عرض کرتا ہوں کہ کیا اسی ایک آیت میں یا تمام آیات میں جو یتامیٰ کے متعلق ہیں؟ پہلی صورت میں تخصیص کی دلیل کیا ہے۔

دوسری صورت میں وابتلوا الیتامیٰ حتےٰ اذا بلغوا النکاح اور "وبدارا ان یکبروا" اس دعویٰ کو باطل کر رہا ہے۔ اور آیت نساء کا ترجمہ یوں کیا ہے "اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم جوان یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو مذکورہ عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہو نکاح کر لو دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے"۔

(جواب) یہ کونسی منطق ہے کہ جن کے بارے میں انصاف نہ کرنے کا اندیشہ ہو ان ہی میں سے چار تک نکاح کر لو اس طرح بے انصافی کا احتمال قوی ہوگا یا زائل؟ اس آیت میں یتیم جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ اگر ان کے ساتھ (نکاح کئے بغیر) کسی اور طرح کا عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکے تو پھر اس کی اجازت ہے کہ ان یتیم جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان میں سے دو دو تین تین چار چار کو اپنے نکاح میں لے آؤ۔ الخ راقم الحروف عرض پرداز ہے کہ مولانا حکیم الامۃ تھانوی نے اس آیت کے ترجمہ میں لفظ "اور" کا اضافہ کیا تھا جس کی دلیل بھی حدیث عائشہؓ میں موجود ہے اس کو تو یہ کہہ کر تم نے رد کر دیا کہ قرآن کریم میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جس کا ترجمہ "اور" کے لفظ سے کیا جائے مگر خود جو بریکٹ میں (نکاح کئے بغیر) بڑھایا ہے ہو یہ قرآن کے کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ اذا فات الشرط فات المشروط جب شرط ہی نہ پائی جائے تو مشروط بھی نہیں پایا جا سکتا قرآن کریم نے تعدد ازدواج کو اس شرط کے تحت مشروط کیا ہے "تمہارے معاشرہ میں یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ انصاف اور عدل کا سلوک نہ ہو سکنے کا اندیشہ ہو جائے۔ (صا۸۸)

(جواب) اس میں "تمہارے معاشرہ" قرآن کے کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ "ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ آیا آج معاشرہ میں یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کا کوئی پیچیدہ سوال درپیش ہے یا نہیں صا۸۸"

(جواب) پہلے معاشرہ کی قید کو قرآن سے ثابت کرو پھر سوال کرو اپنی طرف سے بلا دلیل قرآن میں قیدیں بڑھا کر معاشرہ کا سوال کھڑا کر دینا سراسر تحریف اور تفسیر بالرائے نہیں تو اور کیا ہے؟ "وہ ہمارے اسلاف مجاہد تھے تن آسان نہیں تھے انکے دور میں یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کا لاینحل مسئلہ موجود تھا۔ ۔ ۔ ۔ مگر ہم اس درجہ کے مسلمان نہیں رہے جیسے ہمارے اسلاف تھے ہم جہاد سے کنارہ کش ہو کر رہ گئے ہیں اس لئے ہمارے معاشرہ میں وہ سوال ہی باقی نہیں رہا اس لئے ہم اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے" صا۱۰۴

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ یہاں بھی وہی سوال ہے کہ قرآن میں معاشرہ کا یا کثرت یتامیٰ اور بیوگان کا ذکر ہی کہاں ہے؟ جو طبقہ حدیث کا منکر ہے وہ قرآن میں اسی طرح کی قیدیں بڑھا بڑھا کر اپنا اُلو سیدھا کیا کرتا ہے اور لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے کہ قرآن سے یہ مسئلہ ثابت ہو رہا ہے؟ یہ تو اجمالی جواب تھا اب تفصیل سنئے مصنف کتابچہ نے دعویٰ کیا ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت قرآن میں صرف ایک جگہ آئی ہے (الخ) یہ عنوان غلط ہے اُس کو یہ کہنا چاہیئے کہ تعدد ازدواج کی تحدید قرآن میں صرف ایک جگہ آئی ہے

ورنہ اجازت بصیغہ عموم تو اور جگہ بھی موجود ہے۔ سورۃ النساء ہی میں محرمات کے ذکر کے بعد فرمایا ہی واحل لکم ماوراء ذالکم ان تبتغوا باموالکم اور تمہارے واسطے ان کے سوا سب عورتیں حلال ہیں کہ ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ طلب کرو" چوں کہ اس میں کوئی تحدید نہیں بلکہ عموم کی وجہ سے چار سے زیادہ کی اباحت بھی مفہوم ہو رہی ہے اس سے مفسرین کو تصریح کرنا پڑی کہ ماوراء ذالکم کے عموم سے ما فوق الاربع چار سے زیادہ کو مستثنیٰ کیا جائے گا (المظہری ج ۲ صفحہ ۶۶) اس طرح سورۂ مائدہ کی آیت الیوم احل لکم الطیبٰت وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنٰت من المومنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم اذا اتیتموھن اجورھن۔ (الایۃ) آج تمہارے لئے سب پاکیزہ (اچھی) چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے (تو تم ان کو اپنا کھانا کھلا سکتے ہو) اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور پاک دامن اہل کتاب کی عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں جب کہ ان کو مہر ادا کر دو" یہاں بھی والمحصنٰت جمع کا صیغہ الف لام کے ساتھ لایا گیا ہے جو عموم یا استغراق کو مقتضی ہے اس لئے مفسرین کو یہاں بھی کہنا... پڑا کہ اس عموم سے وہ محرمات مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور چار سے زیادہ نکاح بھی مستثنیٰ ہے کیوں کہ سورۃ النساء میں تحدید نازل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوا کہ سورۂ نساء کی تیسری آیت جواز تعداد ازدواج کے متعلق نہیں ہے بلکہ تحدید ازدواج کے متعلق ہے جواز کے لئے تو دوسری آیتیں بھی موجود ہیں۔ جہاں نہ یتیموں کا ذکر ہے نہ بیوہ عورتوں کا نہ وہاں معاشرہ کا سوال کھڑا کیا جا سکتا ہے نیز حدیث میں ہے کہ سعید بن جبیرؓ سے عبداللہ بن عباسؓ نے پوچھا تم نے نکاح کیا ہے؟ کہا نہیں فرمایا نکاح کر تو فان خیر ھذہ الامۃ اکثرھا النساء کہ اس امت میں اچھا وہی ہے جس کی بیویاں زیادہ ہوں اس کو امام بخاری ج ۲ صفحہ ۷۵۸ وغیرہ نے روایت کیا ہے اور کسی عمل کی فضیلت صحابی اپنی رائے سے نہیں بیان کر سکتا اس لئے یہ حدیث موقوف بحکم مرفوع ہے۔

پھر دعویٰ کیا ہے کہ یتیم کے مفہوم میں نابالغ اور بالغ یتیم لڑکے لڑکیاں اور جوان بلکہ عمر رسیدہ بیوہ عورتیں سب ہی شامل ہیں اور جصاص کے اقوال سے اس کو ثابت کیا ہے۔ مگر جصاص نے اس کے بعد متصلاً یہ بھی تو فرمایا ہے۔ وقد روی علی ابن ابی طالب وجابر بن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایتیم بعد حلم حضرت علیؓ اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ بلوغ کے بعد یتیمی نہیں۔ وھذا ھو الحقیقۃ فی الیتیم وبعد البلوغ یسمی یتیماً مجازاً۔ یتیمی کے حقیقی معنے یہی ہیں بلوغ کے بعد کسی یتیم کو یتیم کہنا مجاز ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے ج ۲ صفحہ ۴ معنی اللغوی کے اعتبار سے یتیم کا اطلاق بالغ نابالغ دونوں پر ہو سکتا ہے لیکن عرف میں نابالغوں ہی کو یتیم کہا جاتا ہے (اور یہی شرعی معنی ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلوغ کے بعد یتیمی نہیں اس کو ابو داؤد نے حضرت علیؓ سے بسند حسن روایت کیا ہے پس یہ دعویٰ غلط ہے کہ یتامیٰ کا مفہوم عربی زبان میں وہ تو قطعاً نہیں جو ہمارے ہاں اردو زبان میں رائج ہے (صفحہ ۸۴) بلکہ عربی کا عرف بھی وہی ہے جو اردو کا ہے اور شرعی عرف بھی یہی ہے پھر اسی سورت میں کی دوسری آیت میں واتوا الیتامیٰ اموالھم آیا ہے کہ یتیموں کو انکے مال دے دو۔ یہاں نابالغ لڑکے اور لڑکیاں ہی مراد ہیں بالغ یا جوان بیوہ عورتیں مراد نہیں۔ خود جصاص رازی نے تصریح کی ہے کہ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ یتیمی کی حالت ہی میں مال انکے حوالے کر دو کیونکہ دوسری آیت میں آگے آرہا ہے کہ یتیموں کو آزما کر صلاحیت دیکھ کر مال دینا چاہئیے (الخ ج ۲ صفحہ ۵۰) معلوم ہوا کہ یتامیٰ سے مراد نابالغ ہیں پھر اس کے بعد ہی سلسلہ کلام میں وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح موجود ہے کہ یتیموں کو نکاح سے پہلے آزماتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل ہو جائیں اور تم ان میں صلاحیت کے آثار دیکھو تو مال ان کے حوالہ کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہاں یتامیٰ سے نابالغ لڑکے اور لڑکیاں ہی مراد ہیں جن کے باپ نہ ہوں۔ یہاں بالغ یتیم ہرگز مراد نہیں نہ بیوہ عورتوں کا احتمال پھر تیسری آیت ہی میں یتامیٰ سے بالغ و نابالغ یتیم لڑکے لڑکیاں اور جوان بیوہ عورتیں مراد لینے کی کوئی وجہ؟

پھر مصنف کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسی تیسری آیت سے امام جصاص رازی نے باب تزویج الصغار قائم کر کے نابالغ لڑکیوں کے جواز نکاح پر استدلال کیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی جصاص نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضؓ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت ہی صحیح اور راجح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان یتیم نابالغ لڑکیوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو ایسے اولیاء کی نگرانی میں تھیں جن کے لئے ان لڑکیوں سے نکاح کر لینا جائز تھا اور وہ معمولی مہر میں ان سے نکاح کر لیتے تھے آیت میں اس سے منع کیا گیا کہ ایسی حالت میں یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کرو ان کے ساتھ انصاف کرو ورنہ دوسری عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہارے ہاتھ تلے نہ ہوں۔ پھر حیاء و شرم کو بالائے طاق رکھ کر آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے "اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم جوان یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو مذکورہ عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو (الخ) اور اس ترجمہ کو اصولاً صحیح بتلایا ہے مگر جس شخص کو زبان عربی فصیح سے کچھ بھی واقفیت ہو وہ اس ترجمہ کو مترجم کے منہ پر دے مارے گا اولاً اس لئے کہ اس نے ان لا تقسطوا سے یتیموں بیواؤں کی خبر گیری اور کفالت نہ ہو سکنا مراد لیا ہے (صـ۸۸) اس کو محاورہ عرب میں بے انصافی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اس صورت میں عبارت اس طرح ہوتی فان خفتم ان لا تتعہدوا الیتامیٰ دوسرے اگر نساء سے مذکورہ عورتیں مراد ہوتیں تو فانکحوا ما طاب لکم منہن فرمایا جاتا لفظ الیتامیٰ کی جگہ ضمیر نہ لانا دوسرا لفظ لانا کیا بے کار ہی ہے؟ اور یہ ایک ہی کہی کہ لفظ نساء پر الف لام تعریف کا آرہا ہے (الخ) عقلمند کو اتنی بھی خبر نہیں کہ جمع پر الف لام سے جنس یا استغراق مُراد ہوتا ہے خاص افراد مراد نہیں ہوتے۔ اگر آیت میں اس کے بعد مثنیٰ وثلث ورباع نہ ہوتا تو یہی لفظ النساء لامحدود نکاحوں کے جواز کو ثابت کر دیتا۔ اوپر سے یتیموں کے حقوق مالیہ کا ذکر آرہا ہے کہ ان کے اموال میں گڑبڑ نہ کرو ان کے اموال دیتے رہو (یعنی بلوغ سے پہلے ان پر خرچ کرتے رہو اور بالغ ہونے پر اُن کے حوالے کر دو) ان کے اچھے اموال سے .... اپنے خراب مال کو نہ بدلو۔ بڑا گناہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس آیت میں یہ قید نہیں ہے کہ معاشرہ میں یتیموں یا بیواؤں کی کثرت ہو اور وہ معاشرہ کا لاینحل پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہو بلکہ عام حکم ہے خواہ یتیم دو چار ہوں یا سو دو سو یتیموں کے اموال میں گڑبڑ کرنا کسی حال میں جائز نہیں انہی حقوق مالیہ کا ذکر اس تیسری آیت میں ہے کہ بعض اولیاء اپنے ہاتھ تلے کی یتیم نابالغ لڑکیوں سے معمولی مہر پر نکاح کر لیتے پورا مہر نہ دیتے تھے اس پر تنبیہ کی گئی کہ اگر یتیم لڑکیوں سے بے انصافی کا احتمال ہو کہ (ان کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا ولی کے سوا کوئی نہیں ہوتا اور ولی خود ہی اس سے نکاح کر رہا ہے اور اپنے ہاتھ تلے ہونے کی وجہ سے پورے انصاف کی اس کو امید نہیں) تو ان سے نکاح نہ کرو اور عورتوں میں سے جو پسند ہوں ان سے نکاح کر لو۔ دُو دو تین تین چار چار تک۔ مصنف کتابچہ نے جو ترجمہ کیا ہے عربیت کے لحاظ سے غلط ہونے کے علاوہ اس میں یہ بھی خرابی ہے کہ اس تیسری آیت کا تعلق یتیموں کے حقوق مالیہ سے باقی نہیں رہتا حالانکہ اس سے اوپر دوسری آیت میں اور اس کے بعد چھٹی آیت لہ ولا توتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیامًا وارزقوہم فیہا واکسوہم وقولوا لہم قولا معروفا اور ساتویں آیت وابتلوا الیتامیٰ حتےٰ اذا بلغوا النکاح فان آنستم منہم رشدًا فادفعوا الیہم اموالہم ولا تاکلوہا اسرافًا وبدارًا ان یکبروا (الخ) میں بھی صراحۃً حقوق اموال کا ذکر ہے پھر اس تیسری آیت کو حقوق اموال سے الگ کر کے ایسی خاص حالت پر محمول کرنا کہ معاشرے میں یتیم لڑکیوں کا ایسا کوئی پیچیدہ سوال در پیش ہو کہ ان کی خبر گیری اور کفالت کی کوئی صورت نہ ہو ایجاد بندہ کے سوا اور کیا ہی؟ پھر اگر اس آیت کو معاشرہ کی خاص حالت پر محمول کیا جائے گا تو یتامیٰ کے بارے میں جتنے احکام یہاں مذکور ہیں سب کو اسی خاص حالت پر محمول کرنا ہوگا

لہ بیوقوفوں کے حوالے اپنے مال نہ کرو جس کو اللہ نے تمہاری زندگی کے بقا کا ذریعہ بنایا ہے اُن میں سے اُن کو کھلاتے پہناتے رہو اور اُن سے اچھی بات کہتے رہو اور یتیموں کو آزماتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل ہو جائیں تو اگر تم اُن میں سمجھ (اور سلیقہ) پاؤ، تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو، اور تم اُن کے مالوں کو مسرفانہ طور پر نہ اُڑاؤ۔

کہ جب معاشرہ میں یتیموں کا مسئلہ پیچیدہ ہو تو ان کے مال ان کو دے دیا کرو اور بڑے ہونے سے پہلے ان کے مال میں فضول خرچی نہ کیا کرو ورنہ سب کچھ کر لیا کرو اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت وان خفتم ان لاتقسطوا فی الیتامیٰ میں بھی یتیموں کے مالی حقوق کا ذکر ہے ان کی خبر گیری یا کفالت کا کوئی ذکر نہیں اگر کسی کو ہمت ہو تو وہ سلف میں سے کسی کا قول دکھلائے جس نے اس آیت کو معاشرہ کی خاص حالت پر محمول کیا ہو اگر ایسا نہیں تو صرف اس لئے کہ یہاں یتامیٰ کا ذکر آگیا ہے آیت کو معاشرہ کی خاص حالت پر محمول کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آیت وضوء میں فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الخ (جب نماز کو کھڑے ہو تو منہ ہاتھ پیر کو دھو لیا کرو سر کا مسح کر لیا کرو) کو معاشرہ کی خاص حالت پر محمول کرنے لگے کہ عرب کے بدوؤں کو صفائی کا اہتمام نہ تھا اس لئے وضو کا حکم دیا گیا اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے پس آیت کا صحیح ترجمہ وہی ہے جو حکیم الامۃ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے قرآن میں بجائے فانکحوا ماطاب لکم منھن کے من النساء فرمانا خود اس کی دلیل ہے کہ اور عورتوں سے نکاح مراد ہے مذکورہ یتیموں سے نہیں مصنف کتابچہ کو تسلیم ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت کی وجہ سے مفسرین اور مترجمین نے ترجمہ میں لفظ اور کا اضافہ کیا ہے (ص ۸۶) تو اس اجماعی تفسیر و ترجمہ کے بدلنے سے کیا حق ہے؟ جب کہ عربی زبان۔ اس کے محاورات۔ اور علوم قرآن اور علوم حدیث اور اصول شریعت سے مصنف کو واقفیت نہیں، اور اس جہل و بے خبری پر قرآن فہمی اور عربی دانی کے کیا دعوے ہیں؟

کہا گیا ہے کہ اس آیت میں یتیم جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ اگر ان کے ساتھ (بغیر نکاح کئے) کسی اور طرح عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکے تو پھر اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ ان یتیم جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں ان میں سے دو دو تین تین چار چار اپنے نکاح میں لے آؤ (ص ۸۸) ہم بتلا چکے ہیں کہ یہاں جوان یتیم لڑکیوں یا بیوہ عورتوں کا بالکل ذکر نہیں یہاں صرف نابالغ یتیم لڑکیوں کا ذکر ہے یہی سبب مفسرین و مترجمین نے اس سے سمجھا ہے اور یہی حضرت عائشہؓ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے اور یہی آیت کے سیاق و سباق سے مفہوم ہو رہا ہے احکام القرآن جصاص رازی میں ہے کہ "اگر کوئی یہ کہے کہ یہ آیت بالغ عورتوں کے بارے میں ہے نابالغوں کے بارے میں نہیں تو ہم کہیں گے کہ دو وجہ سے یہ دعویٰ غلط ہے ایک یہ کہ آیت وان خفتم ان لاتقسطوا فی الیتامیٰ میں لفظ یتامیٰ کا حقیقی مصداق نابالغ یتیم ہی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لایتم بعد الحلم بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں رہتی اور کلام کو حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرنا بلا دلیل جائز نہیں اور بالغ عورت کو مجازاً یتیمہ کہہ دیا جاتا ہے دوسرے حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے وہ بالغ عورتوں کے حق میں صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ بالغہ اگر مہر خاندانی سے کم پر راضی ہو جائے تو نکاح جائز ہے اور کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں پس ثابت ہو گیا کہ آیت (وان خفتم ان لاتقسطوا فی الیتامیٰ) میں یتامیٰ سے مراد نابالغ یتیم لڑکیاں ہیں جن سے معمولی مہر پر ولی نکاح کرتا ہے جس کی پرورش میں وہ ہیں (ج ۲ ص ۶۳) اس پر آپ نے بریکٹ میں جو (نکاح کئے بغیر) بڑھایا ہے قرآن کے کس لفظ سے یہ قید مفہوم ہو رہی ہے؟ یہ حال ہے منکرین حدیث کا کہ تمام مفسرین و مترجمین نے حضرت عائشہؓ و ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث کی بنا پر ترجمہ میں لفظ "اور" بڑھا دیا تھا وہ تو غلط ہو گیا اور یہ خود بلا دلیل "نکاح کئے بغیر" کی قید بڑھا رہے ہیں، وہ صحیح ہے؟ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت!

حضرت عائشہؓ کی روایت

پھر حضرت عائشہؓ کی حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ شان نزول کا حاصل یہ ہے کہ معاشرہ میں یتیم اور بیوہ عورتوں کا سوال پیدا ہو جانے کے بعد یہ معاشرہ کا سوال تمہاری خود کی ایجاد ہے حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ایسی صورتیں عموماً پیش آتی تھیں یہ بھی حدیث میں نہیں کہ جن کی کفالت میں ایسی یتیم لڑکیاں

اور بیوہ عورتیں، بیوہ عورتوں کا بھی حدیث میں کوئی ذکر نہیں یتامیٰ اپنی حقیقت عرفیہ و شرعیہ میں استعمال ہوا ہے جو اس جگہ صرف نابالغ یتیم لڑکیوں پر ہی صادق آتا ہے جو مال دار ہوتی تھیں اور باوجود ان کی طرف رغبت نہ ہونے کے محض ان کے اموال پر قبضہ جمانے کی خاطر ان سے نکاح کر لیا کرتے تھے مگر ازدواجی مراسم ادا نہیں کرتے تھے اور نہ ان کا مناسب مہر ادا کرتے تھے ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ان بیوہ اور یتیم عورتوں کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں تھی (میں کہہ چکا ہوں کہ یہاں معاشرہ کے کسی پیچیدہ سوال کے حل کا کوئی ذکر نہیں صرف یتیموں کو مالی نقصان پہنچانے سے روکنا مقصود ہے کہ اس صورت میں یتیم لڑکیوں کو مہر کم دیا جاتا تھا اس سے روکا گیا ہے) اس کے بعد دعویٰ کیا گیا ہے کہ شان نزول کا اعتبار نہیں ہوتا علماء اصول کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ العبرة لعموم الالفاظ لالخصوص المورد یعنی اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خصوصی شان نزول کا نہیں ہوتا لہٰذا یہاں شان نزول کا سہارا لینا خود اصول فقہ کے مسلمات کے بھی خلاف ہے اس شان نزول سے قطع نظر کرکے قرآن کریم کے الفاظ پر غور کرنا ہوگا۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اصول فقہ کو کسی نے پڑھ کر یاد بھی رکھا ہو تو وہ ہرگز ایسی بے تکی بات نہیں کہہ سکتا اعتبار کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شان نزول سے قطع نظر کر لینا جائز ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن کے الفاظ عام ہوں تو حکم کو مورد نزول کے ساتھ خاص نہ کیا جائے گا بلکہ مورد نزول کے ساتھ دوسرے افراد کو بھی حکم شامل ہوگا۔ مقدمہ رابعہ میں ہم نے بتلا دیا ہے کہ جو صحابی بزمانۂ نزول وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں موجود ہو اگر وہ اس وحی کی تفسیر یا شان نزول بیان کرے تو اس کا قول حدیث مرفوع کے حکم میں ہے (یعنی قول رسول اللہ صلعم شمار ہوگا) امام جصاص رازی نے بھی اس کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ تم نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی تفسیر کو سعید بن جبیر وغیرہ کی تفسیر پر ترجیح کیسے دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ان حضرات کے اقوال میں کچھ منافات نہیں سب کو جمع کیا جا سکتا ہے پھر ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ فرماتے ہیں کہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی اور یہ بات وہ اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتے بلکہ توقیف ہی سے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی کہہ سکتے ہیں پھر وہ سب نزول اور واقعہ بھی بیان کر رہے ہیں اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت سے سہارا لینا ضروری ہے اور اس کو کسی طرح چھوڑا نہیں جا سکتا، کیونکہ صحابی شاہد نزول کا قول بحکم قول رسولؐ ہے رہا یہ کہنا کہ لیکن اس شان نزول سے یہ بات تو کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتی کہ عام حالات میں بھی ایک سے زیادہ شادیاں کی جا سکتی ہیں جب کہ تعدد ازدواج کا حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ معاشرہ میں یتیم اور بیوہ لڑکیوں کا کوئی مسئلہ موجود ہو اور انکے ساتھ اس کے بغیر عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکتا ہو کہ لوگوں کو تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے (ص ۹۲) "عورت کا عائلی مقام" کے مصنف کا یہ فرمانا بناء الفاسد علی الفاسد ہے یہاں نہ معاشرہ میں یتیم اور بیوہ لڑکیوں کا کوئی مسئلہ موجود ہونے پر اشارہ ہے نہ اس پر کہ جب انکے ساتھ نکاح کئے بغیر عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکے۔ یہاں تو صرف یتیموں کے مال میں گڑ بڑ کرنے اور یتیم لڑکیوں کا مہر کم کرکے مالی نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا ہے چونکہ یتیم دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے ان کے اموال کو جاہلیت میں بھی خرد برد کیا جاتا تھا اور آج بھی کیا جا رہا ہے اسی سے روکنا مقصود ہے خواہ مخواہ معاشرہ میں یتیم اور بیوہ لڑکیوں کا مسئلہ ٹھہرا کر لینا اور ان سے نکاح کئے بغیر اس مسئلہ کا حل نہ ہو سکنا ایجاد بندہ ہے اور کچھ نہیں قرآن کے الفاظ پر غور کرنے سے ہرگز یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا نہ آج تک کوئی مفسر اور مترجم سمجھا تفسیر بالرائے اسی کا نام ہے۔ آیت کا مطلب صاف ہے کہ اگر تم کو یتیم لڑکیوں کے ساتھ (اس لئے کہ وہ تمہاری پرورش میں ہیں) بے انصافی کا احتمال بھی ہو تو ان سے نکاح نہ کرو اور عورتوں سے اپنی پسند کے موافق نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار تک۔ اس میں

یہ کہنا کہ اسی آیت میں فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ کے اندر جو ایک سطر بعد آرہا ہے شرط کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ اگر نا انصافی کا اندیشہ ہو تو پھر ایک ہی بیوی کرو اور ایک سطر پہلے وہی لفظ وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامیٰ آجاتا ہے تو آپ اس شرط کو بالکل ہی لغو اور بے اثر قرار دے دیتے ہیں (ص۹۳) بالکل غلط ہے جو مطلب آیت کا حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ نے بیان فرمایا ہے اور بے انصافی کی صورت انھوں نے بیان کی ہے اس کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ جس ولی کے قبضہ میں کوئی یتیم لڑکی ایسی ہو جس سے شرعاً اس کا نکاح جائز ہو وہ اسی وقت اس سے نکاح کر سکتا ہے جب کہ مہر پورا دے اور حسن معاشرت کے حقوق اچھی طرح ادا کرے اگر اس میں کوتاہی کا احتمال بھی ہو تو یتیمہ سے ہرگز نکاح نہ کرے بلکہ اور عورتوں سے نکاح کرے۔ کہئے فان خفتم ان لا تقسطوا میں شرط کا کس نے انکار کیا؟ ہاں تم جو آیت میں اپنی طرف سے معاشرہ کا پیچیدہ سوال کھڑا کر رہے ہو اور اس کے ساتھ ہی .... تعدد ازدواج کو مشروط کر رہے ہو اس کا البتہ انکار کیا جا رہا ہے کیوں یہ سب ایجاد بندہ ہے۔ جس پر نہ قرآن کے الفاظ میں اشارہ ہے نہ مفسرین صحابہ کے کلام میں۔ اس کے بعد دو صفحہ تک ان آیات کو پیش کرنا جن میں فان خفتم کا لفظ آگیا ہے اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہر جگہ فقہاء نے شرط کو ملحوظ رکھا ہے مگر فان خفتم ان لا تقسطوا میں ملحوظ نہیں رکھا۔ ابلہ فریبی کے سوا کچھ نہیں ہم بتلا چکے ہیں کہ یہاں بھی مفسرین صحابہ کی تفسیر کے مطابق شرط کا پورا لحاظ رکھا گیا ہی۔ اب دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کچھ بھی خدا کا خوف دل میں ہے تو قرآن کی آیتوں میں اپنی طرف سے گڑھ گڑھ کر معاشرہ کا سوال پیدا نہ کرو صحابہؓ کی تفسیر مانو اور اسی کے موافق آیت کی تفسیر کرو تفسیر بالرائے سے توبہ کرو کہ یہ سراسر زندقہ اور الحاد ہے۔

آخر میں اس پر بھی تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ اذا فات الشرط فات المشروط منطقی قاعدہ ہے فقہاء کا مسلمہ قاعدہ نہیں ہے اگر مصنف کتاب نے اصول فقہ کو پڑھ کر بھلایا نہ ہوتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ جب نص میں کوئی حکم شرط یا قید کے ساتھ مشروط یا مقید ہو تو شرط یا قید کے فوت ہونے سے حکم بھی منتفی ہو جائے گا یا نہیں؟ حنفیہ کا مذہب اس باب میں یہ ہے کہ وجود شرط کی صورت میں تو حکم ثابت ہوگا مگر شرط کے فوت ہونے سے حکم کا انتفاء لازم نہیں قرآن میں ہے واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا۔ اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کرو اگر تم کو کفار کی طرف سے فتنہ کا اندیشہ ہو۔ اگر انتفاء شرط انتفاء حکم کو مستلزم ہوتا تو امن وامان کی حالت میں مسافر کو قصر جائز نہ ہوتا حالانکہ بالاتفاق حالت امن میں بھی مسافر کو قصر جائز یا واجب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں قصر کیا ہی حالانکہ اس وقت مکہ میں کوئی کافر نہ تھا پورا امن وامان تھا اور اسی جگہ فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ (اور اگر تم کو بیویوں میں بے انصافی کا خوف تو بس ایک ہی سے نکاح کرو) میں اگر انتفاء شرط سے انتفاء مشروط کو لازم کہا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص کو چند بیویوں میں بے انصافی کا اندیشہ نہ ہو اس کو ایک عورت سے نکاح جائز نہیں بلکہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے چاہئیں اور فقہاء اس طرف گئے بھی ہیں کہ اسلام میں اصل حکم تعدد ازدواج ہے ایک نکاح پر اکتفاء کرنا خاص حالت میں ہے جب دو تین میں عدل نہ کر سکے ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ج ۲ ص۹۔ مصنف کتابچہ کے نزدیک جواز تعدد ازدواج اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ یتیموں بیواؤں کا مسئلہ معاشرہ میں موجود ہو۔ اور بغیر تعدد ازدواج کے حل نہ ہو سکے اس پر علاوہ اس اعتراض کے کہ معاشرہ میں یتیموں بیواؤں کا مسئلہ موجود ہونے اور بغیر تعدد ازدواج کے حل نہ ہو سکنے پر قرآن کا کوئی لفظ دال نہیں اور قرآن میں اس کا اضافہ غلط ہے دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس شرط سے یہ کیوں کر لازم آیا کہ معاشرہ میں ایسا مسئلہ موجود نہ ہو تو تعدد ازدواج حرام ہے اس کے لئے مستقل دلیل کی ضرورت ہے آیت کا حاصل اس صورت میں یہ ہوگا کہ وجود شرط کی حالت میں تو تعدد

ازدواج یقیناً جائز ہے اگر شرط فوت ہو تو آیت اس کے حکم سے ساکت ہے اور عمل سلف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعدد ازدواج پر ہر حالت میں عمل کیا ہے خواہ معاشرہ میں یتیم اور بیوہ عورتوں کا مسئلہ درپیش ہو یا نہ ہو۔ اسی کو چودہ علماء نے اس عنوان سے بیان کیا تھا کہ قرآن جن انبیاء کو خدا کے مقرر کردہ امام اور پیشوا اور مقتدا قرار دیتا ہے ان میں سے بیشتر تعدد ازدواج پر عامل تھے خود سرور انبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد بیویاں تھیں پھر آپ کے چاروں خلفاء بیشتر صحابہ اکثر ائمہ اہل بیت اور اسلامی تاریخ کے بیشتر اکابر جن پر مسلمانوں کو فخر ہے بیک وقت متعدد بیویاں رکھتے تھے ان میں سے کس کس کے متعلق آخر آپ ثابت کریں گے کہ ان کو ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی سخت ضرورت تھی۔ (اس کو مصنف کتاب کا اسلاف کی آڑ لینا اور جذبات سے کام لینا قرار دیتا اور اس کے جواب میں جہاد کی بہت سی آیتیں نقل کرکے دعویٰ کرتا ہے کہ جس قوم کا کیریکٹر ہی یہ رہا ہو کہ برابر جہاد کرتی ہو اس پر کبھی ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ اس کا معاشرہ یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے سوال سے خالی ہو جاتے اب دو سو سال سے ہم ضرور ایسی صورت حال سے دوچار ہیں کہ اللہ کی راہ میں جہاد تو درکنار کسی دنیوی غرض یا ملک گیری کی ہوس[1] یا خانہ جنگی کی خواہش کے تحت بھی ہمیں جنگ و جدال سے کوئی سروکار نہیں رہا اب ہمارے ہاں وہ مسئلہ ہی نہیں جس کے لئے اس کی اجازت دی گئی تھی الخ صنا۱۰ و ۱۰۱

اس تطویل لاطائل کا جواب ہمارے بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ آیت فان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ میں نہ جہاد کا کوئی ذکر ہے نہ معاشرہ میں یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کا مسئلہ پیدا ہونے سے کوئی تعرض۔ اس آیت سے پہلے بھی اور پیچھے بھی یتیموں کے اموال کی حفاظت کا حکم اور ان کو مالی نقصان پہنچانے سے ممانعت مقصود ہے اس حکم کو معاشرہ کی خاص صورت حال پر محمول کرنا نہ قرآن کے الفاظ سے موافقت کرتا ہے نہ عمل سلف سے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے تو کسی حکم میں شرط کے ذکر کا یہ مطلب نہیں .... ہوتا کہ شرط نہ ہو تو حکم بھی باقی نہیں رہے گا اس کے لئے مستقل دلیل کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلہ میں چودہ علماء کرام نے وزیر قانون پر ایک اعتراض کیا تھا کہ " وہ فرماتے ہیں کہ تعدد ازدواج پر وہ اس لئے پابندیاں عائد کر رہے ہیں کہ لوگ اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھا کر ایک سے زائد بیویاں کر لیتے ہیں اور عدل کی شرط کو پورا نہیں کرتے " اس سلسلہ میں ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عدل کا سوال نکاح سے پہلے پیدا ہوتا ہے یا نکاح کے بعد؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال ایک سے زائد نکاح کر لینے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے کہ آیا شوہر نے عدل کیا ہے یا نہیں وجہ شکایت قرآن کی رو سے جائز طور پر صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ شوہر نے عدل نہ کیا ہو اور اس وقت اس بیوی کو جس کے ساتھ عدل نہ ہو رہا ہو یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے کہ یا تو اس کے ساتھ عدل کیا جائے یا شوہر صرف ایک بیوی رکھے۔ قرآن کا نام لے کر اس کے منشاء کو پورا کرنے کی یہ شکل قرآن کے کس لفظ یا اشارے سے یا فحوی سے اخذ کی گئی ہے کہ نکاح سے پہلے شوہر اپنی موجودہ بیوی سے رضامندی حاصل کرے اور ایک پنچایت کو اپنی ضرورت کا اطمینان دلائے (صنا۱۱) اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ آیت فان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ میں اولیاء کو یتیم لڑکیوں سے کم مہر پر (یا بے رغبتی کے ساتھ) نکاح کرنے سے روک کر جو دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کے لئے کہا گیا ہے اس میں قرآن نے دو قیدیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی پسند کے موافق عورتوں کا انتخاب کریں (اسی لئے نکاح سے پہلے منکوحہ کو کسی طرح دیکھ لینا مستحب ہے) دوسرے یہ کہ منکوحہ چار سے زیادہ نہ ہوں اس پر پہلی بیوی کی رضامندی اور پنچایت کو مطمئن کرنے کی شرط بڑھانا قرآن پر زیادتی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک تو حدیث خبر واحد سے بھی نص پر زیادت جائز نہیں قیاس و رائے تو کس شمار میں ہیں؟ اس پر مصنف کتابچہ کا یہ کہنا کہ... اعتراض کا حاصل یہ ہوا کہ احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کی جا سکتیں مجرم کو جرم کے ارتکاب سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے پھر کرفیو اور لائسنس وغیرہ کی مثالیں

---

[1] سبحان اللہ! کیا منطق ہے یعنی ہوس ملک گیری اور خانہ جنگی کی خواہش ہم پر مسلط ہو جائے تو تعدد ازدواج جائز ہے ورنہ نہیں۔

دے کر کئی صفحے بھر دیتے ہیں۔ محض لغو ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج ہی اصل ہے ایک بیوی پر کفایت کرنا خاص حالات میں ہے جب کہ دو بیویوں میں عدل نہ کرسکے اس کا مقتضا یہ ہے کہ ایک نکاح کرنے والے سے باز پرس کی جائے کہ وہ ایک بیوی پر کیوں قناعت کرتا ہے؟ تعدد ازدواج پر عمل کرنے والے سے باز پرس کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ اصلی حکم پر عمل کر رہا ہے کوئی جرم نہیں کر رہا اگر بعد میں کوئی شکایت عدالت میں پہنچے تو باز پرس کا حق ہے کیونکہ نکاح امور تشریعیہ میں سے ہے جن میں دخل دینے کا حکام کو اس وقت تک حق نہیں جب تک کسی جرم کا ارتکاب نہ ہو مصنف نے جتنی مثالیں دی ہیں وہ سب امور انتظامیہ میں سے متعلق ہیں جن میں دخل دینے کا امراء و سلاطین کو اختیار دیا گیا ہے ملاحظہ ہو مقدمہ عاشرہ (پھر یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ ہمارے اسلاف مجاہد تھے وغیرہ وغیرہ اس لئے انکے معاشرہ میں یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کا مسئلہ ہر وقت موجود رہتا تھا ان کو تعدد ازدواج کی ضرورت تھی اب یہ حالت نہیں الخ) اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی لازم تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس سالہ زمانہ جہاد میں تین چار سو سے زائد مسلمان شہید نہیں ہوئے اتنی موتیں تو پاکستان کے ایک شہر میں ایک سال کے اندر ٹریفک اور ریلوے جہاز وغیرہ کے حادثات اور چیچک۔ ملیریا۔ ٹائی فائڈ دق۔ ہیضہ۔ سیلاب۔ اور بجلی کا کرنٹ لگ جانے سے ہوتی رہتی ہیں اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ تعدد ازدواج معاشرہ کی حالت مذکورہ پر موقوف ہے تو یہ کہنا غلط ہے کہ اب یہ حالت موجود نہیں اس کے بعد مفتی عبدہ وغیرہ کی تحریرات سے سہارا لینا ان لوگوں کو زیب نہیں دیتا جو نہ حدیث کو مانتے ہیں نہ اجماع کو۔ پھر مفتی عبدہ وغیرہ نے یہ کب کہا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ تعدد ازدواج پر قانونی پابندی عائد کر کے پہلی بیوی کی رضامندی اور پنچایت کے اطمینان پر اسے موقوف کر دے۔ وہ صرف فتویٰ دے رہے ہیں کہ تعدد ازدواج کی اجازت کو عیاشی کے طور پر عورتوں کے حقوق تلف کر کے استعمال کرنا حرام ہے۔ اس فتویٰ سے کسی عالم کو بھی اختلاف نہیں حدیث صحیح میں ہے۔ لعن اللہ الزواقین والزواقات (اللہ نے مزہ چکھنے والے مردوں اور مزہ چکھنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے) اس کو مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

طلاق کے احکام!

طلاق کے معنی شرعاً رفع قید النکاح (نکاح کی قید کو دور کرنا) ہیں چونکہ نکاح امور تشریعیہ میں سے ہے جس کا ثبوت دے دیا گیا ہے تو طلاق بھی امور تشریعیہ میں سے ہے جن میں حکام و امراء کو اس وقت تک دخل دینے کا حق نہیں جب تک ان کی طرف مرافعہ نہ کیا جائے اور فساد کا اندیشہ نہ ہو (ملاحظہ ہو مقدمہ عاشرہ) اس پر مصنف کتابچہ کا یہ کہنا کہ آیت ۳۵ وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا (اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائیگا تو ایک پنچ شوہر کے کنبہ سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کنبہ میں سے (اور دونوں اصلاح حال کی کوشش کریں) میں قرآن کریم کی رو سے یہ حکم کہ پنچایت یا ثالثی کونسل بٹھائیں اسلامی حکومت کو ہے ظاہر ہے کہ اس حکم کی اطاعت ضروری ہے) (پہلے اس کو ثابت کرو کہ یہ امر وجوب کے لئے ہے۔ کیونکہ قرآن میں قرض کے لین دین میں اور بیع و شرا میں کتابت اور گواہ کرنے کا حکم ہے[1] اور اس کو کسی نے فرض نہیں کہا سب نے استحباب و احتیاط پر محمول کیا ہے یہاں بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ امر استحبابی ہے وجوبی نہیں) اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کرے (فریقین یا ان میں سے کسی ایک کے مرافعہ کے بعد اس سے پہلے نہیں) شوہر کا یہ فرض ہو گا کہ ایسی صورت پیدا ہو جانے پر حکومت یا اس کے مقرر کردہ افسر کو اطلاع دے (یہ قرآن کے کس لفظ سے معلوم ہوا اگر فابعثوا کا خطاب زوجین کو ہے تو حکومت

---

[1] یاایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ الی قولہ واشھدوا اذا تبایعتم۔

کو اس سے کچھ واسطہ نہیں زوجین خود ہی پنچایت بلائیں گے اور اگر حکومت کو خطاب ہے تو وہ فریقین یا کسی ایک کے مرافعہ کے بعد ہی پنچ مقرر کر سکتی ہے پہلے نہیں دلیل آگے آتی ہے) امام ابوبکر جصاص رازی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں، کہ "اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت کا مخاطب کون ہے سعید بن جبیر اور ضحاک سے روایت ہے کہ اس کا مخاطب سلطان ہے جس کی طرف میاں بیوی مرافعہ کریں (ص۱۳۰) اس سے صاف معلوم ہوا کہ مرافعہ سے پہلے سلطان اس کا مخاطب نہیں۔ امام جصاص نے سعید بن جبیر کی روایت کو آگے چل کر سند کے ساتھ مفصل بیان کیا ہے کہ جو عورت (شوہر سے) خلع کرنا چاہے شوہر اس کو سمجھائے اگر اس سے باز نہ آئے تو اس کے پاس سونا چھوڑ دے اس سے بھی باز نہ آئے تو مار کر سیدھا کرے اس سے بھی باز نہ آئے تو مقدمہ حاکم کے پاس لے جائے اس کے بعد حاکم ایک پنچ شوہر کے خاندان سے ایک پنچ بیوی کے خاندان سے مقرر کرے الخ ج ۲ ص۲۳۱) اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ طلاق سے پہلے یا طلاق کے بعد شوہر کے ذمہ یونین کونسل کے چیرمین یا ثالثی کونسل کو اطلاع دینا فرض ہے جب کہ فابعثوا حکما من اہلہ کا مخاطب زوجین میں سے کوئی بھی نہیں بلکہ خطاب حکام کو ہے اور حکام کو زوجین کے خاندانوں سے دو پنچ اسی وقت مقرر کریں گے جب وہ دونوں یا ان میں سے ایک فریق عدالت سے مرافعہ کرے۔ حضرات چودہ علماء کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں میاں بیوی کے اختلافات رفع کرنے کی صورت بیان کی گئی ہے وہاں شوہر پر کسی حاکم یا کونسل کو اطلاع دینا فرض نہیں کیا گیا صرف حکام کو حکم دیا گیا ہے کہ جب ان سے مرافعہ کیا جائے تو وہ زوجین کے کنبہ سے ایک ایک پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کریں کوئی قانونی فہم رکھنے والا ان احکام کو پڑھتے ہوئے قطعاً یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہاں شوہر کے حق طلاق کو کسی پنچایت یا عدالت کے سامنے پیش کرنے اور اس کا فیصلہ حاصل کرنے سے مقید کیا گیا ہے (ص۱۳۳) اس پر مصنف کا مولانا آزاد کے تفسیری نوٹ سے سہارا لینا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے مولانا آزاد نے آیت وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامٰی فانکحوا ما طاب لکم من النساء کے ترجمہ میں فرمایا تھا کہ "اور دیکھو اگر تم نکاح کرنا چاہو (اور تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو (انہیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ بلکہ) جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو (یعنی دوسری عورتوں سے نکاح کر لو) (الخ ص۸۵) وہاں تو کہا گیا تھا کہ مولانا آزاد کے ترجمہ میں جو الفاظ انھوں نے بین القوسین بڑھائے ہیں وہ تو خود مولانا آزاد کے ہیں قرآن کے الفاظ نہیں لہذا انہیں تو چھوڑ دیجئے (ص۸۷) اور تم جو کچھ اپنی طرف سے بڑھاتے چلے جاؤ وہ قرآن کے الفاظ ہیں اور مولانا آزاد کے تفسیری نوٹ بھی قرآن کے الفاظ ہیں؟ انسان کو کچھ شرم و حیا کا لحاظ کر کے بات کرنا چاہیے۔ یہ کون کہتا ہے کہ ثالثی اور پنچایت کا طلاق سے کچھ تعلق نہیں؟ سوال یہ ہے کہ قرآن کے کس لفظ سے تم نے یہ سمجھا کہ شوہر کو طلاق سے پہلے یا بعد میں یونین کونسل کے صدر یا ثالثی کونسل یا عدالت کو اطلاع دینا اور حکام کو مرافعہ سے پہلے ہی زوجین کے معاملات میں دخل دینا فرض ہے؟ قرآن میں "فان خفتم شقاق بینہما" فرمایا ہے کہ اے حکام اگر تم کو زوجین کے درمیان باہمی بغض کا علم[1] یا ظن ہو (الخ) اور ظاہر ہے کہ یہ علم یا ظن مرافعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے پہلے نہیں ہو سکتا۔ پھر تم نے یہ کہاں سے نکالا کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ (مرافعہ سے پہلے ہی) اس معاملہ میں مداخلت کرے عقل بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مرد کو بیوی کی بدچلنی کی وجہ سے نفرت ہو یا بیوی کو شوہر کی شراب خوری یا رنڈی بازی کی وجہ سے بغض ہو اور وہ ان معاملات کو عدالت یا ثالثی کونسل کے سامنے لانا نہیں چاہتے۔ شوہر خاموشی کے ساتھ طلاق دے کر بیوی کو الگ کر دینا چاہتا ہو اور بیوی مہر معاف کر کے خلع کر لینا چاہتی ہے عدالت یا ثالثی کونسل اس میں دخل دینے والی کون ہے؟ پھر مولانا آزاد کے تفسیری نوٹ سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کا مخاطب حکام کو نہیں بلکہ اولیاء خاندان

---

[1] یہاں خوف ڈر کے معنی میں نہیں بلکہ اندیشہ کے معنی میں ہے جس کو علم یا ظن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کو سمجھتے ہیں۔

نے فتح القدیر میں

یہی حضرت مولانا حکیم الامۃ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں اختیار فرمایا ہے۔ ان کا ترجمہ عبارت بین نا صراحت کے ساتھ ملاحظہ کیا جائے فرماتے ہیں "اور اگر (قرائن سے تم اوپر والوں کو) ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی کشاکش کا) اندیشہ طلاق کو ایک اس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی (ایسا ہی) عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکشی کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو یا دونوں کا کچھ قصور ہو سمجھا دیں) پھر فوائد میں تحریر فرماتے ہیں۔ مسئلہ یہ فیصلہ واجب ہے اگر زوجین حکام سے رجوع کریں اور دوسروں کے لئے مستحب ہے اور قید میں اہلہ واہلہا سب کے لئے مستحب ہے ج ۲ ص ۱۱۵) اس سے مصنف کتاب کی ساری بنی بنائی عمارت ہی منہدم ہو گئی۔

اس کے بعد بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ تمام فقہاء و محدثین پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اتنی بات تو تمام فقہاء و محدثین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات طلاق کا منشاء وقفوں کے ساتھ طلاق دینا ہے بیک وقت طلاق دے دینا نہیں انھوں نے اس کے لئے یہ صورت تجویز فرمائی ہے کہ یہ مختلف طلاقیں مختلف اوقات میں ایک ایک وقفہ کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ طلاقیں کافی وقفے سے دو مرتبہ رجوع کر کے یا تجدید نکاح کر کے از سر نو نباہ کی کوشش کرنے اور ہر مرتبہ ناکامی کے بعد یکے بعد دیگرے ہونی چاہئیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ پہلی صورت اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتی لہٰذا یہ دوسری صورت ہی متعین ہو گئی ص ۱۴۲ مگر منکر حدیث کا فرض ہے کہ جو صورت وہ تجویز کر رہا ہے قرآن کے الفاظ سے ثابت کرے قرآن سے تو نہ وہ صورت مفہوم ہوتی ہے جو فقہاء نے بیان کی ہے نہ وہ صورت جو تم نے بیان کی ہے البتہ فقہاء محدثین نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اب اگر تم کو ہمت ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کرو کہ جو صورت آپ نے بتلائی ہے وہ تو اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتی الخ نسائی نے عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ طلاق سُنّت وہ ہے جو حالت طہر میں دی جائے جس میں ہم بستری نہ ہوئی ہو پھر جب حیض آ کر پاک ہو جائے دوسری طلاق دیدے پھر حیض آ کر پاک ہو جائے تو تیسری طلاق دے دے اس کے بعد پھر ایک حیض آنے سے عدت پوری ہو جائے گی اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں اور محمد بن یحییٰ الشیخ النسائی ثقہ حافظ ہے ج ۲ ص ۹۹ اور صحابی کا کسی امر کو سُنّت کہنا حدیث مرفوع کے مثل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو یہی صورت بتلائی تھی السنۃ ان تستقبل الطہر فتطلق لکل قرء سُنّت یہ ہے کہ طہر کا انتظار کیا جائے پھر ہر طہر میں طلاق دی جائے۔ اس کو طبرانی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ طبرانی کی سند حسن ہے اور دارقطنی کی صحیح ہے (اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۹۷) پھر اس میں معنویت کیوں نہیں ہے؟ جو شخص تین طہروں میں ایک ایک طلاق دے گا سوچ سمجھ کر انجام پر نظر کر کے دے گا وہ تین طلاق دے کر نادم نہ ہوگا اس کو طلاق سُنّت اور طلاق مسنون طلاق بدعت کے مقابلہ میں کہا گیا ہے کہ ایک ہی طہر میں یا ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے دے کہ یہ گناہ بھی ہے اور بعض دفعہ موجب ندامت بھی ہوتا ہے باقی اس پر سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ طلاق کی بہترین صورت یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دے کر تین حیض عدت کے گذرنے دے اس درمیان میں اگر بیوی کا دماغ درست ہو جائے رجوع کرے ورنہ عدت پوری ہونے پر نکاح ختم ہو جائے گا اور جو صورت فقہاء و محدثین نے تفریق طلاق کی بتلائی ہے وہ کم سے کم وقفہ ہے ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے زیادہ وقفہ کرنا سُنّت کے خلاف ہے اگر حالات زیادہ وقفہ کے متقاضی ہوں تو زیادہ وقفہ سے بھی کوئی منع نہیں کرتا ان کا مطلب یہ ہے کہ دو طلاقوں کے درمیان ایک حیض سے کم وقفہ نہ ہونا چاہئیے۔ مگر جو لوگ فقہاء کا کلام بھی نہیں سمجھتے حیرت ہے وہ قرآن فہمی کا دعویٰ

کرتے ہوئے کیوں نہیں شرماتے؟ رہا یہ دعویٰ کہ دوسرے مہینہ کی دوسری طلاق تو بالکل ہی عبث ہے اس سے تو کوئی نتیجہ مرتب ہی نہیں ہوتا جیسا پہلی طلاق کے بعد عدت کے اندر شوہر رجوع کر سکتا تھا دوسری طلاق کے بعد بھی کر سکتا ہے (الخ ص ۱۳۹) مصنف کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کو دو تین طلاق کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ دراصل طلاق ایک قسم کا وارننگ ہے دوسری طلاق دوسرا وارننگ ہے جس سے عورت کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بس ایک وارننگ اور باقی ہے اس کے بعد میں اس شوہر سے تجدید نکاح بھی نہ کر سکوں گی اگر وہ اس کو گوارا نہیں کرنا چاہتی تو دوسری وارننگ پر شوہر کو راضی کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ وہ رجوع کرے یا کم از کم تیسری وارننگ نہ دے۔ رہا یہ دعویٰ کہ طلاق معاہدہ نکاح کے فسخ کا اعلان ہے اس فسخ معاہدہ کا اعلان ایک مرتبہ کرے یا ہزار مرتبہ معاہدہ ایک ہی مرتبہ فسخ ہوگا۔ معاہدہ ایک ہے اس کا فسخ بھی ایک ہی ہے لیکن ایک ہی مجلس میں اگر شوہر طلاق کے لفظ تین مرتبہ بول دیتا ہے تو اسے کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے تین مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا ہے الخ ص ۱۴۳)

یہ مصنفِ کتاب کی سوءِ فہم ہے وہ جانتا ہے کہ نکاح عدت گزرنے سے فسخ ہوتا ہے اور طلاق دراصل وارننگ ہے لفظ طلاق سے نکاح فسخ نہیں ہوتا تیسری طلاق کے بعد بھی عدت کے اندر عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی چونکہ نکاح کا معاملہ اہم ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہ وارننگ وقفہ کے ساتھ دیا جائے لیکن اگر کوئی ایک ہی مجلس میں تین دفعہ دے دے تو اس کو ایک وارننگ نہیں کہا جائے گا ہر عاقل اس کو تین وارننگ کہے گا جیسے عام طور سے پورا وارننگ کبھی ایک ہی مجلس میں بھی ہوتا ہے کہ بس ایک دو تین اسی طرح یہاں تیسری وارننگ کے بعد معاہدہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہؐ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ کے عہد میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک شمار کی جاتی تھیں پھر انھوں نے تین طلاقوں کو نافذ کر دیا پھر دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد کے حالات کے پیش نظر سیاستہً ایسا کیا تھا اگر وہ حالات آج باقی نہیں ہیں تو اس حکم کے باقی رکھنے پر اصرار کرنا سراسر زیادتی ہے پھر علامہ ابن تیمیہ کی عبارت کا طویل ترجمہ کر کے بعض صحابہ اور امام احمد بن حنبل اور امام مالک کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ بھی تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے تھے ص ۱۴۴ تا ۱۵۵) افسوس ہے کہ اس مسئلہ میں فتاویٰ ابن تیمیہ کا سہارا لے لیا گیا ہے اور جصاص رازی کی احکام القرآن کو چھوڑ دیا گیا جس کے کلام سے اب تک حجت پکڑ رہے تھے حالانکہ وہ ابن تیمیہ سے بہت مقدم ہیں اور حنفیہ میں مجتہد فی المذہب کا درجہ رکھتے ہیں انھوں نے تین طلاق کو تین شمار کرنے کی دلیل آیات و احادیث سے اور اقوال سلف سے بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع سلف اس بات کو واجب کرتا ہے کہ تین طلاق ایک ساتھ بھی دی جائیں تو تین ہی واقع ہوں گی اگرچہ ایسا کرنا گناہ ہے الخ ابوالولید باجی نے منتقیٰ میں فرمایا ہے کہ جو شخص ایک لفظ سے تین طلاق دے گا تین طلاق لازم ہونگی تمام فقہاء اسی کے قائل ہیں۔ صحابہ کا بھی اس پر اجماع ہے کیونکہ حضرت عمرؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ اور عمران بن حصینؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ ابوہریرہؓ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی مروی ہے اور ان کے خلاف کسی کا قول منقول نہیں۔ ابوبکر ابن عربی نے حدیث ابن عباس پر (جسے مسلم و ابوداؤد نے روایت کی ہے) کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے اس کو اجماع پر کیسے مقدم کیا جا سکتا ہے اور محمود بن لبید کی حدیث اس کے معارض ہے اس میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کسی نے تین طلاق ایک دم دی تھیں تو آپ نے اس کو نافذ کیا رد نہیں کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر غصہ ہونا بھی بتاتا ہے کہ تین طلاق واقع ہو گئیں تھیں ابوبکر ابن العربی حافظ حدیث اور بڑے وسیع النظر ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے تمہید اور

کتاب الاستذکار میں اس مسئلہ میں کثرت سے دلائل بیان کئے ہیں اور اجماع ثابت کیا ہے۔ علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ صحابہ میں مجتہدین اور فقہاء بیس سے زیادہ نہیں ہیں اور ہم نے اکثر سے تین طلاق سے تین کا واقع ہونا صراحتہً ثابت کر دیا ہے اور انکے خلاف کسی کا قول ظاہر نہیں ہوا اس لئے اگر کوئی حاکم یہ فیصلہ کرے کہ ایک لفظ سے تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا جائے گا اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا کیوں کہ اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں اس کو اختلاف نہ کہا جائے گا بلکہ اجماع کے خلاف کہا جائے گا۔ حافظ ابن رجب حنبلی جن کو ذیل تذکرۃ الحفاظ میں امام حافظ حجت کہا گیا ہے حنابلہ میں سب سے زیادہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے معتقد اور متبع تھے پھر بہت سے مسائل میں غور وخوض کے بعد ان سے اختلاف کیا، اور اسی مسئلہ طلاق میں ایک مستقل کتاب بنام بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلث واحدہ ان دونوں کے رد میں لکھی۔

ابن رجب اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین اور ائمہ سلف میں سے جن کا قول حلال وحرام کے فتاویٰ میں مانا جاتا ہے کسی سے بھی صراحتہً اس قسم کی کوئی بات ثابت نہیں ہوئی کہ عورت مدخول بہا کو ایک لفظ سے تین طلاق دی جائیں تو ایک شمار ہونگی۔۔۔۔ حافظ جمال بن عبدالہادی حنبلی نے اپنی کتاب السیر الحاث فی علم الطلاق الثلاث میں فرمایا ہے کہ تین طلاقوں سے تین ہی واقع ہونگی امام احمد کا صحیح مذہب یہی ہے اب وہ عورت اس شوہر کے لئے حلال نہیں جب تک دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ یہی قول امام احمد کے اکثر اصحاب کی کتابوں میں جزم ویقین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جیسے الخرقی۔ المقنع المحرر۔ الہدایہ وغیرہ اثرم کہتے ہیں میں نے امام احمد سے دریافت کیا آپ عبداللہ بن عباسؓ کی اس حدیث کو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صدیق اکبر کے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تین طلاق ایک ہی تھی آپ کس دلیل سے رد کریں گے؟ فرمایا دوسرے سب لوگوں کی روایات سے کہ ابن عباسؓ تین طلاق کو تین ہی سمجھتے تھے۔ مغنی (ابن قدامہ) میں بھی جزم کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے۔ اکثر فقہا (حنابلہ) نے اس کے سوا دوسرا قول نہیں بیان کیا، ابن رجب کی مراد اکثر کتب اصحاب احمد سے متقدمین کی کتابیں ہیں متاخرین کی مراد نہیں جو احمد ابن تیمیہ کے بعد ہوتے اور ان کی باتوں سے غلط فہمی میں پڑ گئے انکے قول کو امام احمد کے مذہب میں شمار نہ کیا جائے گا ترمذی کے شیخ اسحٰق بن احمد نے بھی مسائل احمد میں وہی بیان کیا ہے جو اثرم نے ذکر کیا بلکہ امام احمد نے مسدد بن سرہد کو سُنّت کے متعلق جو خط لکھا تھا اس میں تین طلاق کو ایک طلاق شمار کرنا اہل سُنّت کے مذہب سے خروج قرار دیا ہے فرماتے ہیں جس نے ایک لفظ سے تین طلاق دی اس نے جہالت کی اور اس پر اس کی بیوی حرام ہو گی جب تک کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے قاضی ابوالحسین بن ابی یعلی حنبلی نے طبقات حنابلہ میں مسدد بن سرہد کا ذکر کرتے ہوئے امام احمد کے اس جواب کو سند قوی کے ساتھ بیان کیا ہے جس پر حنابلہ کو پورا اعتماد ہے امام احمد نے اس کو اہل سنت کی علامت اس لئے فرمایا کہ روافض اس میں اختلاف کرتے اور مسلمانوں کے نکاحوں سے کھیل کرتے ہیں امام کبیر ابوالوفاء بن عقیل حنبلی نے اپنی کتاب التذکرہ میں فرمایا ہے کہ "جو شخص اپنی بیوی سے یوں کہے" ۔ "تجھے تین طلاق مگر دو" اس صورت میں تین طلاق واقع ہو جائیں گی کیونکہ اس نے اکثر کو مستثنیٰ کیا ہے اور ایسا استثناء صحیح نہیں ہے؟

ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلام بن تیمیہ مولف منتقی الاخبار اپنی کتاب "المحرر" میں فرماتے ہیں۔ اگر کسی نے دو طلاق یا تین طلاق ایک لفظ سے یا چند لفظوں سے وہی ایک طہر میں یا چند طہروں میں سب واقع ہو جائیں گی یہی سُنّت (یعنی اہل سنت کا مذہب) ہے انکے پوتے احمد بن تیمیہ ان سے یہ روایت کرتے ہیں کہ وہ تین طلاق کو ایک قرار دیتے تھے مگر ان کی کتاب المحرر کے الفاظ تمہارے سامنے ہیں ہم اس کو کیسے مان لیں کہ جو مسئلہ وہ اپنی کتاب میں صراحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اس کے خلاف

فتوے دیتے ہونگے۔ اور شافعیہ کا مسلک تو اس باب میں بہت ہی مشہور ہے کہ تین طلاق سے تین ہی واقع ہوتی ہیں ابوالحسن سبکی اور کمال اور زملکانی اور ابن جہبل اور عز بن جماعۃ وغیرہ نے اس مسئلہ میں ابن تیمیہ کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ ابن حزم ظاہری کو اقوال شاذہ اختیار کرنے کا بہت شوق ہے مگر اس مسئلہ میں ان کو جمہور سے مخالفت کی گنجائش نہیں بلکہ محلّٰی میں (ایک لفظ سے تین طلاق دینے سے) تین طلاق واقع ہو جانے کی بہت دلیلیں بیان کی ہیں جس کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ ان لوگوں کا موقف معلوم ہو جائے جو اس کے خلاف کہتے ہیں اس تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ صحابہ و تابعین اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے اور احادیث سے یہ بات واضح ہے کہ ایک لفظ کے ساتھ تین طلاق دینے میں تین ہی واقع ہوں گی اس کے خلاف کی اصلاً گنجائش نہیں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس مسئلہ پر بحث کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف کی نظیر متعۃ نکاح کا مسئلہ ہے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں اور ابتداء خلافت عمرؓ تک لوگ متعہ کرتے تھے پھر سب کو حضرت عمرؓ نے منع کر دیا تو ہم اس سے رک گئے ان دونوں مسئلوں میں صحیح یہی ہے کہ متعہ حرام ہے اور تین طلاق سے تین واقع ہوں گی کیونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس پر اجماع ہو چکا ہے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کے خلاف کسی کا قول ثابت نہیں۔ ان کا اجماع اس کی دلیل ہے کہ اہل اجماع کے پاس اس باب میں نص موجود تھی اگرچہ بعض کو اس کا علم نہ ہو یہاں تک کہ خلافت عمرؓ میں سب کے سامنے نص ظاہر ہو گئی اس کے بعد جو شخص اجماع کے خلاف بات کہے وہ اجماع کو نظر انداز کر رہا ہے اور اجماع کے بعد کسی کو اختلاف پیدا کرنے کا کسی کو حق نہیں ج ۹ ص ۳۱۹

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جیسے متعہ کی حرمت اجماعی ہے اسی طرح ایک لفظ کے ساتھ تین طلاق کا واقع رہنا بھی اجماعی مسئلہ ہے اور ابن المغیث نے جو کتاب الوثائق میں محمد بن الوضاح کے حوالے سے حضرت علیؓ اور ابن مسعود اور عبدالرحمن بن عوف کا قول اس کے خلاف نقل کیا ہے تو ابن المغیث طلیطلی متوفی ۴۵۹ھ نقل میں معتمد علیہ نہیں نہ اس کو مسائل فقہیہ کی زیادہ سمجھ بوجھ ہے اس کا یہ قول کہ طلاق ثلاثہ کے کچھ معنی نہیں کیونکہ وہ خبر دے رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ خود اس کی دلیل ہے کہ اس نے فقہ اور فہم کی بو بھی نہیں سونگھی کیوں کہ نکاح میں بھی تو ایجاب قبول بصیغہ خبر ہی ہوتا ہے اور سب نے خبر کو انشاء قرار دیا ہے اسی طرح یہاں بھی خبر نہیں بلکہ انشاء ہے) پھر اس نے بلا سند ان روایات کو محمد بن وضاح کی طرف منسوب کر دیا ہے حالانکہ دونوں کے درمیان بڑا فاصلہ ہے تو ابن المغیث پر کیسے اعتبار کر لیا جائے؟ علماء ناقدین اندلس کے نزدیک تو اس کا جہل اور علمی سقوط ضرب المثل ہے ملاحظہ ہو امام ابوبکر بن العربی کی کتاب القواصم والعواصم جس میں انھوں نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ آج کل قضاۃ اندلس اس حدیث کا مصداق ہیں اتخذ الناس رؤسا جہالا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا لوگوں نے جاہلوں کو بڑا بنا لیا ہے وہ بغیر علم کے فتوی دینے لگے ہیں خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا لوگ کہتے ہیں کہ فلاں طلیطلی فلاں مجریطی اور ابن المغیث نے یہ کہا خدا اس کی دعا کو قبول نہ کرے نہ اس کی امیدوں کو پورا کرے یہ لوگ ہمیشہ الٹا چلتے ہیں، جن مستند کتابوں میں سند کے ساتھ اقوال صحابہ و تابعین بیان کئے گئے ہیں ان میں جمہور امت کے خلاف کوئی بات بھی ان حضرات سے منقول نہیں بلکہ حضرت علی و ابن مسعود و عبدالرحمن بن عوف سے صحیح سند کے ساتھ وہی روایت ہے جو جمہور کے موافق فقہاء عراق حضرت علی اور ابن مسعود کا سب سے زیادہ اتباع کرنے والے ہیں اس مسئلہ میں جمہور کے موافق ہیں۔ ملاحظہ ہو سنن البیہقی و محلی ابن حزم و دارقطنی وغیرہ پس محمد بن وضاح کے حوالے سے ان حضرات کے جو اقوال بیان کئے جاتے ہیں اول تو ابن وضاح کی طرف اس بات کو منسوب کرنا ہی صحیح نہیں کیوں کہ اس کا راوی ابن مغیث مجروح ہے اور وہ بھی بلا سند نسبت کرتا ہے سند بیان نہیں کرتا دوسرے اس حوالہ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو محمد بن وضاح ہی کی محدثین عظام کے سامنے کیا قدر و قیمت ہے اس کی نسبت حافظ ابوالولید فرضی کہتے ہیں کہ وہ فقہ اور عربیت سے جاہل تھا بہت سی احادیث کو رد کر دیتا تھا ایسا شخص عوام میں شمار ہوتا ہے اگرچہ

کتنا ہی کوئی صاحب روایت ہو تو اس طلیطلی اور مجریطی جیسے مجہول لوگوں کی رائے بیان کرنا، ایسے ہی لوگوں کا کام ہے، جن کو اور کوئی کام نہ ہو۔

حدیثِ ابن عباس رضؓ

رہی یہ حدیث جس پر ان لوگوں کو بڑا ناز ہے جو اجماع کا خلاف کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضؓ نے فرمایا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور خلافت صدیق رضؓ اور دو سال تک خلافت عمر فاروق میں تین طلاق ایک ہی تھی حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ لوگ اس کام میں جلدی کرنے لگے جس میں توقف ہونا چاہیئے تھا تو اب ہم ان پر تین کو نافذ کر دیں چنانچہ اس کو نافذ کر دیا اور طاؤس کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ابوالصہبا نے ابن عباس سے کہا ہات من ھنا تک لایئے اپنی خرافات کیا تین طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضؓ کے عہد میں ایک نہ تھی؟ فرمایا ہاں ایسا ہی تھا۔ پھر حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں لوگ پے درپے طلاق دینے لگے تو انھوں نے تین کو نافذ کر دیا ایک روایت میں یہ ہے کہ ابوالصہبا نے ابن عباس رضؓ سے کہا کیا آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضؓ کے زمانہ میں اور تین سال تک خلافت عمر رضؓ میں تین کو ایک کہا جاتا تھا ابن عباس رضؓ نے فرمایا۔ ہاں۔ یہ سب روایات مسلم میں ہیں۔

حافظ ابن رجب نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ ائمہ حدیث نے اس کا دو طرح سے جواب دیا ہے ایک امام احمد کا مسلک ہے کہ وہ سند حدیث میں کلام کرتے اور اس کو شاذ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ تنہا طاؤس کی روایت ہے، عبداللہ ابن عباس رضؓ کے اصحاب میں سے کسی نے اس کی موافقت نہیں کی بلکہ حضرت ابن عباس رضؓ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق کو وہ تین ہی قرار دیتے تھے دوسرے طاؤس کے بیٹے سے کرابلیسی نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ جو شخص تم سے یہ کہے کہ طاؤس تین طلاق کو ایک قرار دیتے تھے اس کو جھوٹا سمجھو۔ تیسری طاؤس نے یہ نہیں کہا کہ میں نے ابن عباس رضؓ سے سنا۔ بلکہ کہتا ہے کہ ابوالصہبا نے ابن عباس رضؓ سے یوں کہا اور یہ لفظ موجب انقطاع ہے کیوں کہ اس میں یہ تصریح نہیں کہ میرے سامنے کہا اور صحیح مسلم میں بعض روایات منقطع بھی ہیں جن پر محدثین نے تنقید کی ہے چوتھے یہ ابوالصہبا اگر عبداللہ بن عباس کا مولیٰ ہے تو نسائی نے اس کو ضعیف کہا ہے کوئی اور ہے تو مجہول ہے پانچویں اس حدیث کے بعض طرق میں یہ لفظ بھی ہے کہ ابوالصہبا نے ابن عباس رضؓ سے کہا "ہات من ہنا تک" لایئے اپنی خرافات۔ ابن عباس رضؓ کے منہ پر کوئی صحابی بھی ایسا لفظ نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ غلام ایسی بات کہے اور وہ اس پر سکوت کر جائیں چھٹے اگر ابن عباس رضؓ نے اس کا رد نہیں کیا تو گویا انھوں نے مان لیا کہ یہ بات خرافات کی قسم سے ہے پھر اس سے حجت پکڑنا کیسے صحیح ہوگا؟

جوزجانی نے کہا یہ حدیث شاذ ہے میں نے زمانہ قدیم میں اس کی بہت تحقیق کی مجھے اس کی کوئی اصل نہیں ملی۔ حافظ ابن رجب کہتے ہیں کہ جب امت کسی روایت کے رد پر اتفاق کرے اس کو رد کر دینا اور اس پر عمل نہ کرنا واجب ہے، خود عبداللہ بن عباس راوی حدیث سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہی کہ انھوں نے اس حدیث کے خلاف فتویٰ دیا اسی علت کی بنا پر امام احمدؒ و شافعی نے اس روایت کو معلول قرار دیا جیسا ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کیا ہے یہی ایک علت تنہا کافی تھی اور جب اس کے ساتھ شذوذ بھی مل جائے اور اس کے انکار پر امت کا اجماع بھی ہو تو کیا پوچھنا؟ قاضی اسماعیل نے احکام القرآن میں فرمایا ہے کہ طاؤس باوجود اپنے علم و فضل و صلاح کے بہت سی منکر احادیث روایت کرتا ہے، من جملہ ان کے یہ حدیث بھی ہے پھر طاؤس کے بیٹے نے صاف کہہ دیا ہی کہ جو کوئی یہ کہے کہ طاؤس تین طلاق کو ایک شمار کرتے تھے اس کو جھوٹا سمجھو معلوم ہوا کہ اس حدیث کا جو عام مطلب لوگوں نے سمجھا ہے اس پر نہ ابن عباس رضؓ کا عمل تھا نہ طاؤس کا اور ابن القیم نے جو روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضؓ

تین طلاق کے بارے میں اپنے فیصلہ پر بعد میں نادم ہوئے وہ بالکل غلط اور موضوع ہے اس کی سند میں خالد یزید بن ابی مالک ہے جس کے بارے میں یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے کہ وہ تنہا اپنے باپ ہی پر جھوٹ نہیں بولتا بلکہ صحابہ تک پر جھوٹی باتیں لگاتا ہے۔ اسکی کتاب الدیات اس قابل ہے کہ دفن کردی جائے اور اس کے باپ نے حضرت عمرؓ کو ہرگز نہیں پایا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے صراحۃً یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک لفظ سے تین طلاق کو ایک شمار کیا جاتا تھا کیونکہ حدیث میں لفظ الثلاث آیا ہے ظاہر ہے کہ اس سے ہر تین طلاق مراد نہیں ہوسکتیں کیوں کہ تین طہروں پر تفریق کے ساتھ تین طلاقیں کسی کے نزدیک بھی ایک نہیں تو ماننا پڑے گا کہ اس سے وہ تین مراد ہیں جو تین طہروں پر منقسم نہ ہوں۔ اس میں پھر احتمال ہے کہ ایک لفظ سے ہوں یا تین لفظوں سے اور مدخول بہا کو دی جائیں یا غیر مدخول بہا کو اگر غیر مدخول بہا کو تین لفظوں سے تین طلاق دی جائیں تو سب کے نزدیک پہلے ہی لفظ سے وہ بائن ہو جائے گی۔ دوسری اور تیسری طلاق لغو ہے کہ محل ہی باقی نہ رہا اور مدخول بہا کو تین لفظوں سے تین طلاق دی جائیں اور شوہر یہ کہے کہ میں نے ایک کا ارادہ کیا تھا اور تین دفعہ تاکید کے لئے کہا تھا تو دیانۃً اس کا قول مقبول ہوگا قضاءً نہیں کیونکہ نیت کا حال اللہ ہی کو معلوم ہو سکتا ہے ایک صورت یہ ہے کہ تین طلاق ایک لفظ سے یا تین لفظوں سے ایک مجلس میں دی جائیں۔ اگر حدیث کو اس پر محمول کیا جائے تو اس میں پھر دو احتمال ہیں ایک، یہ کہ مطلب یہ ہو کہ آج کل جس طرح تین طلاق دی جاتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ اور خلافت عمرؓ کے اوائل میں یہ صورت نہ تھی بلکہ اُس وقت کے مسلمان ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے یا تین کو الگ الگ تین طہروں پر تقسیم کرتے تھے بعد میں ایک لفظ سے یا بغیر تفریق طہر کے تین طلاق دینے کا رواج ہو گیا حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے ان کو نافذ کر دیا۔ ایک احتمال یہ ہے کہ جس طرح آجکل ایک لفظ سے یا تین لفظوں سے ایک طہر میں تین طلاق دینے کا رواج ہو گیا ہے ایسا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور صدیق اکبرؓ کی خلافت میں رواج تھا مگر اس وقت تین کو ایک شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو تین ہی شمار کیا۔ تو سوال یہ ہے کہ تم نے اس دوسرے احتمال کو کس دلیل سے راجح کیا جب کہ خود ابن عباسؓ سے اس کے خلاف صحت اور تواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے پھر یہ بہت بعید ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ ایک طہر میں یا ایک لفظ سے تین طلاق دیتے ہوں اور آپ نے تین کو ایک قرار دیا ہو کیونکہ اس صورت میں گناہ کا ارتکاب کرنے والا سنت کے موافق طلاق دینے والے سے اچھا رہے گا۔ حضورؐ کے زمانہ میں کسی نے شاذ و نادر ایسا کیا بھی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت غصہ ظاہر کیا اور تینوں طلاق نافذ کر دیں محمود بن لبید انصاری کی روایت میں اس کی تصریح ہے پس احتمال اول ہی صحیح ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ ایک طلاق دیا کرتے تھے پھر تین دینے لگے تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ و اتفاق سے ان کو تین ہی قرار دیا کیوں کہ نکاح۔ اعتاق۔ اقرار۔ اور جملہ امور میں تین کو تین ہی شمار کیا جاتا ہے اگر کوئی شخص ایک مجلس میں ایک لفظ سے یہ کہدے کہ میں نے اپنی تین لڑکیوں کا فلاں فلاں فلاں سے نکاح کر دیا یا تین غلام آزاد کر دیئے یا میرے ذمہ فلاں کے تین ہزار روپے ہیں اس کو کوئی بھی ایک پر محمول نہیں کرتا۔ امام بخاری نے باب من اجاز طلاق الثلاث (ان لوگوں کی دلیل جو تین طلاق کو نافذ کرتے ہیں) منعقد کر کے حدیث لعان بیان کی جس میں یہ بھی ہے کہ عویمر عجلانی نے کہا یا رسول اللہؐ اگر میں اب اس کو اپنے پاس رکھوں تو جھوٹا ہونگا پھر اس کو اسی وقت تین طلاق دے دیں کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار کیا اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ لوگ ایک لفظ سے ایک مجلس میں تین طلاق کو تین سمجھیں اور شرعاً وہ ایک ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سکوت فرمائیں حکم شرعی کو بیان نہ فرمائیں۔ عویمر عجلانی کے اس واقعہ سے پوری اُمت نے یہی سمجھا ہے حتیٰ کہ ابن حزم ظاہری نے بھی لکھا ہے کہ اگر ایک دم تین طلاق دینے سے تین واقع نہ ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور انکار

فرمائے کہ تین کہنے کی کیا ضرورت تھی اس سے تو ایک ہی طلاق پڑے گی۔ امام بخاریؒ نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے۔ غرض تین طلاق سے تین کا واقع ہونا امت کا متفقہ اجماعی فیصلہ ہے خواہ ایک لفظ سے دی جائے یا چند الفاظ سے۔ ایک مجلس میں دی جائے یا مختلف مجالس میں۔ علامہ ابن التین نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ اور کسی کا خلاف نقل نہیں کیا۔ بجز ان لوگوں کے جن کا خلاف معتبر نہیں (جیسے روافض وغیرہ) ابن مغیث جیسے لوگوں کے بے سند حوالوں سے علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کا اسے اختلافی مسئلہ قرار دینا درست نہیں۔ کسی محدث کو ایسی مہمل روایات پر اعتماد کرنا جائز نہیں جب تک صحیح اسانید سے ثبوت نہ ہو ورنہ حضرات صحابہ پر یہ اعتراض عائد ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو اپنی رائے سے رد کر دیا کرتے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں ایسی گستاخی روافض ہی کر سکتے ہیں اور در اصل اس مسئلہ میں اختلاف کی ابتدا ان ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ رہا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ نے سیاسۃً ایسا کیا تھا۔ یہ بھی غلط ہے کیوں کہ سیاسۃً بھی نص کے خلاف فیصلہ کرنے کو کس نے جائز کہا ہے؟ پھر شریعت میں جو سیاسی تعزیرات فقہا کے نزدیک ثابت ہیں ان سے اس کو کیا واسطہ؟ ایسی تعزیر کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں اگر اس دروازہ کو کھولا جائیگا تو ساری شریعت کو ایسی ہی بیہودہ تاویلوں سے ہر شخص رد کر دے گا۔ رہی حدیث رکانہؓ کہ انھوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی تھیں پھر بہت رنجیدہ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے کتنی طلاقیں دی تھیں کہا ایک مجلس میں تین طلاق دی ہیں فرمایا کہ تم قسم کھاتے ہو کہ ایک کا ارادہ کیا تھا؟ کہا میں قسم کھاتا ہوں کہ ایک کا ارادہ کیا تھا فرمایا بس ایک ہی طلاق ہوئی ہے تم اس سے رجوع کر لو۔ اس سے ان لوگوں کا مدعا ثابت نہیں ہو سکتا جو کہتے ہیں کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھا ان کو ماننا پڑے گا کہ رکانہؓ نے تین لفظوں سے تین طلاق دی تھیں اور اس صورت میں ہم بھی مانتے ہیں کہ اگر شوہر نے ایک کی نیت کی ہو تو دیانۃً مدخولہ پر ایک ہی پڑے گی اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ایک مجلس میں تین طلاق ہر حال میں ایک ہی شمار ہونگی پھر اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے معلول کہا اور امام بخاری نے مضطرب قرار دیا جیسا ترمذی نے نقل کیا ہے اور امام احمد نے اس کے تمام طرق کو ضعیف کہا ہے ابن عبد البر نے بھی امام احمد کی تائید کی ایسی حالت میں یہ حدیث کیسے حجت ہو سکتی ہے؟ قاعدہ یہ ہے کہ حدیث مضطرب کے کسی ایک طریق کو ترجیح ہو جائے تو وہی صحیح ہوگا باقی مردود ہو جائیں گے علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا سب سے زیادہ صحیح طریق وہ ہے جسے ابو داؤد و ترمذی و ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ رکانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی کو لفظ البتہ سے طلاق دی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قسم لی کہ اس نے صرف ایک کا ارادہ کیا تھا اور آپؐ نے اس کی بیوی واپس کر دی پھر دوسری طلاق خلافت عمر میں دی اور تیسری طلاق خلافت عثمان میں امام شافعیؒ نے بھی اسی طرح روایت فرمایا ہے۔ ابو داؤد کی سند میں نافع بن عجیر کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اگرچہ بعض ناواقفوں نے اس کو مجہول کہا ہے۔ پھر وہ تابعی کبیر ہے جس میں کسی نے جرح نہیں کی اور عبد اللہ بن علی بن السائب جو امام شافعی کی سند میں ہے اس کو امام شافعیؒ نے ثقہ بتایا ہے اور عبد اللہ بن علی بن یزید بن رکانہ کو ابن حبان نے ثقہ کہا ہے اور تابعین کے بارے میں جرح نہ ہونا ہی کافی ہے صحیحین میں ایسے راوی بہت ہیں ابو داؤد نے بھی اسی طریق کو یہ کہہ کر ترجیح دی ہے کہ آدمی کی اولاد اپنے باپ کے واقعہ کو دوسروں سے زیادہ جانتی ہے اس سند میں عبد اللہ بن علی بن یزید کا کا پڑپوتا ہے۔ ابن تیمیہ کا یہ قول صحیح نہیں کہ امام احمد نے محمد بن اسحق کے طریق کو حسن کہا ہے کیوں کہ اگرچہ محمد بن اسحاق نے حدثنا کہا ہے مگر وہ اس کو داؤد بن حصین کے واسطہ سے عکرمہ سے روایت کر رہا ہے اور داؤد بن حصین کی روایت عکرمہ سے منکر شمار کی گئی ہے تو امام احمد اس کو حسن کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اور اس روایت کے اختلاف الفاظ سے معلوم ہو گیا کہ مدینہ والے طلاق البتہ کو طلاق ثلث

یعنی تین طلاق سمجھتے تھے پس حدیث ابن عباس میں یہ ایک احتمال اور پیدا ہو گیا کہ راوی نے طلاق الثلاث تین طلاق سے طلاق البتہ مراد لیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ لفظ کنایہ تھا ایک طلاق بائن اور تین طلاق مغلظہ دونوں کو محتمل تھا اس لئے جب رکانہ نے قسم کھا کر بتلایا کہ میری نیت ایک کی تھی آپ نے بیوی واپس دلا دی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لفظ البتہ کا استعمال تین طلاق کے لئے زیادہ ہونے لگا کہ شوہر کی نیت معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہ رہی کیونکہ یہ لفظ تین طلاق کے لئے صریح بن گیا تھا تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے تین طلاق کا فیصلہ کر دیا کیوں کہ اب یہ لفظ کنایہ باقی نہ رہا تھا اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے ابن عباسؓ سے اس اجماعی مسئلہ میں خلاف پیدا کرنا انھی کا کام ہے جو اختلاف پیدا کرنے کا شوق رکھتے ہیں جس شخص کو مسئلہ طلاق ثلث کی زیادہ تحقیق مطلوب ہو وہ اعلاء السنن جلد ۱۱ میں اس کی بحث دیکھے اور اس حصہ کے آخر میں علامہ محمد زاہد کوثری محقق مصر کے رسالہ الاشفاق فی احکام الطلاق کا خلاصہ بھی قابل دید ہے۔ ہم نے اس جگہ جن احادیث و اقوال صحابہ و تابعین کا ذکر کیا ہے ان سب کے حوالے مع سند اور صفحات کے اعلاء السنن میں دیکھ لئے جائیں۔

نکاح کی عمر آیت فان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی کی تفسیر میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ و ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک اس کا شان نزول یہ ہے کہ لوگ اپنی دست نگر یتیم لڑکیوں سے معمولی مہر پر نکاح کر لیتے تھے ان کو اس بے انصافی سے منع کیا گیا اور پورے مہر پر نکاح کرنے کا حکم کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ نابالغہ کا نکاح صحیح ہے۔

امام جصاص رازی نے بھی تصریح کی ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے جب کہ دوسرے اولیاء بھی اقرب ہونے کی صورت میں ایسا کر سکتے ہیں اس کے جواز میں سلف اور خلف کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تمام فقہاء اس پر متفق ہیں۔ صرف ابن شبرمہ اور اصم کا خلاف بیان کیا جاتا ہے (مگر اجماع سابق کے خلاف کسی کا قول نہیں مانا جائے گا صحابہ اور تابعین کا اس پر اجماع ہو چکا ہے) پھر حق تعالیٰ کا یہ ارشاد (واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثۃ اشھر واللائی لم یحضن) بھی اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں صغیرہ (نابالغہ) کی طلاق کو صحیح مانا گیا اور اس کی عدت بھی تین مہینے قرار دی گئی ہے اور طلاق نکاح صحیح کے بعد ہی ہو سکتی ہے معلوم ہوا کہ نابالغہ کا نکاح صحیح ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جب کہ ان کی عمر چھ سال تھی صدیق اکبرؓ نے اپنی ولایت سے نکاح کیا اس سے بھی معلوم ہوا کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے۔ اور بلوغ کے بعد اس کو اختیار بھی نہیں ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو بلوغ کے بعد اختیار نہیں دیا (اگر شرعاً خیار ثابت ہوتا تو حضورؐ ضرور اس کو بیان فرماتے) ج ۲ صہ ۶۲ نابالغ لڑکی کا نکاح اگر باپ یا دادا کر دیں تو اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں سب کا اتفاق ہے۔ البتہ باپ اور دادا کے سوا کوئی دوسرا ولی نکاح کر دے تو اس کے جواز میں خلاف ہے ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص ج ۲ صہ ۱۶، ۶۱ اور اجماع کی مخالفت جائز نہیں جیسا مقدمہ اولیٰ میں بیان ہو چکا۔ اور جب اس پر اجماع ہے کہ صغیرہ نابالغہ کا نکاح باپ یا دادا کر سکتا ہے تو جس آیت میں یتیموں کے اموال ان کے حوالہ کرنے کے لئے۔ بلوغ نکاح کو حد بتلایا گیا ہے۔ وابتلوا الیتامی حتی اذا بلغوا النکاح وہاں نکاح سے عقد نکاح مراد نہیں بلکہ ہمبستری مراد ہے تو اس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ یتیموں کو انکے اموال کب حوالہ کئے جائیں بالواسطہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرآن کی نگاہ میں ہمبستری کی بھی ایک عمر مقرر ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن نے صراحۃً اسکی کوئی حد بیان نہیں کی فقہاء نے عبد اللہ ابن عمرؓ کی حدیث سے اس کی زیادہ سے زیادہ حد پندرہ سال اور حضرت عائشہؓ کی حدیث سے کم سے کم حد نو سال مقرر کر دی کہ عورت نو سال کی عمر میں ہمبستری کے قابل ہو سکتی ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا کھلے

پیتے رئیسوں کی لڑکیاں شہروں میں اور دودھ گھی مکھن کھانے والے دیہاتیوں کی لڑکیاں گاؤں میں نو۔ دس سال کی عمر میں اس قابل ہو جاتی ہیں۔ علماء لغت اور جملہ مفسرین نے تصریح کی ہے کہ لفظ نکاح کے اصلی معنی ہمبستری ہی کے ہیں چونکہ عقد نکاح ہمبستری کے جواز کا سبب ہے اس لئے عقد کو بھی نکاح کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے چنانچہ ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم میں (اور نکاح نہ کرو ان عورتوں سے جن سے تمہارے باپ دادا نکاح کر چکے ہیں) لا تنکحوا سے عقد نکاح مراد ہے اور ما نکح سے عقد اور ہمبستری دونوں مراد ہیں اسی لئے جس باندی سے باپ نے وطی کی ہو بیٹے کو اس سے ہمبستری جائز نہیں اسی طرح فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ میں (کہ تین طلاق کے بعد عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں رہتی یہاں تک کہ دوسرے کسی مرد سے نکاح کرے) بھی نکاح سے عقد اور ہمبستری دونوں مراد ہیں اگر دوسرے مرد سے عقد نکاح ہی ہوا ہمبستری نہ ہوئی تو پہلے شوہر کے لئے اس سے نکاح جائز نہیں آیت کا حاصل یہ ہوا کہ نابالغ یتیم لڑکے اور لڑکی کو آزماتے رہو یہاں تک کہ وہ ہمبستری کے قابل ہو جائیں (کہ اس وقت عموماً نفع و نقصان کی تمیز ہو جاتی اور ضبط و انتظام کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے) تو اگر ان میں ہوشیاری کے آثار پاؤ تو ان کے اموال ان کے حوالہ کر دو اور ہمبستری کی قابلیت پندرہ سال پر موقوف نہیں اس سے پہلے بھی ہو سکتی ہے (اس کے بعد مصنف کتاب کا مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کے اختلافی نوٹ میں جواب میں یہ کہنا کہ "مولانا نے حضرت عائشہؓ کے نکاح سے استدلال کیا ہے کہ شریعت نے اس سلسلہ میں بلوغ یا غیر بلوغ کی کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے تو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قرآن کریم نے بلوغ کو نکاح کی عمر بتایا ہے" سراسر نادانی ہے کیونکہ آیت قرآنی میں نکاح سے عقد مراد نہیں ہے بلکہ ہمبستری مراد ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کے نکاح سے مولانا احتشام الحق ہی نے تنہا استدلال نہیں کیا بلکہ تمام فقہاء استدلال کرتے آئے ہیں کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں باپ دادا کے سوا دوسرے ولی اقرب میں اختلاف ہے کہ وہ بھی اپنی ولایت سے باپ دادا کی غیر موجودگی میں نابالغ لڑکی کا نکاح کر سکتا ہے یا نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک دوسرے اولیاء کو بھی الاقرب فالاقرب کا لحاظ کر کے یہ حق حاصل ہے امام جصاص رازی نے حضرت علی۔ ابن مسعود، ابن عمر زید بن ثابت، ام سلمہ، عائشہ، عبد اللہ بن عباس، حسن بصری، طاؤس، عطاء وغیرہ رضی اللہ عنہم کی طرف اس کو منسوب کر کے فرمایا ہے کہ ہم کو سلف میں سے سی کا قول اس کے خلاف معلوم نہیں ہوا (۲۷ ص ۶۱) اس کے بعد مصنف کتابچہ کا حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں ادھر ادھر سے روایات نقل کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ انکی عمر نکاح کے وقت سولہ سترہ سال تھی اور رخصتی کے وقت انیس بیس سال محض ابلہ فریبی ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ سے بخاری اور مسلم اور جملہ کتب صحاح میں یہی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا جب کہ وہ چند سال کی تھیں اور ہمبستری کی جب کہ وہ نو سال کی تھیں۔ امت نے بالاتفاق اس روایت کو صحیح مانا اور اسی سے تمام فقہاء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کر سکتا ہے اس کے خلاف جو روایت بھی لائی جائے گی رد کر دی جائے گی خصوصاً جب کہ کسی روایت میں بھی صراحتاً موجود نہیں کہ انکی عمر نکاح کے وقت پندرہ ۱۵ یا سولہ سال تھی اور رخصتی کے وقت انیس یا بیس ۲۰ سال۔ صرف حساب لگایا جا رہا ہے کہ حضرت اسماء حضرت عائشہ سے اتنے سال بڑی تھیں حضرت فاطمہؓ سے اتنے سال چھوٹی تھیں۔ اس سے نتیجہ نکال لیا گیا اس عقلمند سے کوئی پوچھے کہ صحیح روایات سند صحیح کے ساتھ جملہ کتب صحاح میں مذکور ہیں انکے معارضہ میں ایسی بے سند باتیں پیش کرنا اہل علم کا کام نہیں ہے، اور اگر صحاح کی مستند روایات میں یہ احتمال نکل سکتا ہے کہ راوی نے وہم یا نسیان سے عشرہ (دس کا عدد) چھوڑ دیا ہے تو حضرت اسماء اور فاطمہؓ کی عمر کے بے سند حساب میں یہ احتمال کیوں نہیں ہو سکتا کہ راوی کے اندازے میں غلطی ہوئی اسی طرح یہ دلیل بھی لچر ہے کہ حضرت عائشہؓ کو سورۃ القمر کی کچھ آیتیں مکہ میں یاد تھیں اور سورۃ القمر کا نزول نبوت کے پانچویں سال میں ہوا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد تیرہ یا پندرہ سال مکہ

میں رہی ہے تو اگر سورۃ القمر کے نزول کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سات سال مانی جائے تو ہجرت کے وقت ان کی عمر سولہ سترہ سال تھی (الخ) کیونکہ اس دلیل کا صحیح ہونا اس مقدمہ پر موقوف ہے کہ حضرت عائشہؓ نے سورۃ القمر کی وہ آیتیں نزول کے وقت ہی یاد کرلی تھیں بخاری یا مسلم میں اس کی تصریح کہاں ؟ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ نزول کے بہت بعد کسی سے سُن کر یاد کرلی ہونگی ؟ روایت کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ مکہ میں یہ آیت پڑھتی تھیں ۔ سیھزم الجمع ویولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھیٰ وامر حضرت ابوبکر صدیق رض حافظ قرآن تھے وہ نمازوں میں پڑھتے تھے جتنا اس وقت تک نازل ہو چکا تھا ان سے سُن کر یہ آیتیں یاد کرلی ہوں گی یہ کیا ضروری ہے کہ نزول کے وقت ہی یاد کی ہوں ۔ یہ انکے خود ساختہ دلائل کا حال ہے جن پر لمبے چوڑے دعووں کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اپنی طرف سے حساب لگا کر صحیح احادیث کو رد کیا جاتا ہے ۔ اس کے بعد مصنف نے چودہ علماء کے استدلال پر چوٹ کی اور اس کو عجیب وغریب کہہ کر رد کیا ہے علماء کرام نے سورۃ الطلاق کی اس آیت سے استدلال کیا تھا واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثۃ اشھر واللائی لم یحضن اور جو عورتیں حیض سے ناامید ہو جائیں اگر تم کو انکی عدت کے بارے میں شبہ ہو (چنانچہ لوگوں نے تردد ہی کی بنا پر سوال کیا تھا) تو (سُن لو) ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان عورتوں کی بھی جن کو (اب تک) حیض نہیں آیا " ظاہر ہے کہ جن لڑکیوں کو اب تک حیض نہیں آیا وہ عموماً نابالغ ہی ہوتی ہیں تو ان کی عدت طلاق تین مہینے بتلانا اس کی دلیل ہے کہ نابالغی کی حالت میں نکاح درست ہے کیونکہ طلاق اور عورت تو نکاح کے بعد ہی ہو سکتی ہے ہم بتلا چکے ہیں کہ اس آیت سے نابالغ لڑکیوں کے جواز نکاح پر امام جصاص رازی اور عام فقہائے بھی جیسے صاحب ہدایہ وغیرہ استدلال کیا ہے اس پر نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان بلند مرتبت چودہ علماء کو اتنی بات تو معلوم ہی ہو گی کہ بیوی کو مقاربت سے طلاق دے دی جائے تو عدت واجب نہیں ہوتی ۔ تو اگر اس آیت کا یہ مطلب لیا جائے کہ اس سے مراد نابالغ لڑکیاں ہیں کہ وہ بھی تین مہینے کے حساب سے اپنی عدت گذاریں تو ان حضرات کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عدت کا سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ان کمسن نابالغ لڑکیوں کے شوہر ان سے مقاربت بھی کرتے رہے ہوں تو اس طرح قرآن مجید صریحی طور پر کمسن نابالغ لڑکیوں کے ساتھ اگر نکاح کو جائز قرار دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے ساتھ ہی ان معصوم بچیوں کے ساتھ جنسی کھیل کھیلتے رہنے کی بھی اجازت دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۱۷۶)

اس عقلمند مصنف سے کوئی پوچھے کہ واللائی لم یحضن سے ایسی معصوم بچیاں اس نے کیوں کر سمجھ لیا جو ہمبستری کی صلاحیت بھی نہ رکھتی ہوں ؟ کیا وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ حیض آنے سے پہلے کوئی لڑکی بھی ہم بستری کے لائق نہیں ہوتی نہ اس کی خواہشمند ۔ اگر وہ ایسا دعویٰ کرے گا تو مشاہدہ اس کی تکذیب کرے گا ہمارا اور بہت لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ بعضے کھاتے پیتے رئیس شہریوں اور دودھ گھی مکھن کھجور کھانے والے دیہاتیوں کی لڑکیاں نو دس سال کی عمر میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے عام طور پر چودہ پندرہ سال کی لڑکیاں ہوتی ہیں وہ ہمبستری کے قابل ہیں اور اس کی خواہشمند بھی ہوتی ہیں اگر چہ ان کو حیض نہ آیا ہو اس آیت کا مصداق ایسی ہی لڑکیاں ہیں کیوں کہ کوئی باپ یا ولی اپنی لڑکی کو شوہر کے حوالہ اس وقت تک نہیں کرتا جب تک وہ مقاربت کے قابل نہ ہو جائے اس کے بعد لم یحضن اور ما حضن کا فرق بیان کر کے کہا گیا ہے کہ لم یحضن اس وقت استعمال ہوگا جب مقابلہ

لہ اور ان کا نکاح ہجرت سے تین سال پہلے ہوا ہے تو نکاح کے وقت ان کی عمر تیرہ چودہ سال تھی پھر بھی تمہارا مدعا ثابت نہ ہوا۔

لہ یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ عدت کے لزوم کے لئے مقاربت کا وقوع شرط نہیں ، بلکہ خلوتِ صحیح کافی ہے ۔ جب کہ لڑکی اپنی جسمانی حالت کے اعتبار ہمبستری کے قابل نظر آنے لگے ، اور اس وقت اگر شوہر کے ساتھ خلوت صحیح ہو جائے خواہ ہمبستری نہ ہو ، اس وقت بھی عدت واجب ہے ، اس لئے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ عدت ، کا وجوب جنسی قربت پر موقوف ہے (م ۔ فاران)

میں کوئی دعویٰ کر رہا ہو کہ حیض آگیا ہے یا کم از کم اقتضاء حال کا یہ تقاضا ہو کہ انہیں حیض آگیا ہے (ص ۱۷۷) یہ ان منکرین سنت اور متجددین کی عربی دانی ہے۔ جس پر فہم قرآن کے مدعی بنتے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ الم یجدک یتیما فاویٰ میں کس نے دعویٰ کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتیم نہیں یا کون سا اقتضاء حال موجود تھا جس سے آپ کی یتیمی کا انکار مترشح ہو رہا ہے پھر یہاں لم کیوں لایا گیا ما وجدک یتیما کیوں نہیں کہا گیا؟ پس میزان میں نفی "جحد بلم" کا لفظ پڑھ لیا تھا سمجھے خاک نہیں۔ لم اور ما میں صرف اتنا فرق ہے کہ لم تاکید نفی کے لئے ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں کسی دعویٰ یا انکار کا ہونا ضروری نہیں قرآن میں سینکڑوں جگہ لم کا استعمال ہوا ہے کیا کسی کو ہمت ہے کہ ہر جگہ مقابلہ میں دعویٰ یا اقتضاء حال سے انکار پیدا کر سکے؟ فرماتے ہیں کفار قیامت میں کہیں گے لم نک من المصلین ولم نک نطعم المسکین اور کہیں گے یلیتنی لم اوت کتابیہ ولم ادر ما حسابیہ۔ یہاں سوائے تاکید نفی کے اور کوئی وجہ استعمال لم کی نہیں اسی طرح لم یحضن میں بھی صرف تاکید مقصود ہے کہ ان لڑکیوں کی عدت طلاق بھی تین مہینے ہے جن کو واقعی حیض نہیں آتا اس پر دعویٰ یا انکار کا اضافہ کرنا اور فصاحت و بلاغت کے ڈھنڈورے برسانا نری جہالت ہے۔ پس یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس آیت سے وہی عورتیں مراد ہوں گی جو بالغ اور جوان ہو چکی ہوں یا اقتضاء حال کا یہ تقاضا ہو کہ انہیں ماہواری آنی چاہیئے مگر کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا (ص ۱۷۸) مگر حق یہ ہے کہ یہ آیت ان کو بھی شامل ہے اور ان نابالغ لڑکیوں کو بھی جن کی شادی تیرہ چودہ سال کی عمر میں حیض آنے سے پہلے کر دی گئی کیوں کہ ابھی نشو و نما کی وجہ سے وہ ہمبستری کے قابل اور اس کی خواہشمند ہو چکی تھیں۔ ہدایہ میں ہے وان کانت لاتحیض من صغر او کبر فعدتہا ثلثۃ اشہر لقولہ تعالیٰ واللائی یئسن من المحیض من نسائکم الآیہ — وکذا التی بلغت بالسن ولم تحض

عدّت کے احکام!

اس پوری کتاب میں بس یہ ایک بات مصنف کے قلم سے صحیح نکل گئی ہے کہ عائلی کمیشن کے اراکین نے عورت مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل یا تین مہینے (نوے دن) مقرر کی ہے ان میں جونسی مدت طویل ہو گی اسے اختیار کیا جائے گا اس دفعہ پر تعجب ہے کہ علماء کرام میں سے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا حالانکہ یہ دفعہ قرآن کے خلاف ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے امت میں سے عدت طلاق کے سلسلہ میں کسی کا بھی یہ مذہب نہیں ہے (ص ۱۸۲) پھر اس دفعہ کا منشا یہ ظاہر کیا ہے کہ شاید اس کے مصنفین کے پیش نظر یہ دشواری تھی کہ اگر تین مہینے سے کم میں وضع حمل ہو جائے تو عدت جلد پوری ہو جائے گی اور شوہر ایسی بیوی کو فوراً گھر سے نکالدے گا اور اس دشواری کا حل بتلایا ہے کہ قرآن نے اس کے ساتھ ہی ایسی بیوی کو دوسرے تحفظات خود عطا کئے ہیں جن کے بعد یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیئے۔ پھر سورۃ الطلاق کی آیت پیش کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وضع حمل کے بعد اگر مطلقہ عورت بچہ کو دودھ پلائیں تو انہیں اس کا معاوضہ دے دیا کرے"۔ مگر اس سے بھی دشواری حل نہیں ہوئی کیونکہ طلاق دینے والے شوہر کے ذمہ یہ واجب نہیں کہ مطلقہ ہی سے دودھ پلوائے آیت میں اس کی بھی تصریح ہے وان تعاسرتم فسترضع لہ اخریٰ اور اگر تمہیں اس میں کوئی تنگی محسوس ہو تو پھر کوئی دوسری عورت بھی دودھ پلا سکتی ہے اب مطلقہ کو تو معاوضہ نہ ملا۔ اس کے بعد دوسرا حل یہ پیش کیا گیا ہے کہ سورۂ بقرہ میں مرنے والے شوہروں کو یہ تاکید بھی فرمائی گئی ہے کہ تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں۔ انہیں اپنی بیوی کے متعلق یہ وصیت کرنی چاہیئے کہ وہ ایک سال تک متوفی کے مکان میں رہ سکتی ہیں انہیں کوئی نکالے نہیں (۲ : ۲۴۰) مگر یہ بھی مشکل کو حل نہیں کرتی کیونکہ یہ حکم طلاق والی عورتوں کے متعلق نہیں بلکہ بیواؤں کے متعلق تھا اور اب بالاجماع منسوخ

ہو چکا ہے اب ایک سال کی مدت نہ بیواؤں کے لئے ہے نہ مطلقات کے لئے۔ اس پر یہ مشورہ مرتب کرنا کہ اس حکم کی اسپرٹ کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت ایک ایسی دفعہ کا تو اضافہ کر سکتی ہے کہ شوہر یا اس کے خاندان کے لوگ مقررہ عرصہ تک (مطلقہ) بیویوں کو نہ نکال سکیں مگر اس کے لئے خود عدت کی مقررہ مدت میں اضافہ کر دینا مناسب نہیں (صفحہ ۱۸۴) غلط مشورہ ہے کیونکہ جیسا عدت میں اضافہ کرنا خلاف اجماع ہے اسی طرح عدت طلاق گذر جانے کے بعد شوہر یا اس کے خاندان کو مطلقہ کے نفقہ اور سکنیٰ کا مقررہ عرصہ تک ذمہ دار قرار دینا بھی خلاف اجماع ہے یہ کسی کا بھی مذہب نہیں مولانا احتشام الحق صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ میں اس پر مختصر سا اشارہ کیا ہے کہ (مطلقہ کو عدت کے بعد نفقہ کا حق نہیں)۔ اس دشواری کا اصلی حل یہ ہے کہ عورتوں کو یہ مسئلہ ذہن نشین کرا دیا جائے کہ مہر کا معاف کرنا ہر حالت میں ثواب نہیں صرف اسی صورت میں ثواب ہے کہ عورت مالدار ہو اور شوہر غریب ہو اور مرتے دم تک مہر ادا نہ کیا ہو تو اس کی موت کے وقت یا مرنے کے بعد مہر معاف کر دے اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو کہ عورت غریب اور شوہر مالدار ہو اس صورت میں مہر معاف کرنا ثواب نہیں خیر الصدقۃ ما کان عن ظہر غنی نہ زندگی میں معاف کریں نہ شوہر کی موت کے بعد بلکہ اپنا دین مہر اس کے ذمہ واجب رکھیں اگر طلاق یا شوہر کی موت ہو جائے تو عدت کے اندر یا عدت کے بعد مہر پورا وصول کر لیں اور شادی کے لائق عمر ہو تو نکاح کو عیب نہ سمجھیں دوسرا نکاح اچھی جگہ کر لیں۔ عورتوں کی ساری پریشانی کی جڑ ان کی جہالت ہے کہ مہر معاف کرنے کو ہر حالت میں ثواب اور دوسرا نکاح کرنے کو سراسر عیب سمجھ لیا ہے اور معاشرہ بھی ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا رہا ہے کہ مرد مہر سے سبکدوش ہو گئے۔ اور خاندان والے بیوہ عورت کو بغیر نکاح کے بٹھا کر اپنے گھر کی خدمت اس سے لیتے ہیں۔

خلاصۂ بحث!

اخیر میں یہ بتلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا احتشام الحق صاحب نے عائلی کمیشن کی رپورٹ پر جو اختلافی نوٹ لکھا ہے وہ تنہا ان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ وہ اس میں پوری جماعت علماء کی نمائندگی کر رہے تھے اس کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ ارکان کمیشن میں سے ایک رکن کی یہ رائے ہے باقی سب اس کے خلاف ہیں کیونکہ اس اختلافی نوٹ کی اشاعت کے بعد ہر طرف سے علماء نے اس کی تائید میں مقالے اور رسالے لکھ کر بتلا دیا ہے کہ ان کی پشت پر علماء کی پوری جماعت ہے پھر نکاح و طلاق میراث امور تشریعیہ میں سے ہیں ان کا فیصلہ ووٹوں کی کثرت و قلت سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ کتاب و سنت و اجماع امت و اقوال مجتہدین سلف کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے اس مقالہ کو انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس اختلافی نوٹ میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہی حق صریح اور پوری امت کے نزدیک کمیشن کے سوالات کا وہی جواب صحیح ہے

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین!

نوٹ:۔ اس مضمون میں علامہ ابن قیم کی کتاب (اعلام الموقعین) کو فاضل مضمون نگار نے "اعلام الموفقین" لکھا ہے ہمارے استفسار پر مولانا موصوف نے جواب دیا کہ ان کے استاد حضرت مولانا انور شاہ مرحوم اس کتاب کا تلفظ "اعلام الموفقین" ہی کیا کرتے تھے۔ (م۔ق)

فردوسِ تغزل

تسکین قریشی

نشاطِ دل کے لئے یہ خیال کم بھی نہیں
کہ تیرے غم کے سوا اور کوئی غم بھی نہیں
خوشا فراق، کہ تنہائیوں کا غم بھی نہیں
ترا خیال تری انجمن سے کم بھی نہیں
حسیں خلش بھی نہیں، دلنشیں ستم بھی نہیں
نہ ہو سُرورِ محبت تو لطفِ غم بھی نہیں
اُمیدِ دید نہ ہو، نامراد ہم بھی نہیں
کہ تیری یاد، ترا انتظار کم بھی نہیں
نجانے کون سی لغزش ہوئی کہ مدت سے
فغانِ شب بھی نہیں آہِ صبحدم بھی نہیں
بنالیا ہے محبت کو رہنما میں نے
کوئی مقام ہو اب مجھ سے دو قدم بھی نہیں
اک اور دل بھی دھڑکتا ہے میرے دل کے قریب
تمام عمر نہ ہو اب سکوں تو غم بھی نہیں!
میں ہر مقام جنوں سے گذر گیا لیکن
وہاں گرا ہوں جہاں کوئی پیچ و خم بھی نہیں
ہماری حسن پرستی پہ کیوں ہیں چیں بہ جبیں
کچھ ایسے پاک نظر شیخِ محترم بھی نہیں
وہ میرے دردِ رفاقت کی قدر کیا جانے
جو ہمسفر بھی ہے اور میرا ہمقدم بھی نہیں
شکستِ دل ہو مبارک تجھے کہ اے تسکین
ملال اُن کو بھی ہے اور تجھ سے کم بھی نہیں

اُمید ڈبائیوی

یہ خود فریبیٔ احساسِ آرزو تو نہیں
تری تلاش کہیں اپنی جستجو تو نہیں
حجاب اُٹھے ہیں لیکن وہ روبرو تو نہیں!
شریکِ عشق کہیں کوئی آرزو تو نہیں
کہاں یہ عشق کا عالم کہاں وہ حسنِ تمام
یہ سوچتا ہوں کہ میں اپنے روبرو تو نہیں
سکوت وہ بھی مسلسل سکوت کیا معنے
کہیں یہی ترا اندازِ گفتگو تو نہیں
چمن میں رکھتے ہیں کانٹے بھی اک مقامِ ابد دست
فقط گلوں سے ہی گلشن کی آبرو تو نہیں

جلیل قدوائی (ایم - اے)

ہنسی بھی اہلِ جنوں کی فغاں سے ملتی ہے
بہار میرے چمن کی خزاں سے ملتی ہے
مجھی سے اُس کو حیا ہے، مجھی سے اُس کو لحاظ
تری نگاہ جو سارے جہاں سے ملتی ہے
تمام بزم کی تحسین بدل نہیں اُس کا
جو داد اُس لبِ شکر فشاں سے ملتی ہے

محمد زکی کیفی

وفا کا رنگ جہاں میں نکھارتے چلیئے
چراغِ عشق کی لو کو ابھارتے چلیئے
سنا ہے دیر و حرم بھی ہیں راہ میں اُن کی
وہاں بھی سجدۂ مستی گذارتے چلیئے
دل و نگاہ کی دنیا ہزار برہم ہو
کسی کے گیسوئے برہم سنوارتے چلیئے
عروسِ شام نگارِ سحر بہارِ چمن
کسی بھی نام سے ان کو پکارتے چلیئے

شبِ فراق نہیں زندگی جو کٹ نہ سکے
گذر ہی جائے گی اس کو گذارتے چلئے
عجیب شئے ہے جہاں میں شکستگی دل کی
اسی میں جیت ہے کیفی کہ ہارتے چلئے

اختر سکندروی

چاندنی رُخ بدل گئی ساقی
دیکھ تو رات ڈھل گئی ساقی
پھر خوشی چال چل گئی ساقی
زندگی غم میں ڈھل گئی ساقی
پھر چمن میں ہوا اُجالا سا
پھر کوئی شاخ جل گئی ساقی
اب کہاں اذنِ نالہ و فریاد
رسمِ محفل بدل گئی ساقی
مجھ سے دنیا نے دیں ہوش لیا
میں گرا وہ سنبھل گئی ساقی

عاشق ذبیحی

پھولوں کی طرح چاک گریباں کریں گے ہم
دورِ خزاں کو فصلِ بہاراں کریں گے ہم
تنکوں کو آشیاں کے فروزاں کریں گے ہم
اب کے تو ایسے جشنِ بہاراں کریں گے ہم
جھوٹی تسلیوں کا سہارا بھی خوب ہے
پیماں شکن سے پھر نئے پیماں کریں گے ہم
راہِ طلب میں خود کو مٹا کر بہ نامِ عشق
اس نقشِ پا کو اور نمایاں کریں گے ہم
عاشق کچھ اور بھی ہیں تقاضے حیات کے
کب تک تصورِ رُخِ جاناں کریں گے ہم

فضل کریم فضلی

زیرِ لب فریاد پر ہی سرگراں صیاد ہے
اور نصیب دشمناں یہ لے اگر بڑھتی گئی
گلستاں اُجڑا کرے گا باغباں کوئی بھی ہو
آج تک بدلا ہے آئینِ چمن بندی کہیں
اور آجائے گی آفت۔ فضلی
حال اُن سے کہیں کہنا بھی نہیں

ارم لکھنوی

کبھی سر بھی رکھدیں گے اُنکے قدم پر
ابھی صرف نقشِ قدم دیکھتے ہیں!

ادیب سہارنپوری

اتنی سی بات کے ہیں اب شہر شہر چرچے
حالانکہ اس گلی میں ہم کم سے کم گئے ہیں

اشک رامپوری

محتسب نے جو نکالا ہمیں میخانے سے
دور تک آنکھ ملاتے گئے پیمانے سے

تابش دہلوی

اتنے تارے خیال نے توڑے
آسماں کھو گئے زمینوں میں

جلیل مانک پوری

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

مولانا عبدالقدیر بدایونی

پھر بھی واپس ہے تو آپ اے بادولت جانیئے
دل کہ جس کے صرف لے لینے کو قیمت جانیئے

جگر مرادآبادی

مدت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے
تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے

ماہر القادری

نقاب اُٹھتے ہی بیگانہ ہو گئیں نظریں
مری نگاہ نے جلووں سے انتقام لیا

سید ابوالاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

......یہ ساری بدنظمی جس کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، محض علمی مقالات اور فلسفیانہ بحثوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ فی الواقع دنیا کے تمدن و تہذیب میں عملاً اس کا عکس پوری طرح نمایاں ہو رہا ہے۔ آپ کے تمدن میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، خواہ وہ کار فرمائی کے مقام پر ہوں یا کارکنی کے مقام پر یا کار فرماؤں اور کارکنوں کے بنانے میں لگے ہوتے ہوں، یہ سب خیر و شر اور صحیح و غلط جانچنے کے لئے اپنے اپنے طور پر انہی مختلف ماخذوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں، اور ہر شخص اور ہر گروہ کا خیر و شر دوسرے کے خیر و شر سے الگ ہے حتیٰ کہ ایک کا خیر دوسرے کا انتہائی شر ہے اور ایک کا شر دوسرے کا انتہائی خیر۔ اس بدنظمی نے اخلاق کے لئے کوئی پائیدار بنیاد باقی ہی نہیں رہنے دی ہے۔ جن چیزوں کو دنیا میں ہمیشہ سے جرم سمجھا جاتا رہا ہے آج کسی نہ کسی گروہ کی نگاہ میں وہ عین خیر ہیں یا مطلقاً خیر نہیں تو اضافی خیر بن گئی ہیں۔ اسی طرح جن بھلائیوں کو ہمیشہ سے انسان خوبی سمجھتا رہا ہے ان میں سے اکثر آج حماقت اور مضحکہ خیز قرار پا چکی ہیں اور مختلف گروہ ان کو شرم کے ساتھ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ علانیہ پامال کر رہے ہیں۔ پہلے جھوٹا جھوٹ بولتا تھا مگر معیار اخلاق سچائی ہی کو مانتا تھا لیکن آج کے فلسفیوں نے جھوٹ کو خیر بنا دیا ہے اور جھوٹ بولنے کا ایک مستقل فن مدون کیا جا رہا ہے اور بڑے بڑے پیمانے پر قومیں اور سلطنتیں جھوٹ پھیلا رہی ہیں۔ یہی حال بداخلاقی کا ہے کہ پہلے بداخلاقیاں، بداخلاقیاں ہی تھیں مگر آج نئے فلسفوں کے طفیل میں وہ سب مطلق یا اضافی خیر میں تبدیل کر دی گئی ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے تیسرا سوال یہ ہے کہ قانون اخلاق کے پیچھے وہ قوت کونسی ہے جس کے زور سے یہ قانون نافذ ہو؟ اس کے جواب میں مسرت اور کمال کے پرستار کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنی پیروی کرانے کی طاقت آپ ہی اپنے اندر رکھتی ہیں اور رنج یا پستی کی طرف لے جانے والی برائیاں آپ اپنے ہی زور پر اپنے سے اجتناب کرا لیتی ہیں اس کے سوا قانونِ اخلاق کے لئے کسی خارجی اقتدار کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قانون فرض انسان کے ارادۂ معقول کا اپنے اوپر آپ عائد کیا ہوا قانون ہے، اس کے لئے کسی بیرونی زور کی حاجت نہیں۔ تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانونِ اخلاق کی اصل قوتِ نافذہ سمجھتا ہے اور اس مسلک کی رو سے اسٹیٹ کی طرف وہ تمام اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں جو پہلے خدا کے لئے تھے یعنی باشندوں کے حق میں یہ فیصلہ کرنا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ چوتھے گروہ نے یہ مرتبہ اسٹیٹ کے بجائے سوسائٹی کو دیا ہے۔ یہ سب جوابات فساد کی بے شمار صورتیں دنیا میں عملاً پیدا کر چکے ہیں اور اب تک کر رہے ہیں۔ پہلے دونوں جوابوں نے انفرادی خودسری و بے راہ روی یہاں تک بڑھا دی کہ اجتماعی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کا ردِ عمل اُن فلسفوں کی صورت میں رونما ہوا جنھوں نے یا تو اسٹیٹ کو خدا بنا کر افراد کو بالکل اس کا بندہ بنا ڈالا یا پھر افراد کی روٹی کے ساتھ ان کے خیر و شر کی باگیں بھی اجتماع کے ہاتھوں میں دے دیں۔ حالانکہ سبوح و قدوس نہ اسٹیٹ ہے نہ اجتماع۔

یہی معاملہ اس سوال کے جواب میں پیش آتا ہے کہ وہ کونسا محرک ہے جو انسان کو اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم اخلاقی احکام کی پابندی پر آمادہ کرے؟ کسی کے نزدیک بس خوشی کی طمع اور رنج و تکلیف کا خوف اس کے لئے کافی محرک ہے۔ کوئی محض کمال کی

خواہش اور نقص سے بچنے کی تمنا کو اس کے لئے کافی سمجھتا ہے۔ کوئی اس کے لئے محض آدمی کے اپنے جذبہ احترام قانون پر اعتماد کرتا ہے کوئی اسٹیٹ کے اجر کی امید اور اس کے غضب کے خوف کو اہمیت دیتا ہے اور کوئی اجتماع کے اجر اور اس کے غضب کو طمع و خوف کے لئے استعمال کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے ان میں سے ہر جواب نے عملاً ہمارے اخلاقی نظامات میں سے کسی نہ کسی کے اندر تقدم کا مقام حاصل کیا ہے، اور تھوڑا سا تجسس کرنے پر یہ حقیقت بآسانی کھل سکتی ہے کہ یہ سب محرکات بداخلاقی کے لئے بھی اتنے ہی اچھے محرک بن سکتے ہیں جتنے خوش اخلاقی کے لئے۔ بلکہ ان میں بداخلاقی کے لئے محرک بننے کی قوت بہت زیادہ ہے اور بہرحال کسی اعلیٰ درجہ کی اخلاقیت کے لئے تو یہ تمام محرکات قطعاً ناکافی ہیں۔

یہ بہت مختصر جائزہ جو میں نے دنیا کی موجودہ اخلاقی حالت کا لیا ہے اس سے بیک نظر یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اس وقت ایک ہمہ گیر اخلاقی انتشار پایا جاتا ہے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر انسان کوئی ایسی بنیاد نہیں پا سکا جس پر وہ قابلِ اطمینان طریقے سے اپنے اخلاق کی تعمیر کرتا۔ اخلاق کے سارے بنیادی سوالات اس کے لئے حقیقتہً لاجواب ہو کر رہ گئے۔ نہ وہ اُس خیر برتر کا کہیں سراغ لگا سکا جو اس کی کوششوں کا منتہا بننے کے قابل ہوتی اور جس کے لحاظ سے اعمال کے نیک یا بد اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ اسے وہ ماخذ کہیں ہاتھ لگا جس سے وہ صحیح طور پر معلوم کر سکتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا۔ نہ اسے وہ اقتدار فراہم کرنے میں کامیابی ہوئی جس کے حکم کی بنا پر اخلاق کے کسی بلند، جامع اور عالم گیر ضابطہ کو قوتِ نفاذ حاصل ہوتی۔ اور نہ اسے کوئی ایسا محرک مل سکا جو انسانوں میں راستی پر عمل کرنے اور ناراستی سے پرہیز کرنے کے لئے حقیقی آمادگی پیدا کرنے کے قابل ہو۔ خدا سے بغاوت کر کے انسان نے خودسری کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہا اور اپنے نزدیک حل کیا بھی۔ مگر یہ اُسی حل کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو آج ہم کو اخلاقی تنزل کے ایک خوفناک طوفان کی شکل میں اٹھتے اور پوری انسانی تہذیب کو تباہی کی دھمکیاں دیتے نظر آ رہے ہیں۔

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اُس بنیاد کو تلاش کریں جس پر انسانی اخلاق کی صحیح تعمیر ہو سکے؟ فی الواقع یہ تلاش و جستجو محض ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے اور وقت کی نزاکت نے اس کو اہم ترین ضروریات بنا دیا ہے .... اس لحاظ سے میں اپنی تلاش کے نتائج پیش کرتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں وہ نہ صرف میرے ان نتائج پر ٹھنڈے دل سے غور کریں بلکہ خود بھی سوچیں کہ اخلاقِ انسانی کے لئے آخر کونسی بنیاد صحیح ہو سکتی ہے۔

میں اپنی تلاش و تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اخلاق کے لئے صرف ایک ہی بنیاد صحیح ہے اور وہ اسلام فراہم کرتا ہے۔ یہاں فلسفۂ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کا جواب ہم کو ملتا ہے اور ایسا جواب ملتا ہے جس کے اندر وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جو فلسفیانہ جوابات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں مذہبی اخلاقیات کی اُن کمزوریوں میں سے بھی کوئی کمزوری موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے وہ نہ کسی مستحکم سیرت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ انسان کو تمدن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہمہ گیر اخلاقی رہنمائی ملتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کے انتہائی ممکن درجات تک ہمیں لے جا سکتی ہے۔ یہاں وہ اخلاقی اصول ہم کو ملتے ہیں جن پر ایک صالح ترین نظامِ تمدن قائم ہو سکتا ہے اور اگر ان اصولوں پر انفرادی و اجتماعی کردار کی بنا رکھی جائے تو انسانی زندگی اُس فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے جس سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ اس نتیجہ پر میں کن دلائل سے پہنچا ہوں؟ اس کی مختصر تشریح میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاری مرحوم

میری جوانی کا زیادہ تر حصّہ حیدر آباد دکن میں گزرا ہے، یو۔پی، پنجاب، بہار اور دوسرے صُوبوں کے مشاہیر کے حالات اور خبریں، دکن ہی میں دوسروں کی زبانی سُنا کرتا تھا، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر و خطابت کی شہرت میں نے وہیں سُنی اور تواتر کے ساتھ اہل علم کی زبانی سُنی، اخبارات میں بھی اُن کا ذکر آتا تھا، دل چاہتا تھا کہ شاہ صاحب (مرحوم) سے ملوں، بات چیت کروں اور اُن کی تقریر سُنوں! مگر شاید میری یہ تمنا خام تھی، اس لئے مشیت کا ایما۔ تھا:۔

اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

میں حیدر آباد دکن سے اپنے وطن سال کے سال آیا کرتا تھا، ایک بار اپنے ایک عزیز کے یہاں علی گڑھ میں آکر ٹھیرا، تو ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پرسوں مُسلم یونیورسٹی میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر تھی۔ یہ خبر سُن کر اپنی محرومی پر افسوس ہوا کہ میں آج کی بجائے، دو دن پہلے آجاتا، تو شاہ صاحب کی تقریر سُننے کا ارمان پورا ہو جاتا، یہ میں بائیس برس پہلے کی بات بیان کر رہا ہوں۔

اُن صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب کی خطابت نے سُننے والوں پر جادو سا کر دیا، خاصی طویل تقریر فرمائی، مگر سامعین نے ذرا سی بھی اُکتاہٹ محسوس نہیں کی، شاہ صاحب نے فرمایا:۔

"سیفٹی ریزر سے گالوں کو کھرچنے سے جوانی ظاہر نہیں ہوتی، جوانی تو وہ ہے جو رخساروں کے بال بال سے پھوٹ نکلے ......"

طلباء اور پروفیسروں کی غالب اکثریت "ڈاڑھی مُنڈوں" کی تھی، شاہ صاحب کے یہ جُملے سُن کر وہ نادم سے ہو گئے اور کسی کسی کے تو سُنا ہے کہ ماتھے پر پسینہ آگیا۔

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم، جو خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے، ایک بار انھوں نے مجھ سے فرمایا —— کہ مولانا آزاد سے ٹرین میں ملاقات ہو گئی، کئی گھنٹہ اُن کا ساتھ رہا، میں نے اُن سے "اجتہاد" کے بارے میں دریافت کیا، بولے:۔

"نواب صاحب! اگر دین میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا،

—— تو ——

اس کے معنی یہ ہیں کہ "سعادت و فلاح" کی راہ میں دیواریں کھڑی کر دی گئیں ...."

نواب صاحب مرحوم نے فرمایا کہ مولانا کی آزاد کی بات چیت ہی میں "تقریر و خطابت" کا لُطف آگیا —— مگر نواب بہادر جنگ مرحوم

کی شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی، خود شاہ صاحب بھی نواب صاحب سے ملنے کی تمنا رکھتے تھے!

بعض اربابِ ذوق شاہ صاحب مرحوم کے جُملوں کی نقل اُنہی کے لہجہ میں کرتے، ایسی باتوں نے میری آتشِ شوق کو اور تیز کردیا۔ ایک صاحب نے بیان کیا کہ گونڈے میں شاہ صاحب نے عشاء کے بعد تقریر شروع کی ہے، تو فجر کے وقت یہ شعر ؎

محفل خموش صُبح کے آثار جلوہ گر
اب حکم ہو تو ختم کروں داستاں کو میں

اپنے مخصوص دل کش ترنم میں پڑھا، اور تقریر جب ختم کی ہے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا، اور لوگ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا سامعہ سچ مچ رات بھر "کوثر و تسنیم" میں ہلکورے لیتا رہا ہے ——— خطابت شاہ صاحب کی کرامت تھی"

(غالباً) سنہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے کہ لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے میں میرا لائل پور جانا ہوا، اور وہاں جاکر یہ مژدہ ملا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں! جناب انور صابری پہلے سے لائل پور میں براجمان تھے، وہ شاہ صاحب سے مل بھی چکے تھے، میں نے شاہ صاحب کا ذکر چھیڑا تو بولے، میں تمہیں لے کر ابھی ابھی شاہ صاحب کی قیام گاہ پر چلوں گا، وہ بھی تم سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب مرحوم کے یہاں جو پہنچنا ہوا، تو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے، اور خوب بھینچ بھینچ کر بغل گیر ہوئے، ان کی اس پذیرائی، غیر معمولی شفقت اور خورد نوازی کو دیکھ کر میں "فرشِ پا انداز" ہوا جاتا تھا بیٹھتے ہی بولے:-

"..... تمہارے شعروں سے میں کیا کام لیتا ہوں ..... یہ میری تقریروں سے معلوم ہوگا۔"

پھر انکے اصرار پر شعر خوانی ہوئی، ایک غزل سُنا چکتا، تو دوسری کے لئے فرمائش کرتے، داد دینے کا انداز والہانہ تھا، میں نے زندگی میں بہت ہی کم لوگوں کو اتنی صحیح اور معقول داد دیتے ہوئے دیکھا ہے!

دوسرے دن شام کو شاہ صاحب کی تقریر تھی، اُن کی تقریر سننے کا اشتیاق کشاں کشاں مجھے جلسہ گاہ میں لے گیا، شاہ صاحب نے تقریر کے آغاز ہی میں فرمایا:-

"دو آدمیوں کی دو تمنائیں تھیں ..... ایک کی تمنا پوری ہوگئی، یعنی میں نے ماہر القادری کا کلام اُن کی زبان سے سُن لیا ماہر القادری میری تقریر سننے کی تمنا رکھتے ہیں، مگر میں اتنے بہت سے پنجابی بولنے والوں کو نظر انداز کرکے صرف اُن کے لئے "اردو" میں تقریر کیسے کروں؟! مگر پھر بھی میں اپنی تقریر میں ماہر القادری کے شوق و تمنا کی رعایت ملحوظ رکھوں گا۔"

حضرت شاہ صاحب نے ملی جلی "اردو اور پنجابی" میں تقریر کی، یہ غالباً اُن کا پہلا تجربہ تھا، زبان کی اس دورنگی اور "دو عملی" نے تقریر میں خاصہ تکلف پیدا کردیا، اتنے میں ایک صاحب کار لے کر مجھے لینے کے لئے آگئے۔ ڈپٹی کمشنر کے یہاں شاعروں کا ایٹ ہوم تھا۔

اس واقعہ کے کوئی دو ڈھائی سال بعد، دلّی میں شاہ صاحب کی تقریر کا اعلان ایک پوسٹر میں نظر سے گزرا، میں رات کو ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں پہونچا، ہزاروں کا مجمع پہلے سے موجود تھا اور لوگ آتے چلے جا رہے تھے، شاہ صاحب نے کلامِ پاک کی تلاوت کے بعد، میر کے اس شعر سے اپنی تقریر کا آغاز کیا

اک موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

یہ وہ زمانہ تھا جب وہ مسلم لیگ کے شدید مخالف تھے اور سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے مسلک کے پورے پورے متبع اور مقلد تھے، شاہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا :-

"اتنا بڑا مجمع ——— کہ یہاں سے تھالی اُچھال دوں، تو شاید ایک فرلانگ تک وہ تھالی سروں ہی پر اچھلتی اور تیرتی رہے ——— مگر میں سننے والوں کی اس بھیڑ سے کچھ خوش نہیں ہوں، تم لوگ کانوں کے عیاش ہو ۔ ۔ ۔ تم تقریر کے چٹخاروں کی خاطر یہاں آئے ہو ۔ ۔ ۔ دوسرے کیمپ والوں کا جلسہ ہوتا ہے، تو وہاں بھی تم اسی ذوق و شوق کے ساتھ جاتے ہو ۔ ۔ ۔"

شاہ صاحب نے جب تقریر ختم کی ہے، تو تین گھنٹے ہو چکے تھے، مگر محسوس یہ ہو رہا تھا کہ تقریر شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی شاہ صاحب کی شگفتہ بیانی نے وقت کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا اور نہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد بڑے سے بڑے خطیب اور مقرر کی تقریر کھلنے لگتی ہے!

اس کے بعد سنہ ۱۹۴۸ء میں اُنہیں ملتان میں بسوں کے اڈے پر اس حالت میں کھڑا دیکھا کہ میلے کپڑے پہنے تھے اور ہاتھ میں خاصہ لمبا لٹھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ضلع مظفر گڑھ کے کسی گاؤں یا قصبہ میں قیام پذیر تھے، اور مشہور یہ تھا کہ سیاست سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔

——— پھر شاہ صاحب نے ———

ملتان کو اپنی اقامت گاہ بنا لیا، بنی شیر خاں کے ایک معمولی سے کچے مکان میں رہتے تھے، میں دو بار اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑے مزے کی چائے پلائی، چائے کے ساتھ کچھ "لوازمات" بھی تھے، اور ان سب سے بڑھ کر اُن کے لطیفے اور چٹکلے (چائے کی پیالی میں اُن کے تبسم کی شکر گھل جانے سے، لُطف دوبالا ہو گیا، پہلی بار کی حاضری میں مجھ سے کہا اپنا "سلام سناؤ" میں نے عرض کیا، آپ تو کئی بار سُن چکے ہیں، فرمایا ۔ ۔ ۔ "بھئی! کچھ پردے میں رہنے والے بھی آپ کا "سلام" سُننا چاہتے ہیں"

خاصی دیر تک شعر خوانی رہی، میرے اصرار پر اپنی فارسی نعتیہ غزلیں بھی سُنائیں! شاہ صاحب کے بوریئے پر بیٹھ کر، شعر سُننے اور سُنانے کا جو لُطف آیا، وہ لُطف قیمتی صوفوں اور بیش قیمت قالینوں پر بھی میسر نہیں آیا، یہی وہ شانِ فقر ہے، جس کے آگے سطوتِ شاہی دبتی اور مجرموں کی طرح شرماتی نظر آتی ہے۔

کراچی میں "تحفظِ ختمِ نبوت" کا دفتر میرے مکان سے قریب ہی تھا، جب بھی شاہ صاحب کراچی تشریف لاتے، میں اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا، ایک بار اُن کا ملتان سے آنا ہوا، مجھ سے پہلی ملاقات میں فرمایا۔

"آپ کا لکھا ہوا افسانہ ابو ذر (شاہ صاحب کے صاحبزادے) نے مجھے راستہ میں سنایا تھا افسانہ خوب تھا ۔ ۔ ۔ مگر افسانہ پھر افسانہ ہے اس میں "جھوٹ" ہی تو ہوتا ہے۔"

پاکستان اور مسلم لیگ کا ایک بار ذکر چھڑا، تو کہنے لگے :-

"بھائی! پاکستان کے معاملہ میں ہمارا معاملہ ابو سفیان کے ایمان جیسا ہی ۔ ۔ ۔"

تقریباً ڈیڑھ سال اُدھر کی بات ہے کہ میرا مظفر گڑھ کے مشاعرے میں جانا نکل آیا، وہاں آتے جاتے، جناب صابر دہلوی کے یہاں ملتان ٹھیرنا ہوا، پتہ لگا کہ شاہ صاحب بیمار ہیں، میں عاصی کرنالی صاحب کو ساتھ لے کر بستی شیر خاں پہونچا، وہاں جاکر پتہ لگا کہ شاہ صاحب لاہور تشریف لے گئے ہیں! اُن سے نہ ملنے کا اُس وقت بھی افسوس رہا، اور اب جب کہ وہ اس دُنیا میں نہیں رہے، یہ افسوس رنج و ملال میں بدل گیا۔

میرا ہی شعر ہے:—

کیا کام اُسے معرکۂ تیغ و سناں سے

واعظ تو فقط زینتِ منبر کے لئے ہے

——— مگر ———

شاہ صاحب ایسے واعظ تھے، جو منبر کی زینت بھی تھے، اور معرکۂ تیغ و سناں میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، انگریز کے مستبد دور میں حق گوئی کی بدولت جوانی کا آخری زمانہ اور اس کے بعد کے چند سال قید و بند کی مصیبت میں بسر کئے چھوٹتے اور پھر گرفتار کر کے بند کر دیتے جاتے، یہ سلسلہ ایک دو نہیں اٹھارہ سال تک چلتا رہا، توپ بندوق اور بم کے گولے تو گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے بھی نہیں چھوڑے، انگریز کی مخالفت اور اس کی پاداش میں جیل خانہ، تمام آزادی پسند لیڈروں کا یہی رول رہا ہے! شاہ عطاء اللہ بخاری مرحوم قربانی اور آزادی کی جدوجہد کی منزل میں "مُقدمۃ الجیش" سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔

عشقِ رسولؐ اُن کی سیرت و کردار کا سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے، حضورؐ خاتم النبیین کی محبت اُن کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی، قادیان کی جھوٹی نبوت کے خلاف انھوں نے "لسانی جہاد" کیا ہے، بس یہی عملِ خیر اُن کی مغفرت کے لئے کافی ہے! (انشاء اللہ العزیز)

شاہ صاحب کو جو غیر معمولی شہرت ملی اور قبولِ عام حاصل ہوا، اُس کا سبب اُن کی خطابت تھی جس نے اُنکی شخصیت کو بھی چمکا دیا وہ بڑے حسین وجیہہ اور خوش شکل انسان تھے، سُرخ سپید رنگ، خوب صورت ناک نقشہ، آواز میں درد اور لہجہ میں شیرینی! تقریر کرنے کے لئے اسٹیج پر آتے، تو اُن کی صورت دیکھتے ہی لوگوں کے دل کھنچنے لگتے! سُننے والوں کی دلچسپی کے لئے ہر چیز اُن کے پاس تھی ——— شکل و صورت، آواز، لہجہ، طرزِ ادا، شیرینی، نغمگی، طنز، لطیفے، چٹکلے ——— کلام پاک کی تلاوت میں کس قیامت کا سوز اور درد تھا؎

وہ پڑھیں اور سُنا کرے کوئی

شعر پڑھنے کا انداز اور زیادہ دل نشین تھا۔ تقریر کرتے کرتے موضوع سے دور چلے جاتے، تو ان کی خطابت کا زور اور بیان کی دل نشینی اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتی! ایسا بھی ہوتا کہ کسی پر طنز کرتے ہوئے، ملاحیوں سے بھی بہت آگے تک پہونچ جاتے میں نے خود دیکھا کہ کراچی کے آرام باغ میں شاہ صاحب تقریر کر رہے ہیں اور قادیانیت کے سلسلہ میں طنز عریاں ہوتی چلی جا رہی ہے، اس پر مولانا محمد علی جالندھری نے اُن کے کرتہ کو ۲ دو بار آہستہ سے کھینچا، اس کے بعد وہ فوراً سنجیدہ بن گئے۔

حضرت شاہ صاحب اپنی ذات سے نیک اور خیر پسند تھے، لیکن بعض غلط اندیش ساتھیوں اور رفیقوں سے متاثر بھی ہو جاتے اور اُن کی بنائی ہوئی اسکیم کی تائید فرماتے، یہ حقیقت عالم آشکارا ہے کہ تحریک "تحفظ ختم نبوتؐ" لاہور میں جو ہنگامہ آفریں صورت اختیار کی تھی، اُس کی ناکامی نے پاکستان میں دینی محاذ کو کس قدر کمزور کر دیا، اُس کے بعد سے اسلام پسندوں

اور دینداروں کی مشکلات اور اُلجھنیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اور اب یہ حال ہے ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اللہ تعالیٰ شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کی قبر کو خنک اور روشن رکھے کہ وہ اپنی ذات سے سچ مچ ایک انجمن واقع ہوئے تھے، ان کی زندگی جفاکشی اور مجاہدہ کی زندگی تھی۔ آدابِ شریعت کی نگہداشت وہ کرتے تو اور کون کرتا کہ وہ "امیرِ شریعت" تھے۔ (برّد اللہ مضجعہ و نور اللہ قبرہٗ)

ہماری نظر میں

تذکرہ علمائے ہند تالیف :- مولوی رحمان علی مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری (مقدمہ ڈاکٹر سید معین الحق) ضخامت ۶۰۸ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت پندرہ روپے،

ملنے کا پتہ :- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ۳۰ - نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر (۵)

یہ تذکرہ مولوی رحمان علی (پیدائش ۱۸۲۸ء وفات ۱۹۰۷ء) کی تالیف ہے جس کا فارسی زبان سے ترجمہ جناب محمد ایوب قادری (بی اے) نے کیا ہے، یہ کتاب ۱۸۸۷ء میں لکھنی شروع ہوئی اور ۱۸۹۰ء میں مکمل ہوئی! اس میں ہندوستان کے سینکڑوں علماء اور مشائخ کے حالات ملتے ہیں، ——— اس کتاب پر "تعارف" مولانا عبدالرشید نعمانی نے لکھا ہے، موصوف لکھتے ہیں :-

"... مولوی رحمان علی اپنے معاصر علمائے بدایوں و بریلی سے حد درجہ متاثر تھے، اس لئے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ دوسرے اکابر اہلِ علم کے ساتھ انھوں نے وہ معاملہ نہیں کیا، جو ایک غیر جانب دار تذکرہ نویس کا فرض ہوتا ہے چنانچہ بعض حضرات کا تو سرے سے تذکرہ نظر انداز کر دیا، اور بعض کا ذکر بھی کیا تو بادلِ ناخواستہ کیا، دو چار سطروں سے زیادہ نہ لکھ سکے ..."

خاص طور سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتبِ فکر و خیال سے تذکرہ نگار کو کوئی دلچسپی نہیں ہے!

فاضل مترجم نے اس کتاب پر جو حواشی دیئے ہیں، اس نے کتاب کی افادیت اور تاریخی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے، مثلاً مولوی فضل حق خیر آبادی کی قبر کے بارے میں انھوں نے تحقیق کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ جزیرہ انڈمان میں ہے، رنگون میں اُن کا دفن ہونا غلط ہے۔

مولوی خرم علی بلہوری (ص ۱۷۹) کے حالات پر جو مترجم نے حواشی لکھے ہیں اُن میں مولوی خرم علی کی شاعری کا ذکر ضرور کرنا تھا، موصوف ایک خوش گو، اور پختہ مشق شاعر بھی تھے۔

سید مرتضیٰ حسین زبیدی (ص ۴۹۲) کا سنہ پیدائش ۱۱۴۵ھ ہے مگر اُس کے نیچے انگریزی سنہ ۱۸۳۲ء غلط درج ہو گیا ہے!

"۱۱۱۱ھ میں حضرت مولانا (مرزا جان جاناں) پیدا ہوئے، جب یہ خبر عالمگیر کو پہونچی، تو فرمایا، بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے، اس لئے ہم نے اس کا نام جانِ جاناں مقرر کیا، اس تقریب سے وہ اس نام سے مشہور ہوئے۔" (ص ۴۹۵) بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے، تو اس کا لقب "جانِ جاں" ہونا چاہیئے نہ کہ "جانِ جاناں"! تذکرہ نویس کو مشہور لقب "جانِ جہ سے دھوکا ہوا، اصل لقب "جانِ جان" ہے!

اس کتاب میں ایک عالم اور صوفی کا نام "شیخ پہاڑ لکھنوی" نظر سے گزرا شیخ نظام الدین امیٹھوی کے تذکرہ میں لکھا ہے!

"... سماع سے پرہیز کرتے تھے، اور مریدوں کو بھی اس سے منع کرتے تھے، فرماتے تھے، اختلاف میں کیوں پڑتے ہو، اگر تقلید کرتے ہو تو پہلوں کی اور بڑوں کی کرو۔"

قصبہ آنولہ کے بارے میں ڈاکٹر سید معین الحق نے مقدمہ کتاب میں حکیم نجم الغنی رامپوری کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ وہاں ستر سو

مساجد تھیں۔ ۔ ۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے، حکیم نجم الغنی "حاطب اللیل" قسم کے تذکرہ نگار اور مؤرخ ہیں! قصبہ آنولہ کے بارے میں یہ بات ہم نے سُنی ہے کہ وہاں ایک دوسرے کی ضد پر مسجدیں وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مسجدوں کے آثار موجود ہیں
یہ تذکرہ بعض کوتاہیوں کے باوجود، ایک اہم تاریخی نوشتہ ہے، جس سے ریسرچ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اس کتاب کو چھاپ کر، علم و ادب کی مفید خدمت انجام دی ہے۔

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی

بچے نازک، ناتواں اور بڑی دیکھ بھال کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاہم اُن کے اندر نشو و نما کی زبردست صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مناسب نگہداشت، اچھی غذا اور عمدہ ٹانک کے استعمال سے اُن کے پنپتے ہوئے اور زندگی سے بھرپور جسم کو پُوری پُوری افزائش کا موقع مل سکتا ہے۔

نونہال کے باقاعدہ استعمال سے آپ کے بچے کو وہ تمام اجزا مناسب مقدار میں مہیا ہوتے رہیں گے جو اُس کی نشو و نما اور اُسے بیماریوں سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔

ہمدرد
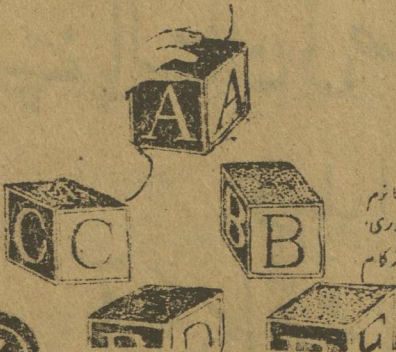
گرائپ مکسچر و بے بی ٹانک ہر موسم میں یکساں طور پر مفید ہیں

آدم جی کاٹن ملز لانڈھی، کراچی

پریمیر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ-کراچی

منصوبے
قومی ترقی کے پنج سالہ منصوبے پر بڑی تیزی سے
کام ہو رہا ہے۔ مکان، پُل، ہوائی اڈے، کارخانے
بجلی گھر، دریاؤں پر بیراج اور بند مکمل ہوتے جا رہے ہیں
ان تمام منصوبوں کی تکمیل کے لئے اچھے اور اعلیٰ قسم کے سیمنٹ
کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب زیادہ تر ماہرین تعمیرات اپنے
تجربے کی بنا پر زیل پاک ہی کو پسند کرتے ہیں۔
دیرپا عمارتیں بنانے کے لئے
زیل پاک ہی بہترین سیمنٹ ہے
اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل
ZEALPAK
سیمنٹ سے کیجئے
SCHOOL
HOSPITAL
مینیجنگ ایجنٹس:- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
PRESTIGE

FARAN, Krchi. Regd. S. No. 1262

ماہر القادری

فاران کراچی
جلد: ۱۳
شمارہ: ۱۰
ایڈیٹر:- ماہر القادری
جنوری ۱۹۶۲ء
چندہ سالانہ چھ روپے
ترتیب
نقش اول ماہر القادری ۲
اقبال کی اُردو شاعری ماہر القادری ۸
خیابانِ تغزل اشک رامپوری ۳۷
رُوح انتخاب —— ۳۸
سحر کا انتظار تھا نعیم صدیقی ۴۱
ہماری نظر میں —— ۴۵
قیمت
۵۰ پیسے (۸/)
مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱
مطبوعہ:- مطبع سعیدی کراچی
پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

۲۲ نومبر (سنہ ۶۱ء) کے اخبار "جنگ" (کراچی) میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:-

حکومت ثقافتی ادارے قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے!

وزیرِ تعلیم مسٹر اختر حسین کی تقریر!

"کراچی ۲۰ نومبر۔ پاکستان کے وزیرِ تعلیم و سائنسی تحقیق مسٹر اختر حسین نے یہاں تھیوسیوفکل ہال میں گھنشیام رو یک آرٹ سینٹر کے زیرِ اہتمام "گندھارا کی ایک داستان اور پاکستانی رقص" کی ایک تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ دل کے تاروں کے ساتھ رقص و موسیقی کا بڑا گہرا تعلق ہے مختلف معاملات میں وسیع اختلافات رکھنے والے حضرات کو بھی رقص و موسیقی سے مشترک دل چسپی رکھنے والے پروگراموں کے ذریعہ ایک مرکز پر متحد کیا جا سکتا ہے اس لئے ملک کے مختلف الخیال لوگوں کو ایک سلسلے میں منسلک کرنے کے لئے ثقافتی پروگرام نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں، مختلف طبقوں کے رقص و موسیقی کا مظاہرہ صرف تفریحات کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ وحدت و یگانگت کی ایک زبردست قوت کا ہمارا ملک قیمتی ثقافتی ورثے کا مالک ہے اور اس کے تحفظ و ترقی کی مساعی ہمت افزائی کی مستحق ہیں، رقص کے ذریعہ پاکستان کی ۵ ہزار سالہ ثقافت پیش کرنے کے لئے میں آپ کے منصوبے سے گہری دل چسپی رکھتا ہوں سنگ تراشی کے قدیم نمونوں کو دیکھ کر گندھارا رقص کے اس انداز میں جو ماضی کے دھندلکوں میں چھپ چکا تھا، از سرِ نو اصلاح کرنے اور اسے رواج دینے کی کوششیں درحقیقت ایک رومانی مہم سے کم نہیں، انھوں نے کہا کہ موجودہ حکومت آرٹ اور ثقافت کی ترقی کو خاص اہمیت دیتی ہے اور ملک میں ثقافتی ادارے قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے"۔

ہم اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھے اور اس غلط فہمی کا شکار تھے یہ جو آئے دن "کلچرل شو" کے نام پر رقص و موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، ان میں سرکاری عہدیداروں کی جو دلچسپیاں اور سرگرمیاں پائی جاتی ہیں، ان کی خانگی، نجی اور پرائیوٹ حیثیت ہے مگر حکومتِ پاکستان کے وزیر مسٹر اختر حسین کی یہ تقریر اس بات کا اعلان ہے کہ "رقص و موسیقی" کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی حکومت کی

ثقافتی پالیسی میں شامل ہے اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اربابِ اقتدار کی رضامندی اور خوشنودی حاصل ہے۔

ایک طرف ہر تقریر میں اسلام کا تذکرہ اور اسلامی اقدار و افکار کی پُرجوش قصیدہ خوانی اور دوسری طرف رقص و سرود کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ــــــــ فکر و عمل کا یہ تضاد کس قدر حیرت انگیز ہے۔

پانچ ہزار قبل کی وہ ثقافت جس نے رقص و سرود کی لغویات کو فروغ دیا تھا نہ اسلام کی ثقافت تھی اور نہ پاکستان کی تہذیب تھی، وہ تو نری جاہلانہ ثقافت اور سراسر غیر اسلامی تہذیب تھی اور اس جاہلانہ ثقافت کی تجدید و احیاء کی کوشش پاکستان اور اسلام کے مقدس نظریوں کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے!

پاکستان، موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی تہذیب و ثقافت کو زندہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کے بچے کھچے اثرات کو بھی مٹا کر خالص اسلامی ثقافت کو فروغ دینے کے لئے وجود میں آیا ہے، متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان کا اسی یقین اور امید کی بنا پر ساتھ دیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں اسلامی قانون، اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب کو رواج دیا جائے گا اور فروغ حاصل ہوگا۔

جو کوئی رقص و سرود کو پاکستان کی ثقافت سمجھتا ہے، وہ پاکستان کے مقصدِ وجود کی اس طرح نفی کرتا ہے۔

بت تراشی، تصویر سازی اور رقص و سرود یہ سب جاہلیت کی "فنکاریاں" (ARTS) ہیں، اسلام کے نزدیک یہ وہ منکرات ہیں جنہیں شیطان نے غلط اندیش انسانوں کی نگاہ میں پسندیدہ اور خوش نما بنا دیا ہے، یورپ شیطان کے اسی فتنہ کا شکار ہو کر تمام بدکاریاں اور فحاشیاں اُسے حسین و خوش نما، اور تہذیب و ترقی کا مظہر نظر آتی ہیں۔

پاکستان کے محترم وزیر صاحب نے جو یہ بات کہی ہے:۔

"دل کے تاروں کے ساتھ رقص و موسیقی کا بڑا گہرا تعلق ہے"۔

تو وہ اس حد تک تو درست ہے کہ رقص و موسیقی سے انسانی قلوب یقیناً متاثر ہوتے ہیں، مگر یہ تاثر ہر اعتبار سے مذموم ہوتا ہے! رقص و موسیقی انسان کے سفلی جذبات کو ابھارتے ہیں، اور اس ماحول میں ہوسناکیوں کو غذا اور شہ ملتی ہے!

اور یہ جو فرمایا گیا ہے:۔

> "مختلف معاملات میں وسیع اختلافات رکھنے والے حضرات کو بھی رقص و موسیقی سے مشترک دل چسپی کے پروگراموں کے ذریعہ ایک مرکز پر متحد کیا جا سکتا ہے، اس لئے ملک کے مختلف الخیال لوگوں کو ایک سلسلے میں منسلک کرنے کے لئے ثقافتی پروگرام نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں مختلف طبقوں کے رقص و موسیقی کا مظاہرہ صرف تفریحات کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ وحدت و یگانگت کی ایک زبردست قوت ہے۔۔۔"

ــــــــــــ تو ــــــــــــ

رقص و سرود کے ذریعہ مختلف الخیال لوگوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کا فلسفہ اگرچہ عجیب و جدید فلسفہ ہے مگر سراسر غلط فلسفہ ہے انسانی نفس اُس وقت بڑے خوفناک موڑ پر ہوتا ہے جب منکرات و فواحش اور ظلم و عدوان کو سندِ جواز عطا کرنے کے لئے طرح طرح کی تاویلیں اور دلیلیں تراشی جاتی ہیں، اور ذہانت گناہ کو ثواب اور مکروہ کو حسین و محبوب بنانے میں صرف کی جاتی ہے۔

اس فلسفہ کو اگر درست مان لیا جائے، تو پھر ہر برائی انسانوں کے درمیان وحدت و یگانگت پیدا کرنے کا ذریعہ قرار پا سکتی ہے! یعنی گھوڑ دوڑ کے میدان جہاں دھڑلے کے ساتھ قمار بازی ہوتی ہے، ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان میدانوں میں مختلف الخیال

لوگوں کے درمیان قمار بازی کے ذریعہ اتحاد اور یگانگت پیدا ہوتی ہے' اور لوگوں کے اتحاد و یگانگت کے سب سے بڑے مرکز تو یہ شراب خانے ہیں' جہاں ہر خیال اور عقیدہ کا آدمی ایک ہی رنگ میں نظر آتا ہے! مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط' شراب نوشی' رقص و سرود' قمار بازی اور اسی طرح کی دوسری ہوسناکیوں اور تعیش پسندیوں کے ذریعہ جو یک رنگی پیدا ہوتی ہے' وہ اخلاق اور پاکیزگی کے خلاف ایک منظم سازش ہے! رقص و سُرود کوئی نظریہ نہیں ہے' جس پر انسانوں کو متحد اور منظم کیا جا سکے ——— یہ تو سفلی جذبہ کی نمود اور ہوسناکی کا ایک مظہر ہے' اس ہنگامہ عیش و ہوس میں شریک ہونے والوں کی وقتی یک رنگی پر "انسانی وحدت" کا اطلاق نہیں ہوتا! اگر رقص و سرود انسانوں کو متحد کر سکتے تو امریکہ اور روس کو ایک دوسرے کا حلیف اور دوست ہونا چاہیے تھا کہ ناچنا گانا' اور شراب پینا ان مُلکوں کے بسنے والوں کی زندگی بن چکا ہے۔

انبیائے کرام سے بڑھ کر انسانوں کو وحدت و یگانگت اور اخوت و اتحاد کی تلقین اور کون کر سکتا ہے' مگر ان نفوس قدسیہ نے رقص و سرود کو افراد اور اقوام کے اتحاد و یگانگت کا ذریعہ نہیں بنایا' اللہ تعالیٰ کے آخری نبی دُنیا کے سب بڑے آدمی اور کامل ترین انسان سیدنا و مولانا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ نبوت سے قبل بھی حضورؐ رقص و سرود کی کسی محفل میں شریک نہیں ہوئے' اور دوسری برائیوں کی طرح ناچ گانے کی بُرائی سے بھی آپ قبل بعثت مُجتنب اور محفوظ رہے! نبوت کے بعد حضورؐ کی تعلیم و تلقین سے شرک' بُت پرستی' شراب نوشی' زناکاری اور اسی قسم کی دوسری بُرائیوں کے ساتھ ساتھ مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط اور رقص و سرود کا چلن بھی مٹ گیا' مکہ کی فتح' کتنی عظیم الشان مسرت کا موقعہ تھی' مگر اس موقعہ پر ناچنے گانے کا کوئی مظاہرہ نہیں ہوا' حضورؐ نے اور صحابہؓ نے اپنے رب کے حضور شکر کے سجدے ادا کئے۔

عہد رسالت کے بعد صحابہ کا دور اور اُس دور کا معاشرہ بھی رقص و سرود کی لغویتوں سے پاک صاف رہا' حالانکہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں عراق' شام اور مصر و یمن وغیرہ ممالک کی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے سابقہ پڑا' مگر اللہ تعالیٰ کے ان نیک اور محبوب بندوں نے ان خطّوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے رقص و سرود سے کام نہیں لیا' بلکہ حقیقتِ حال اس کے برعکس نظر آتی ہے' یہ نفوس قدسیہ آلاتِ طرب اور مزامیر کو توڑنے والے اور رقص و سرود' شراب نوشی اور اسی قسم کے دوسرے منکرات کو مٹانے والے تھے!

مختلف ملکوں' قبیلوں اور قوموں کے افراد' اور گوناگوں نسل و رنگ کے لوگوں کو اسلام نے ایمان و تقویٰ اور اخلاق و نیکوکاری کے مرکز پر متحد کیا تھا۔ رقص و سرود اور دوسرے لہو و لعب اُن کے اتحاد کا ذریعہ کبھی نہیں بنے' اور بن بھی کیسے سکتے تھے کہ اسلام ہوا و ہوس کے بندوں اور نفس کے پجاریوں' مغرب زدوں اور مادہ پرستوں کی طرح رقص و سرود کی افادیت کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ ان کو اتحاد کے بجائے' نفاق کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

"رقص و سرود" کے مشغلے غلط کار اور عیش پسند بادشاہوں کی "سُنّت" ہے' اور اس "سُنّت" کو زندہ کرنے کی انہی لوگوں کو سُوجھ سکتی ہے' جو جاہ و اقتدار سے بادشاہوں کی طرح فائدے حاصل کرنے اور لُطف اندوز ہونے کا داعیہ رکھتے ہوں ——— سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جو چیز اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے' وہ کسی صورت میں بھی خیر و برکت کا سبب نہیں بن سکتی۔

یورپ کی زندگی ہمارے سامنے ہے' گانے بجانے' ناچنے' شراب پینے اور اسی قسم کی دوسری بُرائیوں نے پُورے خطّہ کو "قحبہ خانہ" بنا دیا ہے' اخلاق و پاکیزگی کا احساس ہی اُن کے اندر باقی نہیں رہا' اُن کی تہذیب جاہلیت کی تہذیب ہے' جسے وہ روشنی سمجھتے ہیں' وہ گناہوں کا خوفناک اندھیرا ہے' ان کی تقلید وہی کرے گا' جو شرم و غیرت اور اخلاق و نیکوکاری کو خیرباد کہہ چکا ہو' اور معروف و مُنکر اور گناہ و ثواب

میں امتیاز کرنے کی حس ہی سرے سے مٹ گئی ہو۔

یورپ کے وہ لوگ جو صاحب فکر و دانش ہیں اور قوم کی تعمیر کا صحیح جذبہ رکھتے ہیں، وہ اپنے یہاں کی اس سوسائٹی سے نالاں اور بیزار ہیں، یہی دوسری قوموں کے اُن اکابر اور دانشوروں کا حال ہے جن پر تجربہ کے بعد ناچ رنگ کی برائیاں ظاہر ہو چکی ہیں! مثلاً پارسیوں کے لیڈر جمشید جی نسراونجی مہتا کے بارے میں "عظمتِ رفتہ" کے مصنف لکھتے ہیں:۔

"انھوں نے اپنے ہم مذہب پارسیوں میں ڈانسنگ (رقص) کے رواج کو کم کرنے کی انتہائی کوشش کی، وہ اسے سوسائٹی کے لئے خطرہ کا سگنل قرار دیتے تھے (صفحہ ۲۴)

ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" لاہور (مورخہ ۷ار نومبر سنہ ۱۹۶۱ء) کے اداریہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

احتجاج!؟!

"کچھ عرصہ سے لاہور کے زنانہ تعلیمی اداروں میں مختلف تقریبات کے مواقع پر ڈرامے اسٹیج کرنے کی رو چل رہی ہے، اگر ان ڈراموں سے معاشرے کی اصلاح مقصود ہو تو انھیں کسی طرح قابلِ اعتراض قرار نہیں دیا جاسکتا مگر ہمارے بعض کرمفرماؤں نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ بعض اداروں میں جو ڈرامے کھیلے جاتے ہیں، ان میں بعض نہایت شرمناک پارٹ پلے کئے جاتے ہیں، اور نہایت ہی اخلاق سوز فلمی گیت ان ڈراموں کا حصہ ہوتے ہیں، اس قسم کی شکایات بھی بکثرت موصول ہو رہی ہیں کہ کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جن میں لڑکیوں کے پیروں میں گھنگرو بندھوا کر نچوایا جاتا ہے، اور جو لڑکی سب سے اچھا ناچتی ہے، اُسے بہترین انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے گویا اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ قوم کی بیٹیاں رقاصہ بننے کی تربیت حاصل کر رہی ہیں"

۔۔۔۔۔۔" ہم یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض شریف خاندان کے لوگ سنجیدگی سے یہ سوچنے لگے ہیں کہ وہ ان تعلیمی اداروں میں اپنی بچیوں کو تعلیم دلوا کر اپنا روپیہ اور بچیوں کے اخلاق کو برباد کرنے کے بجائے انھیں بے علم ہی کیوں نہ رکھیں، اس طرح کم سے کم اُن کی بچیاں بے راہ روی کا شکار ہونے سے تو بچ جائیں گی۔۔۔۔"

آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کس کے حکم و ایما سے ہو رہا ہے؟ انگریز اپنی تمام تر خواہشوں کے باوجود اپنے مستبد دور میں وہ حرکتیں کرنے کی جرأت نہ کرسکا، جو حرکتیں دورِ آزادی میں اُس پاکستان کے اندر ہو رہی ہیں، جس کا وجود اسلام کا رہینِ منت ہے! اور جو صرف اس لئے بنا ہے کہ یہاں اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر معاشرہ اُستوار ہوگا، یہاں کتاب و سنت کا قانون چلے گا، جن کو اسلام "منکرات" کہتا ہے، اُن کو قانونی طور پر جرم قرار دیا جائے گا، اور جن کو اسلام نے "معروف" قرار دیا ہے، اُن کو رواج دیا جائے گا اور قائم کیا جائے گا!

——— اگر ———

اگر یہ کے دورِ غلامی کی بُرائیوں کو یوں ہی چلتے رہنا مقصود تھا، تو پھر متحدہ ہندوستان کیا بُرا تھا ——— یہ جو لاکھوں مسلمان قتل اور کروڑوں مسلمان گھر سے بے گھر ہوئے ہیں، بیشمار مسلمان عورتیں، بے عصمت اور بے آبرو ہوئی ہیں، اور آج بھی پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان عورتیں کافروں کے قبضہ و تصرف میں ہیں، سینکڑوں مسجدیں ہیں کہ جن میں گھوڑے بندھتے اور گدھے لوٹتے ہیں، اور ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمان غلامی کی بے بسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ——— کیا یہ سب قربانیاں اس لئے دی گئی تھیں کہ پاکستان

میں مسلمان لڑکیوں کو رقاصہ اور مغنیہ بنایا جائے گا، اور گرلز گائڈ سینے تان تان کر نامحرم مردوں کو سلامی دیا کریں گی! پاکستان کا اسقدر مقدس خواب اور اس کی اتنی مکروہ تعبیر!

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

پاکستان تو اس لئے بنا تھا کہ یہاں کی عورتوں کی سیرت و کردار میں خدیجہؓ، عائشہؓ، اور فاطمہؓ کی مقدس زندگیوں کی جھلک پیدا کی جائے گی! کیا غضب ہے کہ جنہیں "رابعہ بصری" بننا تھا، انہیں "گریٹا گاربو" اور "دیوکا رانی" بنایا جا رہا ہے! جہاں "قرآن منزلیں" اور "دار الحدیث" قائم ہونے تھے، وہاں "آرٹ سرکل" قائم ہیں، جس ملک میں اخلاق و پاکیزگی کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے تھی، وہاں بلبل چودھری کے "آرٹ" پر فخر کیا جا رہا ہے!

نظر کی نامسلمانی سے فریاد!

کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں، ان سطروں کا لکھنے والا بھی اخلاقی کمزوریاں رکھتا ہے ——— مگر خدا دلوں کا حال جانتا ہے کہ ہم اپنی کسی اخلاقی کمزوری اور نفس کے تقاضے کی نہ تو کوئی تاویل کر کے اس کے لئے سند جواز مہیا کرتے ہیں اور اس کا تو ہم خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے کہ ہمارے نفس کا کوئی تقاضہ "قومی روایت" بنا دیا جائے، اور اس خوف سے کہ دوسرے ہماری کمزوریوں پر نکتہ چینی نہ کر سکیں، ہم لوگوں کے اخلاقی معیار کو اس قدر پست بنا دیں ——— کہ ہم ان کی نگاہ میں ایک "معیاری انسان" دکھائی دیں ——— یہ اسکیم، یہ پروگرام اور یہ منصوبہ نہ صرف غلط ہے بلکہ قوم و ملت کے لئے ہر اعتبار سے تباہ کن ہے!

——— اگر ———

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی زندگیاں نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں اور ان کی جگہ مصطفےٰ کمال اور بورقیبہ کی زندگیوں کو معیار قرار دیدیا جائے ——— تو فکر و نظر کا یہ انقلاب اسلام کے لئے ملت کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے اتنی بڑی ٹریجڈی ثابت ہوگا، جس کے نقصان اور حزن و ملال کا لفظوں میں کسی عنوان اظہار نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کے بعض شہروں کے غیرت مند شہریوں اور خاص طور سے بنیادی جمہوریت کے ارکان تک نے رقص و سرود کے ان اخلاق سوز اجتماعات کو روکنے کے لئے محضر نامے بھیجے اور پرزور احتجاج کیا مگر سرکاری عہدیداروں نے اس شریفانہ احتجاج کو ٹھکرا دیا۔ یہ برائی اب کس حد تک پہونچ چکی ہے کہ اس قسم کی لغویتوں کے ذریعہ چندہ جمع کرانے کے لئے سرکاری عمّال کو متعین کیا جاتا ہے۔

ہفت روزہ "حمایت اسلام" نے اپنے حزن و ملال کا اظہار کر کے، قوم کے جذبات و احساسات کی صحیح اور بروقت نمائندگی کی ہے۔ ہائے! وہ بدنصیب قوم جو نیک بننا چاہتی ہو، مگر اس کی اس نیک تمنائی کی راہ کو دشوار اور پرخطر بنا دیا جائے۔

ہم نے کسی پر تہمت جوڑی ہو، کوئی بے بنیاد افواہ پھیلائی ہو، کسی کو بلا وجہ مطعون کیا ہو، یہاں تک کہ کوئی بات مبالغہ کے ساتھ بیان کی ہو، تو ہمیں پھانسی کے تختہ پر چڑھا دو۔ ——— ہم نے وہی کہا ہے جو دیکھا ہے اور قابل اعتبار ذریعوں سے جو ہم تک پہونچا ہے، یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملت کے بننے اور بگڑنے کا مسئلہ ہے، یہ ہماری اخلاقی موت و حیات کا سوال ہے، یہ پاکستان کے نظریاتی وجود اور اسلام کی عظمت کا معاملہ ہے، اگر ہم خاموش تماشائی بن کر ان حالات کو دیکھتے رہیں، تو ہم اللہ رسولؐ کے، ملت کے اور انسانیت کے مجرم قرار پائیں گے۔۔

قانون کی باریکیوں کو سمجھنے اور ان کے جاننے کی ہم نے کوشش نہیں کی، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کے ساتھ جو سب سے بڑی بھلائی اس دنیا میں کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی ان حرکتوں پر اسے متنبہ کر دے جن کو اسلام نے "منکرات" قرار دیا ہے، اور وہ منکرات

جو افراد سے گزر کر معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہوں، اُن کا معاملہ تو اور بھی سنگین ہے پس "منکرات" پر احتساب و انتباہ امریکہ اور روس کی تعزیرات میں جرم ہو تو ہو، مگر اسلامی قانون کی نگاہ میں تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

رقص و سرود کا مسئلہ ایسا نہیں ہے، جو اختلافی ہو، اور جس کے بارے میں دو رائیں ہوں، یہ تو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر "فحش" ہے اور "فحش" کو گوارا نہیں کیا جا سکتا!

ہم پاکستان کے اربابِ بست و کشاد کی بارگاہ میں خلوص و ادب کے ساتھ گزارش کرتے ہیں کہ وہ "کلچر" کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی فرما کر اس قسم کی تمام سرگرمیوں کو یک قلم موقوف و منسوخ کر دیں اور قوم کے معاشرہ کو اُس راہ پر لے چلیں، جو مجاہدوں، کشور کشاؤں اور اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے والوں کی راہ ہے!

ماہر القادری

۲۶ دسمبر ۶۱ء

"اسلام میں عورت کا عائلی مقام"

مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ کا ایک فاضلانہ مقالہ ماہ نومبر کے "فاران" میں شائع ہو چکا ہے، اس سلسلہ میں مولانا موصوف نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" سے ایک اقتباس، ترجمہ کے ساتھ بھیجا ہے، جو اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر، درج ذیل کیا جاتا ہے۔

قال فی حجۃ اللہ البالغۃ فی مصالح المہر فی النکاح منہا ان النکاح لا تتم فائدتہ الا بان یوطن کل واحد نفسہ علی المعاونۃ الدائمۃ یتحقق ذلک من جانب المراۃ بزوال امرہا من یدہا ولا جائز ان یشرع زوال امرہ ایضاً من یدہ والا انسد باب الطلاق وکان اسیراً فی یدہا کما انہا عانیۃ بیدہ وکان الاصل ان یکونوا قوامین علی النساء ولا جائز ان یجعل امرہما الی القضاۃ فان مرافعۃ القضیۃ الیہم فیہا حرج وہم لا یعرفون ما یعرف ہو من خاصۃ امرہ الخ ص ۱۲۸ ج ۲

حجۃ اللہ البالغہ میں مصالح مہر کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ ایک مصلحت یہ ہے کہ نکاح کا فائدہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک زوجین میں سے ہر ایک دائمی معاونت کا پختہ ارادہ نہ کرے۔ عورت کی طرف سے تو یہ بات اس طرح ثابت ہو گئی کہ نکاح کے بعد اس کے ہاتھ سے اختیار جاتا رہا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد کے ہاتھ سے بھی اختیار جاتا ہے ورنہ طلاق کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا اور مرد بیوی کے قبضہ میں قید ہو جائے گا۔ جیسا بیوی اُس کے ہاتھ تلے پابند ہے، اور اصل یہ ہے کہ مرد عورتوں پر قوام اور (نگراں) ہیں اس لئے بھی مرد کو عورت کے قبضہ میں نہیں دیا جا سکتا) اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ طلاق کا اختیار (قاضی اور حاکم کے ہاتھ میں دیدیا جائے کیونکہ ان کی طرف مرافعہ کرنے میں مشقت بھی ہے اور وہ (حکام) اُن خاص حالات کو سمجھ بھی نہیں سکتے جو مرد خود سمجھتا ہے (الخ ص ۱۲۸ ج ۲)

اقبال کی اردو شاعری

ماہر القادری

تعقل و تدبر اور غور و فکر کے ساتھ ہی "فلسفہ" کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے علم فلسفہ کا ایک صفحہ بھی نہ پڑھا ہو اور اس فن کی ابجد سے بھی ناواقف ہو، مگر اس کے سوچنے کا انداز فلسفیانہ ہو۔ ایک عامی بھی جب اس طرح سوچتا ہے کہ یہ دنیا کس لئے بنائی گئی ہے، انسان کے پیدا کئے جانے کا کیا مقصد ہے؟ دنیا کا کارخانہ کس کے حکم سے گردش کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ تو "کیوں" "کس لئے" "چون و چرا" اور (" HOW AND WHY ") کا تصور آتے ہی غیر شعوری طور پر فلسفیانہ مقدمات اور قضایا مرتب ہونے لگتے ہیں۔ فلسفہ کی اس ہمہ گیری کو ارسطو نے اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

"ہم فلسفیانہ انداز پر غور و فکر کرنا چاہیں یا نہ چاہیں، مگر ہمیں فلسفیانہ طرز پر غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے"۔

ایک بچہ جب اپنی ماں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھتا ہے کہ فلاں چیز کس لئے بنائی گئی ہے، تو فلسفیانہ زبان میں اس بچے کے اس استفسار کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ماں سے اس شے کی "علت غائی" دریافت کر رہا ہے! غور کرنے، سوچنے اور دریافت کرنے کے یہی سادہ فطری تصورات ہیں جو فلسفہ کی کارگاہ میں پہنچ کر، نازک، دقیق، غامض اور پیچیدہ بنتے چلے گئے ہیں بلکہ مرعوب کن اور حیرت انگیز بھی! فلسفہ ایک عالم حیرت اور دنیائے گومگو بھی ہے، بزم لطائف و ظرائف بھی ہے اور جہانِ حقائق و واقعات بھی ہے! اشراقیت ہو یا مشائیت، سفسطائیت ہو یا ارتیابیت لذتیت ہو یا اور کوئی "ایت" (ISM) یہ سب فلسفہ ہی کے آذرکدہ کے تراشے ہوئے صنم اور اسی لیبارٹری کے "مرکبات" و "محلولات" ہیں۔

کوئی شک نہیں فلسفہ بعض اوقات "خلا" میں بھی بولتا اور حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور اس کی اس "ماورائیت" کا انسانوں کے عمل و تجربہ سے مشکل ہی سے پیوند جوڑا جا سکتا ہے۔ فلسفہ کی اس "رہبانیت" اور "مجذوبیت" نے استعاروں اور اصطلاحوں کے طلسم کھڑے کر دیئے ہیں، مگر اس سے انسانیت کو حیرت و ژولیدگی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ شاید سسرو (CICERO) نے فلسفہ کے اسی رُخ کو دیکھ کر کہا تھا:۔

"کوئی بے کار اور لایعنی شے ایسی نہیں، جو فلسفیوں کی کتابوں میں نہ ملتی ہو"۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ عام طور پر فلسفہ کا تعلق انسانی ذہن و فکر کی "ورائیت" ہی سے رہا ہے، اور کہیں کہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فلسفہ ہماری فطرت کی آواز ہے، یا یوں کہئے کہ ان جرعوں کے لئے ہماری فطرت تشنگی محسوس کر رہی تھی۔ پھر فلسفہ جدید و قدیم میں ربط بھی پایا جاتا ہے۔ ارسطو کے یہاں جسے "فلسفہ اولیٰ" کہا جاتا تھا، اسے ہمارے زمانے میں "مابعد الطبیعات" کہتے ہیں اس تصویر کے دونوں رُخ یہ ہیں کہ فلسفہ نے مسائل کی گرہیں بھی کھولی ہیں اور الجھنیں بھی ڈالی ہیں۔ یہ کہیں آبِ حیات ہے اور کہیں زہر ہلاہل۔ یہ تو اپنی اپنی یافت اور اپنا اپنا ظرف و ذوق ہے کہ فلسفہ نے کسی کو لاادریت اور تشکیک و نفی

اور بے یقینی کی بھول بھلیوں میں لاکر چھوڑ دیا اور کسی کو یقین و ایمان کی حدوں تک پہونچادیا۔ مولانا رومی کی طرح علامہ اقبال کو بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے فلسفہ نے الجھایا اور ڈگمگایا نہیں! اقبال کو حیرتِ فارابی اور پیچ و تابِ رازی کی منزلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ اور کیا عجب ہے کہ بوعلی سینا کی طرح اقبال کو بھی "غبارِ ناقہ" سے واسطہ پڑا ہو۔ مگر کسی مقام پر اقبال کا قافلہ فکر و نظر ٹھیرا نہیں۔ اقبال نے تعقل و تفلسف کے ہر ڈوبتے ہوئے ستارے کو دیکھ کر "لا احبُ الآفلین" کہا اور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس کا شعور پکار اٹھا: ؎

خودی کا سرِ نہاں، لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ

اقبال کے مزاج و فطرت کی استقامت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ لوگ فلسفہ اور مغربی علوم کے دو چار جام پی کر بہک جاتے ہیں، لیکن اقبال اس کے سمندر نوش کر کے بھی غیر متوازن نہیں ہونے پاتا۔ اس ظرف اور مزاج کے لوگ دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کے مزاج و فطرت اور فکر و رجحان کی یہی خصوصیت ہے، جو اس کی شاعری میں "زمانہ ستیز" اور "کم آمیز" بن کر ظاہر ہوئی ہے۔ یہ لفظی ترکیبیں اپنی معنویت کے اعتبار سے اقبال کی فطرت کی ترجمان و عکاس ہیں! اقبال نے زمانہ کی غلط کاریوں اور غلط اندیشیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ ان سے جنگ کی۔ مغربی فکر و تہذیب کے ان بتوں پر ضربیں لگائیں اقبال کی "ضربِ کلیم" نہ صرف یہ کہ اعلانِ جنگ، بلکہ مغرب زدگی اور مادہ پرستی سے دست بدست جنگ ہے!

اقبال مفکر تھا، فلسفی تھا، مگر کیسا فلسفی؟ جس نے فلسفہ کی چٹانوں کو تراش کر ان پر شعر و ادب کی مینا کاری کی، بلکہ انہیں گل بوٹوں کی صورت دے دی۔ شیشہ و سنگ کا یہی امتزاج اقبال کا فن ہے اور اس مقام پر وہ دوسرے شاعروں سے منفرد نظر آتا ہے۔ خاقانی شروانی کتنا عظیم شاعر ہے، "خلاقِ معانی" کا لقب اسے زیب دیتا ہے۔ فلسفہ و کلام و منطق سے اس نے اپنی شاعری میں کام لیا ہے۔ مگر اس کے نہ جانے کتنے اشعار چیستاں اور معمہ بن کر رہ گئے ہیں، جن کے سمجھنے میں ذہن و فکر کو بڑی ورزش کرنی پڑتی ہے! اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ اصطلاحات سے کام نہیں لیا۔ اور یہ دلیل ہے آپ کے شاعرانہ مزاج کی لطافت کی ـــ کہ فلسفیانہ اصطلاحات سے شاعری بوجھل ہو جاتی! اقبال کے شاعرانہ فن کا یہ کمال ہے کہ اس نے فلسفہ کی سنجیدگی اور خشکی کو رعنائی و رنگینی سے بدل دیا۔ بلند سے بلند خیال، عمیق سے عمیق تر فکر اور نازک سے نازک مفہوم کو پیش کیا، مگر اس حسن و خوبی کے ساتھ کہ خیال کی بلندی کو عام ذہن و فکر چھو سکیں، فکر کی گہرائی تک دماغ پہنچ سکیں، اور مفہوم کی نزاکت سمجھ میں آسکے، ابہام اور ژولیدگی شعر و سخن کا حسن نہیں عیب اور نقص ہے، اقبال کا فن اس عیب سے پاک ہے، اس کے یہاں سلجھاؤ ہے، دل نشینی ہے، لطفِ بیان ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاثیر ہے۔ اشعار ہیں کہ نشتر بن کر دلوں میں اترتے جاتے ہیں "از دل خیزد بر دل ریزد" کا صحیح مصداق!

شعر میں تاثیر قافیہ پیمائی اور لفظوں کے جوڑ دینے سے پیدا نہیں ہوتی، جذب، دل اور سوزِ جگر اس کمال کو وجود میں لاتے ہیں جو انگیٹھی خود ہی گرم نہ ہو گی، وہ اپنے ماحول کو کس طرح گرم کر سکتی ہے؟ اقبال کے دل کے سوز و تپش نے اس کے فن میں گرمی اور تازگی پیدا کی ہے؟ پھر خیال و اظہار (IDEA & EXPRESSION) کو مربوط اور ہم آہنگ بنانے کا کسی کو سلیقہ نہ ہو، تو دل کا سوز بھی اپنا اثر نہیں دکھا سکتا۔ بلکہ خیال و اظہار کی بے ربطی سوزِ دل کی تاثیر کو مجروح بنا دیتی ہے۔ اقبال خیال و اظہار کو مربوط اور ہم آہنگ بنانے میں سلیقہ ہی نہیں کمال رکھتا ہے، اور یہ کمال بھی معجز نما! فنکار کا لفظ اس قدر عام اور سطحی ہو گیا ہے کہ اقبال کو

فنکار کہتے ہوئے بھی طبیعت جھجکتی اور رُکتی ہے، اقبال فنکار نہیں "خلاق فن" ہے، اس لئے اس کی شاعری میں ابداع ہے، جدت ہے، نیاپن اور تازگی ہے، جہاں وہ دوسرے مفکرین سے متاثر ہوا ہے وہاں بھی پیرایہ بیان اور طرز ادا نے اس تقلید و تاثر کو اچھوتا بنا دیا ہے۔ مثلاً مولانا روم نے عشق کی تعریف ان لفظوں میں فرمائی ہے۔

اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اور

عشق اصطرلابِ اسرارِ خدا

اقبال پیر رومی کے ان افکار سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد

اور

صدق خلیل بھی ہے عشق، عزم حسین بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

کوئی شک نہیں اس چشمہ کا منبع پیر رومی کے افکار ہیں، مگر پیرایہ بیان اور طرز ادا نے اس کو کس قدر منفرد بنا دیا، جیسے یہ چشمہ فوارے کی طرح خود ہی زمین کی تہوں کو توڑ کر ابل پڑا ہے۔ عشق کے "اصطرلاب اسرار خدا" ہونے میں کوئی شک نہیں بڑی پاکیزگی پائی جاتی ہے، اور اس میں عرفان و بصیرت اور تزکیہ و مراقبہ کی چاشنی ملتی ہے، لیکن جس عشق نے نان جویں کھا کر خیبر شکنی کی ہو، اس کی ولولہ انگیزی اور قوت عمل کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے! اور جو عشق بدر و حنین بن کر ظاہر ہوا ہو، اس کی معرکہ آرائی اور تقدیس کردار عمل کا کیا پوچھنا!

رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری میں روحانیت کی خاصی جھلک ملتی ہے، مگر یہ روحانیت ایک خیالی دنیا (UTOPIAN WORLD) کی روحانیت ہے کہ بس سوچتے ہی رہئیے، یہاں تک کہ شاعر کے افکار میں گم ہو کر رہ جائیے، مگر اقبال کی شاعری میں روحانیت کی نمود ایک عملی دنیا کی روحانیت ہے جس کو زندگی میں برتا جا سکتا ہے۔ جہاں انسانی افکار و جذبات کو عمل کے لئے ابھارا جاتا ہے، جہاں محویت کی جگہ بیداری شعور اور "کھو جانے" کے بجائے "اپنے کو پا جانے" کا احساس ملتا ہے! اقبال کا فن محویت و گم گشتگی کا فن نہیں، بلکہ بیداری و عمل کا آرٹ ہے: تجربہ اور مطالعہ و مشاہدہ نے اقبال پر اس حقیقت کو منکشف کر دیا تھا کہ شاعر کا جمالیاتی احساس کس مقام پر پہنچ کر "افیون" بن جاتا ہے۔ اس لئے اقبال نے حافظ شیرازی کی شاعری پر خوب کس کر اور کھل کر تنقید کی۔ اقبال کے یہاں جو کوئی افیون کی گولی اور مارفیا کے انجکشن تلاش کرنے کی کوشش کرے گا، اسے مایوسی ہوگی، اقبال کا فن سلاتا نہیں جگاتا ہے! اقبال کی شراب میں نشہ کی خوابیدگی اور کسل و اعضا شکنی کے بجائے چستی اور نشاط پایا جاتا ہے! اس کے یہاں پازیب کی جگہ تلوار کی جھنکار اور قلقل مینا کے بجائے نعرۂ تکبیر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مگر یہ جھنکار اور گونج طبیعتوں میں توحش و درشتی نہیں، انس و نرمی پیدا کرتی ہے

زبان

اقبال کی اردو شاعری ہمارا موضوع سخن ہے، فن کے اعتبار سے اقبال کے یہاں بڑی شستہ اور رواں زبان پائی جاتی ہے۔ اگر اقبال کی زبان کمزور ہوتی تو اس کا فن بھی کمزور ہوتا۔ زبان کی سلاست و شستگی نے اس کے فن میں جاذبیت اور دل کشی پیدا کی ہے، اقبال کا مولد و منشا خطۂ پنجاب ہے۔ اس کے لب و لہجہ تک میں اسی مرز بوم کی جھلک پائی جاتی

تھی مگر حیرت ہے کہ اقبال کی اُردو شاعری کی زبان میں گنگ و جمن کا صاف و شفاف عکس نظر آتا ہے جیسے وہ قلعہ معلی کی زبان کی ہمجولی ہے اُردو زبان میں غزلوں کے دفتر کے دفتر موجود ہیں، ان کو دیکھ کر غزل کہنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں انگریز شاعروں کی اُردو غزلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر اقبال نے جن موضوعات پر فکر سخن کی ہے ان میں سے بعض موضوعات تو اردو زبان و ادب کے لئے بالکل اچھوتے ہیں۔ ان کی مثال و نظیر اُردو شاعری میں سرے سے ناپید تھی۔ پھر فلسفیانہ مضامین کو اُردو شاعری کے قالب میں ڈھالنا کتنا دشوار کام تھا۔ اور یہ کارنامہ وہی شاعر انجام دے سکتا تھا جس کو اُردو زبان پر پوری قدرت حاصل ہو اور جو لفظوں کے صحیح استعمال سے باخبر ہو! اقبال نے اُردو زبان و ادب کو جدید اصطلاحیں، نئے استعارے اور اچھوتی تشبیہیں دیں، جن کے سبب اردو ادب کا دامن وسیع ہو گیا۔ کوئی شک نہیں اقبال کے کلام نے اُردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے اور اسے عزت و احترام کا بلند مقام عطا کیا ہے اور نہ صرف مقام بلکہ ثروت و دولت بھی!

حنابندی، لالہ کاری، تنک تابی، سحر خیزی، بیباک، طلسم سامری، چراغ مصطفوی، شرار بولہبی، رعشہ، سیماب، عروس لالہ، شرر زندہ، تقدیر امم، براقی، کم اوراقی، شیشہ بازی، خاراشگافی، قندیل، رہبانی، بریشم، غلط آہنگ، فقر غیور، ضرب کلیم بال جبریل۔ اس قسم کی تراکیب و الفاظ کی جدت و تازگی نے اردو شاعری کو کس قدر وسیع اور صاحب ثروت بنا دیا ہے، یہ وہ نگینے ہیں جن کی جوت کبھی کم نہیں ہو سکتی!

اب رہیں زبان و محاورہ کی غلطیاں تو دنیا کا وہ کونسا شاعر ہے جس کا کلام غلطیوں سے پاک صاف ہے؟ میر و داغ زبان کے معاملہ میں درجہ استناد رکھتے ہیں، مگر ان تک کے یہاں روزمرہ اور محاورہ کے تسامحات ملتے ہیں۔ ہر انسان کے کام میں کسی نہ کسی حد تک کور کسر رہ ہی جاتی ہے، عیب و نقص سے پاک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے کام ہیں! اقبال سے بھی کہیں کہیں سہو اور تسامح ہو گیا ہے، مثلاً:-

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بام گردوں سے و یا صحن زمیں سے آئی

"و یا" وجدان کو بہت کچھ کھٹکتا ہے، یہ شعر اقبال کی نومشقی کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

اس شعر میں پہلا مصرعہ کس قدر شگفتہ اور جاندار ہے مگر مصرعہ ثانی اس کے جوڑ کا نہیں ہے!

جام شراب کوہ کے خم کدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے ٹے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

"اڑاتی ہے" اور "پلاتی ہے" کے تلفظ میں زبان کو جھٹکا سا لگتا ہے۔

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز　　　اشارہ پاتے ہی زاہد نے توڑ دی پرہیز

"پرہیز" مونث نہیں مذکر ہے۔ اس شعر میں:-

اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر　　　کہ جانتا ہوں مآل سکندری کیا ہے؟

"سے" کی جگہ "پہ" لانا چاہئے تھا، کسی قدیم شاعر کا مشہور مصرعہ ہے۔ ع اس خطا پہ مجھے مار کہ خطا کار نہ تھا۔

"بانگ درا" میں ایک نظم "التجائے مسافر بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی" ہے، اس کا ایک شعر ہے ؎

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی　　مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

خضر کی شخصیت کے متعلق کرنے میں تو اختلاف ہے کہ وہ پیغمبر تھے یا فرشتہ تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام پر کسی بڑے سے بڑے ولی اور صاحب ارشاد و تصوف کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

نبوت ہی صرف وہ کمال ہے جس میں تدریج و ترقی نہیں ہوتی، اور جو اللہ تعالیٰ کا محض عطیہ و موہبت ہے۔ اس میں بندہ کے کسب کو دخل نہیں ہے۔ باقی دوسرے کمالات و اوصاف میں تدریج و ترقی کی منزلوں سے لازمی طور پر گزرنا ہوتا ہے، اقبال کے افکار، اسلوب بیان اور ادب و انشاء کے پیرایہ میں تدریجاً ترقی ہوئی ہے، اور دوسرے شاعروں اور فنکاروں کی طرح مشق و مطالعہ نے اس کے کلام میں پختگی پیدا کی ہے۔ "بانگ درا" کا اقبال "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں ہر اعتبار سے بلند تر نظر آتا ہے۔ "بانگ درا" میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں، جن میں شاعر کی فکر بلوغ کو نہیں پہونچی! بچپن اور بلوغ سے قبل کا زمانہ یعنی مراہقت انسان کے لئے کوئی عیب کی بات نہیں ہے، ہر انسان کی زندگی ان زمانوں سے گزرتی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی شاعری پر بھی بچپن، مراہقت اور بلوغ کے دور گزرے ہیں۔ یہاں تک کہ پھر ان کی شاعری، اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں فضا میں شہپر جبریل کی آواز گونجتی ہوتی ہے —— "شاعری جزویست از پیغمبری" کی سی کیفیت: یہ اقبال کی شاعری کا شباب ہے، اور اس شباب نے بڑھاپے کی ایک شام بھی نہیں دیکھی۔

اقبال کے جن اشعار پر ابھی ابھی احتساب کیا گیا ہے، وہ کلامِ اقبال کے محاسن کے سامنے ایسے ہیں، جیسے کوہ الوند کے مقابلہ میں چند ذرے! مگر اس سے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ تو ضرور ہو جائے گا کہ مقالہ نگار اپنے ممدوح شاعر کا اندھا عقیدت مند نہیں ہے۔ اس بدر کمال میں جہاں کہیں کوئی چھائیں بھی پائی جاتی ہے، ناقد کی نگاہ سے وہ چھپی نہیں رہی۔ اور اقبال کے کلام کا اس نے مطالعہ صرف عقیدت مند اور منقبت خواں بن کر ہی نہیں کیا، نگاہ تنقید بھی اپنا فرض انجام دیتی رہی ہے۔

منظر نگاری ہر شاعر کا ایک پسندیدہ موضوع اور طبیعت و مزاج کا کسی مخصوص صنف شعر و ادب کی جانب میلان ہوتا ہے۔ "منظر نگاری" اقبال کی شاعری کا موضوع نہیں رہا۔ اقبال صاحب پیام شاعر ہے اور پیغام بر منظر نگاری نہیں کیا کرتے۔ مگر یہ صنف بھی اقبال کے کلام میں جہاں جہاں پائی جاتی ہے۔ وہاں اس کا آرٹ اپنی شدت انفرادیت کے ساتھ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے —— نظم "ہمالہ" کا ایک بند ؎

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

شام کے وقت، درختوں کا جو عالم ہوتا ہے، اس کو "تفکر کا سماں چھایا ہوا" کہہ کر اقبال نے منظر کشی کے شاعرانہ فن کا کمال دکھایا ہے!

"ابر کوہسار" کے چند منتخب اشعار: ؎

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی اُمید ہوں میں	زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

مصرع ثانی کس قدر سائنٹیفک ہے، جسے خشک و بے کیف ہونا چاہیئے مگر اقبالؔ کے اسلوب بیان نے اس میں کتنی شعریت پیدا کردی

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے

سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا "قم" میں نے

"ابرِ کوہسار" سے پہاڑی چشموں کو کیا ملتا ہے، اور سبزہ کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہوتا ہے، اس شعر میں اس کا اظہار جس خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے اس پر وجدان بے اختیار "مرحبا" پکار اٹھتا ہے:-

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے بھرے ہوں

ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی

جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو	(ایک آرزو)

یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر ہر دل کا نمائندہ اور ہر زبان کا ترجمان بن جاتا ہے، اور اس کی اپنی آرزو، سارے جہاں کی آرزوؤں کا مظہر ہوتی ہے! موضوعِ نظم کے اعتبار سے اقبالؔ نے کس قدر نرم و نازک لفظوں کا انتخاب کیا ہے ندی کے صاف پانی کو مصور بنا کر حسن تعلیل کی کتنی دل نشین صنعت پیدا کردی!

"پیامِ صبح" میں نسیم سحری کو متکلم بنایا ہے:-

پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر

چٹک او غنچۂ گل، تو مؤذن ہے گلستاں کا

شعر و سخن کی یہ وہ نازکی اور لطافت ہے جہاں "مصوری" بے رنگ اور عاجز و درماندہ نظر آتی ہے۔

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی

کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

شرح و بیان سے اس شعر کی لطافت غارت ہو جائے گی، خاص طور سے مصرعہ ثانی حباب سے بھی نازک تر ہے، اور حباب کو چھو کر بد مذاقی اور ستم ظریفی کا الزام کون اپنے سر لے۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو

طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے	(بزمِ انجم)

لالے کے پھول کسی چیز پر مارے جائیں تو ان کے لگنے سے سُرخ اور عنابی نشان جگہ جگہ پڑ جائیں گے۔ شاعر نے شام کے وقت "شفق" کی رنگت کے لئے جس تشبیہ و تعلیل سے کام لیا ہے، وہ منظر کشی کا اعجاز ہے۔

جگنو، پروانہ، تتلی، بھونرا، کویل، چکور، بلبل	پر شعراء نے بڑے معرکہ کی نظمیں کہی ہیں۔ ان موضوعات پر جتنی نظمیں مختلف زبانوں میں میری نگاہ سے گزری ہیں، ان تمام نظموں میں اقبالؔ کی نظم —— جگنو —— فکر و خیال، مصوری، منظر کشی، اظہار و بیان، تشبیہ و استعارہ، روانی و لطافت، دل کشی اور اثر انگیزی میں ہر اعتبار سے بلند ہے!

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں

یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑکر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

جگنو ـــــ پھولوں کی انجمن کی شمع ہے، آسمان سے اڑکر آنے والا ستارہ ہے، مہتاب کی وہ کرن ہے جس میں قدرت نے جان ڈال دی ہو، شب کی سلطنت میں دن کا سفیر ہے، مہتاب کی قبا سے گرا ہوا تکمہ ہے، اور ایک ذرہ ہے جو سورج کے پیرہن میں نمایاں ہو کر جھلمل جھلمل کر رہا ہے ـ یہ تشبیہات کس قدر نادر اور اچھوتی ہیں، کیا لطف بیان ہے، کس قدر نازک صنعت گری ہے!

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
رنگین نوا بنایا مرغان بے نوا کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگین کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا، شبنم کو آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی
یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

"بانکی دلہن" اور "اک بات ہے ہماری" ان دو ٹکڑوں کے علاوہ ہر مصرع اپنی جگہ شاعرانہ فنکاری کی معراج ہے، ان شعروں کو جتنی بار پڑھیے، اک نیا لطف محسوس ہوتا ہے!

اقبالؔ کی ایک نظم میں جگنو پرندے سے کہتا ہے ـــ

لباس نور میں مستور ہوں میں　　پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

شاعری کا یہی وہ مقام ہے جس کے لئے عربی کے مشہور شاعر فرزدقؔ نے کہا تھا کہ شاعری کے بھی بعض ایسے مقامات ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر ارباب ذوق پر سجدہ واجب ہوتا ہے ـ

محبت کیا ہے؟ کن عناصر سے مرکب ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کی تفصیل اقبالؔ کی زبان سے سنیئے اور وجد کیجیے

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
ذراسی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

ان شعروں کی شرح وتفصیل کرنے سے ان کی شعریت مجروح ہو جائے گی۔ گلاب کی نرم ونازک پتیاں تشریح کے عمل کو کہاں برداشت کر سکتی ہیں۔

اقبال کا فن اور پیام

"منظر نگاری" جس کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، یہ بھی اقبال کے فن کے نمونے اور اس معدن کے گراں بہا لعل وگہر ہیں! حقیقت یہ ہے کہ جو اقبال کا پیام ہے، وہی اس کا فن (ART) ہے اور جو اس کا فن ہے، وہی اس کا پیام ہے، اقبال نے اپنا اور لوگوں کا دل بہلانے اور فرصت کے اوقات گزارنے کے لئے شاعری نہیں کی۔ اس کی شاعری ذہن وفکر کی تربیت اور سیرت وکردار کی تشکیل کرتی ہے۔ وہ اپنے قدر دانوں سے واہ واہ اور مرحبا کا طالب گار نہیں ہے۔ وہ اپنے فن کی داد زبان عمل سے چاہتا ہے نالہ نیم شبی، آہ سحر گاہی، سوز دل، فقر حیدری، جرات خالد، صدق خلیل، عزم حسین، ایمان صدیق، سطوت فاروقی، یہ ہے اقبال کے فن کا صلہ، اس کی شاعری کی داد تحسین اور اس کے آرٹ کی قدر شناسی! اقبال کو مشاعروں کی تالیوں کی گونج اور واہ واہ کا شور نہیں چاہیے! ایسی باتیں اس کی عظمت فن کے شایان نہیں! اقبال کے فن کی کم سے کم تحسین مژہ کی تمناکی اور دل کی بے تابی ہے۔

اقبال کو اس کا یقین تھا اور خود اعتمادی بھی تھی کہ اس نے اپنے پیام کو اس قدر کامیاب موثر فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ ماحول میں اس سے حرکت اور فضا میں بے چینی پیدا ہونی ہی چاہیے۔

پس من شعر من خوانند و در یابند و می گویند
کہ عالم را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

"خیال واظہار" شعر وسخن کا تانا بانا ہیں، انہی سے شعر ترکیب پاتا ہے! اول تو ہر خیال اظہار کے قابل نہیں ہوتا حقیقی شاعر یہیں کرتا اور نہ اسے کرنا چاہیے کہ جو خیال ذہن میں آیا اسے جھٹ سے نظم کر دیا۔ شاعر بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ اس کے دل ودماغ میں بھی ہر طرح کے برے بھلے خیالات آتے رہتے ہیں، ۔۔ شاعر کو اس کا شعور اور تمیز ہونی چاہیے کہ کونسا خیال قابل اظہار ہے، اور کونسا نہیں ہے۔

دوسری چیز یہ کہ جو خیال قابل اظہار ہے اسے کس پیرایہ میں ظاہر کیا جائے۔ اگر خیال واظہار اور فکر وبیان میں ربط وہم آہنگی نہ ہو، تو بلند سے بلند لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک خیال کی لطافت و ناز کی غارت ہو جاتی ہے اور اس کا حسن خاک میں مل جاتا ہے۔ بیان و اظہار ہی سے شعر میں قوت، جان، دل کشی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

کوئی شک نہیں رمزیت واشاریت شاعری کا حسن ہے، جو لطف اجمال میں ہے وہ تفصیل میں کہاں؟ لیکن زبان اور اظہار و بیان کے اسلوب پر پوری طرح قدرت نہ ہونے سے یہی رمز و کنایہ اور اشارہ "مبہم" بن جاتا ہے! شعر وادب کا لطف الجھاؤ میں نہیں سلجھاؤ میں ہے۔ شعر کو لغز ومعمہ بنا دینا شاعری کا کمال نہیں بہت بڑا نقص ہے۔ الجھی ہوئی فکر کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان بھی خط شکستہ کی طرح جگہ جگہ اکھڑا ہوا اور ژولیدہ ہو تو اس قسم کا شعر وجدان کو شدید ضیق میں مبتلا کر دیتا ہے! ایسا شعر سن کر اور پڑھ کر طبیعت میں بڑی گھٹن ہوتی ہے۔ شعر کا دقیق و نازک ہونا یقیناً خوبی کی بات ہے۔ مگر شعر کا گنجلک ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں، بلکہ شعر کا عیب ہے۔

اقبال کے یہاں خیال واظہار میں ربط وہم آہنگی کی معراج نظر آتی ہے، جیسے اس عروس فکر وتخیل کے لئے الفاظ کا ٹھیک یہی پیرہن موزوں تھا۔ اقبال کے افکار کس قدر نازک اور عمیق ہیں۔ لیکن اسلوب بیان نے اس نازکی اور عمق کو اس قدر سلیس و رواں اور دل کش بنا دیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے وجدان کو فرحت و آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اظہار وبیان میں نزاکت ہے مگر الجھاؤ نہیں، فکر میں گہرائی ہے، لیکن یہ گہرائی "المعنی فی بطن الشاعر" نہیں بننے پائی۔

اقبال کی شاعری میں موضوع کے اعتبار سے آہنگ بدلتا رہتا ہے، اس کا فن کہیں شعلہ ہے، کہیں شبنم ہے، کہیں شاخ گل ہے، کہیں تلوار ہے وہ آتش نوا مغنی بھی ہے، اور دلوں کو دھڑکا دینے والا رجز خواں بھی! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقبال کے فن میں عظمت وشکوہ کے ساتھ تقدیس وعصمت پائی جاتی ہے، جس سے نوجوانوں کی خلوتوں اور تنہائیوں کو پاکیزگی ملتی ہے، یہ بات میں نے خاص طور پر اس لئے کہی ہے کہ شاعری کا عام مزاج یہ ہے، کہ اس سے نوجوانوں کی راتوں اور خلوتوں کو چٹخارے ملتے ہیں!

دوسری زبان کے شعر کا اپنی زبان میں ترجمہ، اس انداز کے ساتھ کہ اصل شعر کی تمام خوبیاں باقی رہیں، بڑا دشوار کام ہے۔ اردو زبان میں شاعروں نے رباعیات خیام، شکنتلا، دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم یہاں تک کہ قرآن کریم تک کو منتقل کر دیا ہے مگر ان منظوم تراجم میں عام طور پر:۔

دندان تو جملہ در دھانند

کا رنگ پایا جاتا ہے، مولانا ظفر علیخاں نے قرآن کی ایک آیت یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون۔ کو اردو میں البتہ اس قدر حسن وخوبی کے ساتھ منتقل فرمایا ہے کہ یہ شعر ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ترجمہ کا مثالی شاہکار بلکہ نقش دوام بن کر رہ گیا ہے!

اقبال نے "بال جبریل" کا سر نامہ سنسکرت کے مہا کوی بھرتری ہری کے شعر کو بنا کر بے تعصبی، وسعت ظرف، علم دوستی اور فنی اخوت کی ایک مثال قائم کر دی ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

یہ ترجمہ نہیں، ترجمہ کا معجزہ ہے! اُردو دنیا کے لئے بھرتری ہری ایک گمنام شاعر تھا، مگر اقبال کے اس شعر نے بھرتری ہری کو اردو دنیا میں شہرت دوام عطا کر دی۔

اقبال کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا ہے، اس لئے اقبال نے اپنے دور کے سب سے بڑے غزل گو جہاں استاد داغ دہلوی سے مشورہ سخن کیا۔ مشورت و تلمذ کا یہ زمانہ بہت مختصر رہا۔ اقبال کی نومشقی کی غزلوں کے تیور بتا رہے تھے کہ اس شاعر کو مستقبل میں روایتی غزل گو شاعر نہیں بلکہ کچھ "اور" بننا ہے؟ مگر کیا بننا ہے؟ اس کا اندازہ اقبال کے استاد داغ کو بھی نہ تھا!

اقبال پر آغاز جوانی میں شعر گوئی کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے۔

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبال
حضرت داغ کے اشعار سُنا دیتے ہیں

اور

میں نے کہا کہ بے دہنی اور گالیاں
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے
بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے

مگر

شعر گوئی کے اس عہد طفولیت میں بھی اقبال کے ایسے شعر ـــ

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے
ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام
سیر اس باغ میں کر باد سحر کی صورت
حال دل کس سے کہوں اے لذت افشائے راز
ایک بھی اس دیس میں محرم نہیں ملتا مجھے

اقبال کے شاعرانہ مستقبل کا اتا پتا دے رہے تھے۔

رسالہ "خدنگ نظر" (۱۹۰۳ء) میں اقبال کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مقطع ہے ـــ

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

شاعری کے اس بچپن میں اقبال، نادر کاکوروی اور میر غلام بھیک نیرنگ کو اپنا ہم صفیر سمجھتا ہے، مگر اقبال کی شاعری جب جوان ہو جاتی ہے تو روح القدس اقبال کو اپنا ہم صفیر نظر آتا ہے، اور بچپن کی شاعری کے ساتھی اور نواسنج منزلوں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کا پہلا قدم نہ جانے کتنے شاعروں کی آخری منزل ہے!

ایک شہسوار کو بچپن میں گھٹنوں چلنا پڑتا ہے، اور ایک فصیح اللسان اور آتش بیان مقرر بھی عہد طفولیت میں تتلا تتلا کر باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح اقبال کی شاعری کا بچپن بھی بولنے اور چلنے میں، اس طرح کے تتلانے اور گرنے پڑنے سے خالی کس طرح رہ سکتا تھا:۔

شجر ہوں گری مجھ پہ برق محبت ہرا ہو گیا ہوں پھلا چاہتا ہوں
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

یہ شعر اسی دور طفولیت کی یادگار ہیں۔

بڑے ہو کر اقبال کے اندر ایک فکری ولولہ پیدا ہوا۔ پری وشوں کو تاکنے جھانکنے، حسینوں سے میل جول بڑھانے، اور معشوقوں کی گلیوں کی خاک چھاننے کا نہیں۔ یہ ولولہ تعمیر و اصلاح اور انقلاب و حرکت کا ولولہ تھا۔ ایک طرف اسلام کے غالب ہونے کی فطرت کا اقبال نے مطالعہ کیا۔ دوسری طرف ملت اسلامیہ کی زبوں حالی اور مظلومیت و ابتری کو دیکھا۔ اس ولولہ اور اس احساس و درد نے اقبال کے کاروان فکر و نظر کا رخ ہی موڑ دیا۔ غزل اس ولولہ اور احساس کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔

اقبال اگر صرف غزل گوئی پر قناعت کرتا تو اس کی شاعری میر کی شاعری کی طرح "آہ" اور غالب کی شاعری کی مانند "واہ" بن سکتی تھی مگر۔ وہ اردو ادب کے لئے دلیل راہ نہ بنتی۔

غزل گوئی کی مشق نے اقبال کے فن کو یہ فائدہ پہنچایا کہ اقبال کو لفظوں کے ٹھیک طور پر برتنے کا ملکہ اور سلیقہ آ گیا لفظوں میں نرمی بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی، وہ آتش مزاج بھی ہوتے ہیں اور شبنم طبع بھی۔ اس نرمی و گرمی اور آتش مزاجی اور شبنم طبعی کو کس طرح کام میں لایا جائے؟ شعر میں لفظوں کے در و بست سے نغمگی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ کس کوتاہی کے سبب شعر کی قبا میں جھول اور سلوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں؟ تنافر، ضعف تالیف، شتر گربگی اس قسم کے عیوب سے بچنے کے لئے کس احتیاط کی ضرورت ہے؟ اس مشق نے، مطالعہ نے، تجربہ نے، اقبال کے فن کو ترقی و پختگی اور اس کے جوہر طبع کو براقی عطا کی!

اقبال بلوغ فکر ہی کے ساتھ روایتی غزل گوئی سے دامن کشاں نظر آتا ہے مگر تغزل جو اس کی شاعرانہ فطرت بن چکا تھا، اس کا رچاؤ اس کے فن کے آخری شاہکار تک میں پایا جاتا ہے؟ پھر بھی غزل گوئی کے اس دور کا یہ شعر ؎

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

سینکڑوں غزلوں پر بھاری ہے!

اردو غزل گوئی کا پہلا موڑ، غالب کا یہ شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اور دوسرا موڑ

اقبال کے یہ اشعار ہیں ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

ان شعروں کو سن کر عوام ہی نہیں خواص تک چونک پڑے کہ ولی دکنی سے لے کر امیر و داغ تک یہ آہنگ تو کسی کو نصیب ہی نہیں ہوا یہ تو "لے" ہی دوسری ہے اور یہ لب و لہجہ ہی سب سے مختلف ہے! اور پھر یہ آہنگ اور لب و لہجہ ان شعروں سے

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا!
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسم شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

میں ڈھل کر دنیائے تغزل میں ایک ایسا نادر عجیب اور خوشگوار انقلاب پیدا کرتا ہے، جس کی نظیر اردو کیا فارسی شاعری میں بھی نہیں ملتی "غزل" عربی میں کہتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنے اور انکے حسن و جمال کی تعریف کرنے کو، "غازل" کے معنی ہیں عورت سے بات کرنا اور پھسلانا ۔ "التغزل" عورتوں کے ساتھ کھیل کود ۔۔۔ اقبال کی غزل میں نہ تو عورتوں سے ہمکلامی ہے، نہ ان کو اپنی طرف مائل کرنے کا داعیہ ہے، نہ ان کے ساتھ لہو و لعب اور کھیل کود ہے۔ اقبال کا تغزل فطرت سے ہمکلامی اور انسانیت سے خطاب ہے، اقبال کا تغزل عشق بازی اور ہوسناکی نہیں سکھاتا، اس میں نہ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ ہے اور نہ رقیبوں سے جنگ و جدال ہے، اقبال کا تغزل عورتوں سے آنکھیں لڑانا نہیں، بلکہ آنکھوں کو غیرت و حیا کے بار سے جھکانا سکھاتا ہے کہ بدکاری کے فتنہ کا آغاز نظارہ و نگاہ ہی سے ہوتا ہے، عشق بازی کے چٹخاروں کا سہارا لئے بغیر غزل ایک قدم نہیں چل سکتی، اس حمام میں بڑے بڑے پاکباز اور سنجیدہ شاعروں تک کو نیم برہنہ ہونا پڑتا ہے، مگر اقبال کا تغزل عصمت و تقدیس کے سایہ میں شوخیاں دکھاتا ہے اور شریفانہ جذبات کو چونکاتا ہے! عام غزل گوؤں کی صف میں اقبال کو کھڑا نہیں کیا جاسکتا، کہ اس کا تغزل سب سے جداگانہ شان اور منفرد آہنگ رکھتا ہے۔

اقبال کے محاسن فن کو چند صفحوں میں نہیں سمیٹا جاسکتا۔ اس کے ایک ایک گوشہ پر پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے! اقبال کے فن کا ذکر چھڑتے ہی "دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار" سے سابقہ پڑتا ہے! میں اقبال کے اشعار کی فنی اور معنوی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گزر جاؤں گا۔

یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملک بقا ہے خط پیمانۂ دل

سب سے بڑی خوبی تو اس شعر میں یہ ہے کہ "ساغر" "مے" اور "خط پیمانہ" جیسے استعاروں کے باوجود، ذہن اس شراب کی طرف منتقل نہیں ہوتا جو بھٹیوں پر کھنچتی اور شراب کی دکانوں پر بکتی ہے۔ پھر "خط پیمانۂ دل" کو "جادۂ بقا ملک" کہہ کر شاعر نے دل کی اہمیت، افادیت، وسعت اور فعالیت کو جس شاعرانہ حسن و خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے، اس پر جتنا غور کیجئے، دل و دماغ کو اتنی ہی بالیدگی اور نشاط حاصل ہوتا ہے ۔

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری!

اس مضمون پر غالب کا یہ شعر یقیناً نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے ۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

مگر اقبال نے جس پیرائے میں اس مفہوم کو ادا کیا ہے، اس نے مضمون میں نیاپن پیدا کر دیا ہے، مصرعہ اولیٰ کس قدر مترنم اور شگفتہ ہے!

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

میں نے اقبال کے اس شعر کو خاص طور سے اس لئے منتخب کیا ہے کہ بعض اُردو شعراء گیت اور دوہے بھی کہنے لگے ہیں، مگر ہندی کے ہلکے پھلکے شبدوں کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ لاکر اپنے کہے ہوئے بولوں کو "آدھا تیتر اور آدھا بٹیر" بنا دیتے ہیں؟ اقبال نے کس سلیقہ کے ساتھ ہندی شبدوں کے موتیوں کی سچ مچ مالا پرو دی ہے!

واعظ، صوفی، ملا اور زاہد پر تنقید وطنز شاعری کا موضوع رہا ہے، حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

بہ زیرِ دلق مرصع کمندہا دارند
درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں

غالب نے اس مضمون کو اور ترقی دے دی ؎

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بہ سجودے ونبی را بہ درودے

لیکن اقبال کا یہ شعر ؎

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز اٹھتا ہے آوازِ اذاں سے

نفسیاتی نزاکت کے اعتبار سے اپنی جگہ اس قدر منفرد ہے کہ شاید ہی کوئی شعر اس کا حریف ہوسکے "دلق مرصع" میں چھپی ہوئی کمندوں اور درود وسجود کا فریب، نظر آسکتا ہے، مگر آواز اذاں سے کرز اٹھنا، ایک ایسی باریک چال ہے کہ "تلبیس ابلیس" کے مصنف اور عابدوں زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کے دلوں کی چوری پکڑنے والے علامہ ابن جوزی بھی اس سے دھوکہ کھا سکتے ہیں ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

"روکئے" کی جگہ "تھام ابھی" لاکر شاعر نے شعر میں کتنی قوت اور جان پیدا کر دی۔ خام کاروں کو پختہ کار بننے کی تلقین جس انداز میں کی گئی ہے یہی اقبال کے "فن" کا کمال ہے۔

ابرنیساں! یہ تنک بخشی شبنم کب تک
مرے[1] کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

شعر میں لفظوں کا دروبست اتنا حسین ہے کہ پڑھنے میں زبان حلاوت محسوس کرتی ہے۔

---

[1] کتاب میں "مرے" چھپا ہے لیکن شعر میں ترنم "میرے" سے پیدا ہوتا ہے۔

پھر باد بہار آئی، اقبالؔ غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر، گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

یہی وہ مقدس تغزل ہے جس کے سامنے غزل کی اباحت شرما سی جاتی ہے۔

مری مشاطگی کو کیا ضرورت حسن معنیٰ کی
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

اُردو کے کسی قدیم شاعر کا بہت مشہور اور خاصہ اچھا شعر ہے ؎

تکلف سے بری ہے حُسن ذاتی
قبائے گل میں، گل بوٹا کہاں ہے

مگر اقبالؔ کے شعر کے آگے یہ شعر ایسا ہی ہے جیسے کسی تنومند حسین و وجیہ سرو قد کے آگے کوئی بالشتیا (قزم DWARF)

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

"بے نیازی" کی حقیقی شان اسی وقت ظاہر ہوتی ہے، جب دسترس کے باوجود کسی چیز کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

اگر یوں کہا جاتا کہ علم جامد بن کر رہ گیا ہے، تو یہ ایک واعظانہ بات ہوتی، اقبالؔ نے علم کو نیام اور عشق کو تیغ جگر دار کہہ کر دونوں کے فرق اور وظیفۂ عمل (FUNCTION) کو واضح کر دیا کہ عشق اور ولولے کے بغیر تنہا علم ایک خالی نیام ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دنیا کی ہر زبان کے اچھے شعروں کا انتخاب کیا جائے تو اقبالؔ کا یہ شعر یقیناً اس انتخاب میں جگہ پائے گا۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اور یہ مٹی اشک صبح گاہی یا خون دل ہی سے نمناک ہو سکتی ہے!

تو ہے محیط بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر!

کتنی اچھوتی اور پاکیزہ تمنا ہے! مصرعہ ثانی میں "ہمکنار" اور "بے کنار" کی صوتی تکرار نے کس قدر نغمگی پیدا کر دی۔

عروج آدم سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

شعر کیا ہے "آیت" ہے! تخیل نادر و بدیع اور اظہار اس سے زیادہ حسین و جمیل!

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران، وہی تبریز ہے ساقی

کہنا یہ تھا کہ خاکِ عجم سے پھر کوئی رومی جیسا انسان پیدا نہ ہو سکا۔ مگر اقبال نے اس خیال کو جن لفظوں میں ادا کیا ہے، اس کے حسن لطافت پر وجدان درود پڑھنے لگتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حق کو "چراغ مصطفوی" اور باطل کو "شرار بولہبی" سے تشبیہ دے کر شعر میں کس قدر واقعیت، لطف اور شکوہ پیدا کر دیا! پھر حق کو "چراغ" کہا اور باطل کو "شرار" اس فرق کی نزاکت شعر کے دوسرے محاسن پر مستزاد! ——— پھر "بولہب" کی معنویت کے ساتھ لفظ "شرار" کی مناسبت، یہ تجنیس معنوی "نورٌ علیٰ نور!"

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر!

امت مسلمہ کی وحدت و اتحاد و یک جہتی پر یہ شعر الہام کے حدود کو چھو رہا ہے۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے گوہر کی ہے سیرابی

ظالم کا ظلم اور باطل کی شورش ہی مظلوموں اور حق پسندوں کو بیدار کرتی اور انہیں حوصلہ مند بناتی ہے۔ مصرعہ ثانی میں تشبیہ کتنی مکمل اور تام ہے۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

مصرعہ ثانی اُردو زبان و ادب میں ضرب المثل بن چکا ہے!

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے

حنا بندی — عروس لالہ — خون جگر — معمار و براہیم، اقبال کی پسندیدہ اصطلاحیں ہیں ان اصطلاحوں سے اقبال شاعری کے شاہکار اور ادب کے تاج محل تعمیر کرتا ہے۔

میانِ شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیلِ رہبانی

پہلے شعر میں مرد مومن کو حرکت عمل کا پیام دیا گیا ہے اور دوسرے شعر میں بتایا ہے کہ کائنات میں اس کا مقام اور کام کیا ہے "میانِ شاخساراں" "شاہین قہستانی" ۔ "گماں آبادِ ہستی" ۔ "قندیل رہبانی" ان ترکیبوں کے حسن اور شکوہ کو دیکھیے ۔

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس شعر میں مظلوم و پامال مسلمانوں کے شکستہ دلوں کو تھامنے اور جوڑنے کی کتنی قوت پائی جاتی ہے ۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

"جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" تہذیب حاضر کی ظاہری چمک دمک پر کس قدر بھرپور تنقید ہے ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ایسے ہی شعروں پر "جزویست از پیغمبری" کی مثل صادق آتی ہے !

شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبول حق ہیں فقط مرد حر کی تکبیریں

مظلوم و مقہور مسلمانوں کو کس موثر انداز میں غیرت دلائی ہے ؟ شعر کے تیور کتنے تیکھے ہیں ۔

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں   تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

جبر و قدر اور تقدیر و تدبیر کے مسائل کتنے الجھے ہوئے اور متنازعہ فیہ ہیں ! اقبال نے مسلمانوں کو "تقدیر یزداں" کا درس دے کر اور اس منصب کا سزاوار بنا کر "تقدیر" کی دینی حیثیت کو بھی نہیں چھیڑا اور "عمل و حرکت" کی ضرورت اور اہمیت کا بھی اظہار کر دیا نہ جانے کتنے معرکے سر کرنے اور کتنے طوفانوں سے گزرنے کے بعد ہی کوئی شخص "تقدیر یزداں" بن سکتا ہے ۔

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے   اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

خودی کو ناموس اور عزت و عفت کی حفاظت کے لئے سخت بلکہ درشت بننے کی ضرورت ہے ۔ اس خیال کو اقبال نے کس دل نشین انداز میں ادا کیا ہے "خوئے حریری" کی لفظی ترکیب اس شعر میں نگینہ کی طرح دمک رہی ہے ۔

باقی نہ رہی وہ تری آئینہ ضمیری   اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

"آئینہ ضمیری" ہی نے شعر کو بہت کچھ چمکا دیا تھا، مصرعہ ثانی میں صنعت ایجاز نے اس کے حسن کو اور دوبالا کر دیا ۔

ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے ۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

"مزاج خانقاہی" پر اس طرح کی طنز کر کے کہ ابلیس اپنے اخوان اور مشیروں کو تاکید کرتا ہے کہ مسلمان میں جو مزاج خانقاہی پیدا ہو گیا ہے اسے پختہ تر کر دیا جائے، اقبال نے اس طلسم کشف و مراقبہ پر شاہ ضرب لگا دی ۔

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے   گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اس شعر میں "غلط آہنگ" کا حسن آہنگ دیکھیے! اس نغمہ طرازی کے پردے میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ دل کی حالت سے آدمی کو ایک لحظہ کے لئے بھی غافل و بے خبر نہیں رہنا چاہیے!

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

یہ شعر عمل و حرکت کا پیغام ہے، اس میں طنز ہے فلسفہ و کلام، الٰہیات و تصوف کے مسائل اور فقہ کی اس مفروضہ جزئیات پر جس کا عمل سے برائے نام تعلق ہوتا ہے! اس شعر کی معنویت "مسائل نظری" میں اس طرح جھلک رہی ہے جیسے موتی میں آب!

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور		چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اقبال نے عقل کی ضرورت و افادیت کی کہیں نفی نہیں کی، ہاں! اس کو حَکَم اور رہبر کامل نہیں مانا، عقل منزل مقصود کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے، وہ اندھیرے میں چراغ دکھا سکتی ہے، مگر وہ ذریعہ ہے اصل مقصود نہیں ہے جس نے صرف عقل ہی پر بھروسہ کیا، وہ منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکا!

مرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر
مرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو

حمد و دعا کا یہ وہ مقام ہے، جہاں بندہ اپنے رب کو واقعی شہ رگ سے بھی نزدیک تر محسوس کرتا ہے۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ واقعہ ہے کہ سائنس جتنی ترقی کرتی جا رہی ہے، آدمی اتنا ہی بے مروت خود غرض، آرام پسند اور آخرت فراموش ہوتا چلا جا رہا ہے

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اشتراکیت مر کر اگر کبھی زندہ ہوئی تو اس شعر کے سہارے زندہ ہو گی۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ

شیخ کی ریاکاری اور دنیا طلبی پر ایسا کاری وار شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کیا ہوا! مصرعہ ثانی فن کے اعتبار سے کس قدر جاندار ہے۔ شخصیتوں کے اعتبار سے گلیم، دلق اور چادر کا فرق کس قدر نفسیاتی اور واقعاتی ہے۔

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

غلامی اور محکومیت میں سچ مچ یہی ہوتا ہے کہ غلام اپنے آقا کی نگاہ سے ہر چیز کو دیکھتا اور اس کے دماغ سے سوچتا ہے! اس کی زندہ مثال خود ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ہیں کہ رقص و سرود، بت گری، مصوری، عورتوں کی بے حجابی، یہ تمام چیزیں انگریز کی نگاہ میں خوب و زیبا تھیں، اس لئے ہم بھی ان کی خوبی و زیبائی پر آج تک فریفتہ ہیں۔

مے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن!		کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی

کارلائل نے اسی قسم کے شعروں سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ــــ "شعر مترنم خیال ہے"۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

عربی کی مشہور ضرب المثل "الحق مُر" کی شاعرانہ توضیح!

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

اقبال کا یہ وہ انداز بیان ہے، جو صرف اسی کے لئے مخصوص اور مقدر کر دیا گیا ہے!

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پاکستان اسی شعر کی صدائے بازگشت ہے

آذر کا پیشہ خارا تراشی
کار خلیلاں خارا گدازی

اس دور میں جسے "آرٹ" کہا جاتا ہے، اس بت کے لئے یہ شعر تیشۂ ابراہیمی ہے!

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

اس شعر میں اقبال نے ان فلسفیوں اور سائنس دانوں کے نظریہ کی تردید کی ہے جو "مادہ" ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں اس عالم آب و گل کے علاوہ اور اس کے بعد نہ کوئی دوسرا عالم ہے اور نہ زندگی ہے!

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی -
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

قطرۂ شبنم کے مقابلہ میں نسیم سراپا حرکت و عمل ہے، اس لئے نسیم کی بے تابی اگر شبنم کا ساتھ نہ دے تو غنچہ نشو و نما ہی نہیں پا سکتا! کارآج نے غلط کہا تھا "شعر کا راست مقصد انبساط ہے نہ کہ صداقت" اقبال کا یہ شعر اس کے نظریہ کو چیلنج کرتا ہے - اقبال کے اس شعر میں نشاط و انبساط کے علاوہ صداقت، و واقعیت بھی پائی جاتی ہے -

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال رہبانیت اور بھکشوؤں اور برہم چاریوں کی زندگی کا بہت بڑا مخالف ہے - اس شعر سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو جائے کہ وہ ترک دنیا اور رہبانیت کا درس دے رہا ہے! اقبال نے اس شعر میں فاتحوں، کشور کشاؤں، حوصلہ مندوں بلکہ یوں کہئے صدیق و فاروق اور سلمان و حیدر اور خالد و ضرار کے کرداروں کی طرف شاہین کے استعارے میں اشارہ کیا ہے، کہ وہ دنیا پر چھا گئے اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج روند ڈالے، مگر دنیا کی چمک دمک میں نہ الجھے - شاہین کو "پرندوں کی دنیا کا درویش" کہہ کر اقبال نے اپنے فن کی نمائش نہیں کی - اس کا فن خود بخود اس طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے پھول سے خوشبو اور چاند سے روشنی -

باغی مرید اپنے پیروں پر اقبال کی زبان سے یوں احتساب کرتے ہیں۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کو "آئی" کی جگہ "ملی" کہنا چاہیئے تھا، مگر اقبال کی شاعری کے جس بلند مقام پر فائز ہے اس کے لحاظ سے اقبال کو "شاعرانہ اجازت تصرف" یعنی (POETIC LICENSE) تو ضرور دینا ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے تو "مقدمہ دیوان غالب" میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ غالب اور شکسپیر اس درجہ کے شاعر ہیں کہ ان کی خاطر تمہیں اپنی گرامر بدلنی ہوگی۔ اسلاف جو کتاب و سنت کے متبع تھے، ان کو اقبال نے عقابوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کے ناخلف جانشینوں کو "زاغوں" سے! اس ابتری اور سفلہ پروری کا تصور کیجئے، جب عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آجائیں!

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

افلاطون اگر زندہ ہوتا، تو اقبال کے اس شعر کو سن کر اسے ندامت ہوتی کہ میں نے اپنی خیالی ریاست سے شاعر کو کس لئے خارج کر دیا۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اور ہماری اذانیں آہ! کتنی بے جان ہیں، جو ایک تنکے کو بھی جنبش نہیں دیتیں۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا الٰہ الا اللہ!

پہلے شعر میں کس قیامت کی نغمگی ہے، دوسرے شعر میں جوش و ولولہ اور عزیمت ہے! یہ شعر ان کم ہمت لوگوں کے لئے تازیانۂ غیرت ہے جو ماحول کی ناسازگاری کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں!

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

شعر کیا ہے، نغمۂ زبور ہے! سبحان اللہ!

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

شعر کا یہ آہنگ روح القدس کی تائید کے بغیر کہاں میسر آتا ہے؟

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے؟

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے

پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ

انسانی شخصیت کے کتنے پہلو ایک بند میں پیش کر دیئے — پھر کسی مصرعہ میں ذرا سا جھول بھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ ہر مصرعہ ترشے ہوئے پہلودار ہیرے کے مانند تابناک اور متناسب نظر آتا ہے۔

ابلیس — جبریل سے کہتا ہے:—

گر کبھی فرصت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!

جن صوفیا نے ابلیس کو "موحد" کہا انھوں نے سخت ٹھوکر کھائی! ابلیس کی شخصیت اور قرآنی تلمیح کو اقبال نے [illegible] انداز میں پیش کر کے کس قدر لطف پیدا کر دیا۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی

ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

صوفی و ملا کی عافیت کوشی اور آرام طلبی پر کتنی فنکارانہ پھبتی چست کی ہے، سرِ دامن کے چاک نہ ہونے نے، اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ صوفی و ملا کو جنونِ محبت کی ہوا بھی نہیں لگی۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے

دیا تھا جس کو پہاڑوں نے رعشۂ سیماب

مصرعۂ ثانی کے تیور دیکھئے، یہ اسلوبِ بیان اُردو کے کس شاعر کو نصیب ہوا ہے؟

خداوندا! ترے یہ سادہ دل بندے کہاں جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

درویشی اور سلطانی پر یہ چوٹ حقیقت سے کتنی قریب ہے!

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

صرف حکمت و دانائی کی باتیں سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی کے معرکے جرات و سرفروشی سے سر ہوتے ہیں "سر بجیب" اور "سر بکف" کی صنعتِ تضاد نے فنی اور معنوی طور پر شعر کو کس قدر بلند کر دیا!

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے

وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دل آویزی

شاعر "سوادِ رومۃ الکبریٰ" کی جگہ "فضائے رومۃ الکبریٰ" بھی کہہ سکتا تھا مگر "سواد" نے شعر میں جو شکوہ پیدا کر دیا "فضا" سے وہ بات کہاں پیدا ہوتی؟ اقبال کے فن کا یہ پہلو خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے کہ وہ موزوں سے موزوں تر الفاظ انتخاب کرتا ہے۔

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

موتی کی آب ہی تو سب کچھ ہے، یہ جاتی رہی تو موتی میں کیا رہا؟ اسی "آب" کو اقبال نے خودی سے تشبیہہ دے کر اخلاق کا ایک کلیہ وضع کر دیا۔

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں!

ڈبلو، جے کورتھوپ نے شاعری کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی — "کہ وہ مسرت آفریں صنعت گری کا نام ہے"۔ اس شعر میں یہ صنعت کس حسن و زیبائی کے ساتھ جھلک رہی ہے!

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے!
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اسی "نشہ قوت واقتدار" نے صفحۂ ارض کو انسانوں کے خون سے رنگین بنایا ہے، اور ظلم وستم کے طرح طرح کے روپ دھارے ہیں — صاحب نظراں، نشہ قوت، اور خطرناک، ان لفظوں کے در وبست نے شعر میں کتنی قوت اور حسن پیدا کر دیا!

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایمان زبان کے ساتھ ساتھ تصدیق قلب کا نام ہے، دل ونگاہ اور سیرت وکردار کے مسلمان بننے کے بعد ہی "لاالٰہ" کا اقرار معتبر قرار پاتا ہے۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا؟
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

علم کلام اور منطق وفلسفہ کی کتنی موشگافیاں ہیں جو صدف کے خول سے آگے نہیں بڑھ سکیں، اور گوہر مقصود کو نہیں پا سکیں۔ اقبال نے سامنے کی بات کہی ہے، مگر اس انداز میں کہی ہے کہ وجدان جھومنے لگتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس خاشاک میں ہے

پہلا شعر الہام ہے اور دوسرا شعر پیغام ہے! "شرر زندہ" نے شعر کو اور زیادہ گرما دیا اور چمکا بھی دیا۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

الفاظ کی نشست سے لے کر معنویت تک اعجاز ہی اعجاز!

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

مغرب زدگی، اشتراکیت زدگی اور بے حیائی کے اس دور میں یہ شعر سچ مچ نوائے سروش ہے!

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو
ہر قطرۂ دریا میں، دریا کی ہے گہرائی

جس دریا کے ہر قطرہ میں دریا کی گہرائی ہو، تو خود وہ دریا کس قدر گہرا ہوگا! اس قسم کا "بیان" اقبال کے "اولیات" میں شامل ہے اقطرہ کو وسعت کے اعتبار سے دریا تو کہا گیا ہے مگر قطرہ کو دریا کے برابر گہرا کسی نے نہیں کہا۔

پلادے مجھے بادۂ پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

"بادۂ پردہ سوز" نے ذہنوں میں اس شراب کا جسے "ام الخبائث" کہا گیا ہے، خطرہ تک نہیں آنے دیا۔ مصرعہ ثانی زبان و روزمرہ کے اعتبار سے کس قدر سلیس درواں ہے اور ساتھ ہی شگفتہ بھی!

اٹھا ساقیا! پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

"ممولے" نے شعر کی ندرت و نزاکت میں اور پر لگا دیئے!

گیا، دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

"مداری" — یہ لفظ نظیر اکبر آبادی کے کام کا تھا، مگر اقبال نے جس مقام پر اس لفظ کو استعمال کیا ہے، اس کے سبب یہ شعر عوامی بلکہ غیر فانی بن گیا۔ ممولا، مداری، پاپی، شکتی جیسے ہندی لفظوں کو اقبال نے جس موزونیت کے ساتھ استعمال کیا ہے، اس نے ان کے فن میں بڑا تنوع پیدا کر دیا ہے۔

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

جو کوئی اقبال کی زبان پر طنز کرتا ہے، ایسے کور ذوق اور بے رحم و غلط اندیش نقاد کو اقبال کے اس قسم کے شعر چیلنج کرتے ہیں کہ فکر و تخیل کی معراج کے ساتھ، اقبال کے یہاں زبان کا لطف بھی ملتا ہے!

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

اس شعر کی روشنی میں مسلمان اپنے احوال کا جائزہ لے کر دیکھیں اور توبہ و انابت کے بعد احتیاطاً تجدید ایمان کر لیں۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

فارسی کے مشہور مصرعہ — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند — سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اقبال نے دور حاضر کے نہ جانے کس کس صاحب اقتدار کی "سلطانی و خواجگی" کو بے نقاب کر دیا!

بیان میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے

منکرینِ خدا کے دل و دماغ و عقل و فہم و بصیرت پر یہ شعر کتنی سچی اور واقعی طنز ہے!

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر نہ کر سکا!

آج کی دنیا میں یہی ہو رہا ہے کہ انسان خلا میں سفر کر چکا ہے اور چاند ستاروں میں پہنچنے کی تیاریاں قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں مگر وہ خود اپنی سیرت و کردار کی تعمیر سے غافل ہے!

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ

اقبال کا یہی وہ فن ہے، جہاں وہ تمام شاعروں میں ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ سنجیدہ اور باوقار انداز میں کتنی بڑی بات کہی ہے! اس شعر میں "صاحبِ مازاغ" — یعنی صاحبِ معراج (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کی تلقین کتنے موثر اور جاذب و حسین انداز میں کی گئی ہے! خیرگی کا تعلق بصارت سے ہے اس کی مناسبت سے "مازاغ" (البصر) لایا گیا۔

بہتر ہے کہ بیچارے ممولے کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

"حال و مقام" تصوف کی معروف اصطلاحیں ہیں، ان کو شعر میں سمو کر، ممولے اور باز کی زندگی اور حدودِ پرواز اور فضائے تگ و تاز کے فرق کو واضح کیا اور اس طرح یہ شعر پیغام و فن کا ایک دفتر بن گیا۔

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اس شعر کی ساری عمارت اس مرکزی خیال پر قائم ہے کہ مکتب کے قدیم طریقِ تعلیم سے دورِ حاضر کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا۔ اس خیال کو اقبال نے "کبریت" اور "بجلی کے چراغ" کی تشبیہ کے قالب میں ڈھال کر شعر کو کیا سے کیا بنا دیا۔ کبریت (گندھک) میں کوئی شک نہیں گرمی ہوتی ہے، مگر اس گرمی سے بجلی کا چراغ تو روشن نہیں ہو سکتا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

"---- اشدّاء علی الکفار رحماء بینھم" کی تفسیر اس شاعرانہ کمال کے ساتھ کی ہے کہ خود اس تفسیر پر الہام کا دھوکا ہوتا ہے! حلقۂ یاراں "مقامِ بزم" ہے، اس کے لئے "بریشم" کا لفظ لایا گیا، رزمِ حق و باطل میں تیغ و سناں کی ضرورت پڑتی ہے، اس کی ترجمانی "فولاد" سے کی گئی!

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و اسرافیل کا صیاد ہے مومن!

"کنجشک و حمام" اور "جبریل و اسرافیل" کی تشبیہات اقبال کے آرٹ کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ کس اچھوتے انداز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مردِ مومن معمولی باتوں اور حقیر مسائل میں نہیں الجھتا اور کبوتروں اور چڑیوں کا شکار نہیں کرتا، وہ تو "جبریل و اسرافیل" کا صیاد ہے، یعنی زندگی کے اہم اور معرکہ آرا مسائل اس کی تگ و تاز کا موضوع ہیں۔ اس کی نگاہ چڑیوں کے گھونسلوں پر نہیں ہے، وہ تو فاتح

خیبر شکن اور قلعہ کشا ہے۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن!

نظامی عروضی سمرقندی نے شعر کو ایسی صنعت سے تعبیر کیا ہے، جس کی بدولت موہومات کی ترتیب سے چھوٹی چیز کو بڑا اور زشت کو خوب ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مگر اقبال کے صرف یہ دو شعر نظامی سمرقندی کی اس رائے کی تردید کر رہے ہیں! ان شعروں میں اقبال نے موہومات اور مفروضات سے نہیں بلکہ حقائق سے کام لیا ہے! مردِ مومن کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ مظلوموں اور پریشان حالوں کے زخموں پر مرہم رکھتا اور تشنہ کاموں کے دلوں کو ٹھنڈک پہونچاتا ہے، مگر ظالموں اور سرکشوں کے مقابلہ میں اس کی یہ نرمی درشتی سے سخت گیری سے اور ہیبت سے بدل جاتی ہے اور ان لوگوں کے دل اس کا نام سن کر دہل جاتے ہیں۔

دوسرے شعر میں سورۂ رحمٰن کے آہنگ سے جو مردِ مومن کو تشبیہ دی گئی ہے، اس کی معنویت، جزالت اور نغمگی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا یہی وہ مقام ہے، جہاں اقبال یہ محسوس کرتا ہے:-

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

شعراء تو لفظوں کے بت تراشتے ہیں کہ لوگ ان کی پرستش کریں، مگر اقبال نہ بت گر ہے اور نہ صنم پرست ہے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی، بت گری مقصود نیست

صبح کے موضوع پر ہر زبان میں نظمیں کہی گئی ہیں۔ یہ موضوع جس قدر نرم و نازک ہے، اسی قدر حیات بخش اور انبساط آفریں بھی ہے! اقبال نے ایک شعر میں "پیام" بھی دیا، اور اس پیام میں صبح کی تعریف بھی بیان کردی:-

مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے

"سورج کی کرن" پر ایک شعر ہے

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

کہا، اور شعر کو سچ مچ "سحرِ حلال" بنا دیا۔ اس قسم کے شعر گواہی دے رہے ہیں کہ اقبال کا جمالیاتی ذوق بلند ہی نہیں پاکیزہ بھی ہے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

لفظوں کے آہنگ سے تابندگی کے ساتھ نغمگی بھی پیدا ہو رہی ہے۔

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے — یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

یہ شعر سائنس کے صنعتی دور پر کتنی چبھتی ہوئی طنز ہے کہ افرنگ کو "وادیٔ ایمن" کہا مگر ایسی وادی جہاں "تجلیٔ حق" کا ظہور نہیں ہو سکتا۔

ممکن نہیں تخلیق خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

"شعلۂ نم خوردہ" اور پھر "ٹوٹے گا شرر کیا"، ان سے شعر ترکیب پا کر کتنا حسین، جاندار اور اثر انگیز بن گیا۔

اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

"ترش ابرو" کی ترکیب اُردو شاعری میں غالباً پہلی بار استعمال ہوئی ہے! اقبال کا یہی آرٹ ہے جو حسین و نادر ترکیب و تشبیہ کے سہارے لفظ و معنی کا قصر کھڑا کر دیتا ہے۔

ستارہ صبح کا روتا تھا اور کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی

چوتھا مصرعہ حباب کے مانند نازک، اور شرارے کی طرح تابناک ہے!

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

تلوار کی شاعروں نے کیسی کیسی تعریفیں کی ہیں، خاص طور سے انیسؔ و دبیرؔ کی شاعری کا تو "تلوار" خاص موضوع ہے، مگر اقبال نے تلواروں میں جو بجلیوں کے آشیانے دکھائے ہیں، یہ تشبیہ کسی شاعر کو نہیں سوجھی:۔

سکوت محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے! مصرعہ ثانی شاعری کا معجزہ ہے۔

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اقبال کی نظم "گورستان شاہی" کا یہ ایک شعر ہے! جن بادشاہوں کی تدبیرِ جہاں بانی سے زوال ڈرتا ہو ان کا پیوند خاک ہو جانا، کس قدر عبرت انگیز ہے۔

اسی نظم کا ایک اور شعر ہے۔

دھر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اس گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

اس دور کے مسلمانوں کو گزرے ہوئے طوفانوں کے "آخری بادل" کہہ کر شاعرِ مشرق اور حکیم ملت نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر کھینچ دی۔

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

"خاکم بدہن" کا شعر و ادب میں شاید ہی کہیں اس قدر برمحل استعمال ہوا ہو۔

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

"شکوہ" علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی نظم ہے مگر یہ نظم انکے پیام و فن کا شاہکار ہے۔ اس نظم نے اُردو شاعری میں سنگ میل قائم کر دیا۔ اسے سن کر لوگ چونک پڑے کہ یہ تو آہنگ ہی عجیب ہے! "مسدس حالی" کے ہوتے ہوئے "شکوہ" کا مقبول ہونا، اقبال کے فن کی اقبال مندی کی دلیل تھی! ابھی ابھی جو چند شعر پیش کئے گئے ہیں وہ اسی سلک مروارید کے چند جواہر ہیں، جن کی تابنا کی کو زمانہ کا کوئی انقلاب دھندلا نہیں سکتا!

"عین" عربی لفظ ہے اس لئے لفظی تناسب و آہنگ قائم رکھنے کے لئے عربی یا فارسی کا کوئی لفظ اس (عین) کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔ اس طرح۔ "عین معرکہ آرائی" میں یا "عین ہنگام جدال و قتال" مگر اقبال نے "لڑائی" ٹھیٹ اردو لفظ استعمال کیا، اور اس لئے "عین" کے ساتھ مربوط ہو کر، شعر میں بے پناہ قوت پیدا کر دی۔ لفظوں کے برمحل استعمال اور صحیح انتخاب نے اقبال کے فن کو مثالی آرٹ بنا دیا ہے۔

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں!

پیام، تخیل، اظہار اور شاعرانہ فن کاری، ہر چیز خوب سے خوب تر! اور رہی تاثیر، تو وہ اس شعر میں برق تپاں بن کر دوڑ رہی ہے

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندے کو خدا سے تو نے

"شکوہ" میں "خاکم بدہن" جس موزونیت کے ساتھ نظم ہوا تھا: "جواب شکوہ" میں "حسن ادا" نے اس توازن اور آہنگ کو قائم رکھا۔ "شکر شکوے کو کیا" ان لفظوں کی بلاغت کا کیا کہنا۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

دوسرے مصرعہ کی تدریجی ترقی کس قدر وجد آفریں ہے۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

اس شعر میں اقبالؒ نے "نشہ" کو غیر مشدد شین کے ساتھ بر وزن "پردا" نہیں، بلکہ بر وزن "وفا" نظم کیا ہے، اور یہی اہل زبان کا روزمرہ اور لب و لہجہ ہے! شعر میں لفظوں کا دروبست (CONSTRUCTION) ایسا ہی کہ پڑھنے میں زبان حلاوت محسوس کرتی ہے۔

اس چمن میں پیرو بلبل ہو، یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر

"تلمیذِ گل" اردو زبان میں کتنا رنگین و حسین اضافہ ہے! میں نے ایک شعر کہا تھا ؎

سراپا شوق بن، یا بے نیازِ آرزو ہو جا
جہانِ عاشقی میں یوسفی کر یا زلیخائی

مگر اقبالؒ کے اس شعر کو پڑھ کر میرا زعمِ اولیت و تقدم جاتا رہا

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

مغرب زدگی کے اثر سے ملتِ بیضا کی جو حالت ہوئی ہے، اس کے لئے :-
"ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز"
کی مثال لا کر حقیقت کا کس دقتِ نظر اور فنکارانہ نزاکت کے ساتھ تجزیہ کیا ہے!

ابھرا ہیں نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینہ میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

غالبؔ نے تو صریرِ خامہ کو نوائے سروش یوں ہی شاعرانہ رسمی تعلّی کے طور پر کہہ دیا تھا، مگر اقبالؒ نے جب یہ شعر کاغذ پر لکھا ہوگا، تو اس کے صریرِ خامہ سے سچ مچ نوائے سروش پیدا ہوئی ہوگی۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرہ کا دل چیریں

یہ وہ اندازِ بیان اور شاعرانہ آرٹ ہے، جو ان لوگوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے جن کو سخن سنجی، سخن گوئی اور فنکاری کا دعویٰ ہوتا ہے۔ اور جو دوسرے شاعروں کے فن سے مرعوب نہیں ہوتے۔

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

مرکزی خیال یہ تھا کہ شاعر کا دل ہر حال میں خوش رہتا ہے، مگر اقبالؒ نے اس خیال کو غنچہ کے ذوقِ شکر خند کی تشبیہ کے ساتھ جس انداز سے بیان کیا ہے، اس نے ایک عالمِ مستی و سرخوشی اور فضائے خودداری و بے نیازی پیدا کر دی۔

"صدیقؓ" جس نظم کا عنوان ہے اس کا یہ شعر ؎

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا　　جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

کتنا "ڈرامائی" ہے! یہیں سے نظم کے (CLIMAX) کا آغاز ہوتا ہے!

اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

فلسفۂ خودی کا یہ مبلغ بلکہ یوں کہئے 'موجد و مخترع' اس کا احساس رکھتا تھا کہ اس کے پیغام اور فن کا کیا مقام ہے، اس نے شعر سے کیا کام لیا ہے، مغرب زدگی، مادہ پرستی، ملائیت اور سلطانی و پیری یہ سب اس کا ہدف ہیں، اسی لئے ان کے علمبردار اس سے خفا ہیں اور اسے برداشت نہیں کر سکتے!

چمن ہے 'غزل سرائی ہے' شاعر کا نفس ہے، لالہ کی آگ ہے، ان لفظوں نے تخیل کو کس دل کش پیرایہ میں ظاہر کیا ہے، اس سے زیادہ دل کشی کا تصور نہیں کیا جا سکتا!

اقبال کے فن کی مشکلات

اقبال کے فن کے بارے میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ اس نے نشاط و خوشی کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا، کہ لوگوں کے دل اس سے بہلیں، رقص و سرود کی محفلوں میں اس کے کلام سے گرمی پیدا ہو، عاشقانہ خط و کتابت میں اس کے شعر استعمال کئے جائیں اور اس کے شعر پڑھ پڑھ کر لوگ شرابیں پئیں، کھیلیں کودیں، ناچیں اور خوش فعلیاں کریں۔

اقبال نے شاعری کی اس روش عام کو چھوڑ کر سچ تو یہ ہے کہ بڑا خطرہ مول لیا۔ خطرہ اس کا کہ لوگ نشاط و سرخوشی کی شاعری کے عادی ہو چکے ہیں، ان کی عادت، ذوق اور مزاج و طبیعت کے تقاضوں سے ہٹ کر شعر کہے جائیں گے، تو قبول عام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس شاعر کی شاعری کو قبول عام حاصل نہ ہو، اس کی شخصیت مجہول بن کر رہ جاتی ہے۔

مناظر فطرت پر، انسانی حسن و جمال پر، شراب پر، رقص اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر شعر کہنا اس لئے آسان ہے کہ ہر زبان کے شعر و ادب میں ہزاروں نمونے پہلے سے موجود ہیں۔ پھر یہ موضوعات رنگین ہیں، اس لئے پیرایہ بیان اور طرز ادا میں رنگینی کی سے لے آخر تک قائم رہتی ہے، اور اس طرح غزل ہو یا نظم ان میں رنگینی اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہی چیزیں شاعری کی جان ہیں۔

"حسن و عشق" کے موضوع پر شعر کہنے میں شاعروں کو سہولت بلکہ یوں کہئے کہ "چھوٹ" ملتی ہے، اس میدان میں ان پر کوئی قید اور پابندی نہیں۔ انتہائی ثقہ اور مہذب و سنجیدہ شاعروں نے جن کے ناموں کے ساتھ حضرت اور رحمت اللہ علیہ لکھا جاتا ہے، وصل و اختلاط کی باتیں جب بیان کی ہیں تو ضرورت سے زیادہ بے باک ہو گئے ہیں۔

اقبال نے جس پیغام کو موضوع سخن بنایا، شاعری میں اس کے چند نمونے تو ضرور پائے جاتے تھے، مگر کوئی مثالی نمونہ، مکمل نقش اور واضح شاہراہ موجود نہ تھی۔ اقبال کو اپنی منزل خود بنانی پڑی۔ اس کے پیغام نے اسلام و اخلاق کی جس طرح کھل کر بلکہ یوں کہئے کہ فیصلہ کن انداز میں ترجمانی کی ہے، اس کا نمونہ پہلے کہیں نہیں ملتا! اس سے اقبال کے پیغام و فن کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسے سچ سچ شعر میں خون جگر حل کرنا پڑا ہے، تب کہیں جا کر یہ خاکے اور مرقعے دل کش و رنگین اور جاذب نظر بن سکے ہیں۔

نوجوانوں کو نظارہ بازی اور ہوسناکی کے چٹخاروں کے لئے ابھارنا آسان ہے۔ یہ موضوع خود نہایت رنگین اور چٹخارے دار ہے شعر کہنے کا سلیقہ ہو تو نہایت ہی رنگین اور طربناک غزل یا نظم تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن جو شاعر نوجوانوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی!
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

اس کی دشواریوں اور جگر کاویوں کا کیا پوچھنا!

اقبال کی فکر ایک خالص دیندار کی فکر ہے، جس کی نگاہ میں رقص و موسیقی، عورتوں کی بے حجابی، یہاں تک کہ سینما، مجسمہ سازی اور تصویر کشی تک ناپسندیدہ ہیں۔ مگر اقبال کے فن کا یہ کمال ہے کہ اس نے اخلاق و پاکبازی کا درس دیا اور زمانہ کے غلط تقاضوں کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر وہ چیز جسے "شعریت" کہتے ہیں، پھیکی نہیں ہوئی، بلکہ اس کا رنگ اور زیادہ نکھر گیا۔

اقبال نے بے شک اخلاق کا وعظ کہا، مگر واعظوں کے لہجہ میں نہیں، اس کا لہجہ خالص شاعرانہ ہے۔ شعر و سخن کے تمام محاسن اس کے کلام میں جلوہ گر ہیں۔ وعظ و تلقین کو اقبال نے شعریت کے قالب میں ڈھال کر اپنے پیغام کو اس قدر حسین و جمیل اور دلچسپ بنا دیا ہے کہ مغرب زدوں کے جس طبقہ پر اقبال طنز کرتا ہے، خود یہ طبقہ اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے!

"حق" تلخ اور بے مزہ ہوا کرتا ہے، مگر اقبال کے فن کا یہ کمال ہے کہ اس کے کلام میں حق کی یہ تلخی اور بدمزگی حلاوت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کے فن نے ایلوے کو شہد اور حنظل کو نبات و قند بنا دیا ہے۔

اقبال کا فن دنیا کے اس عظیم ترین شاعر کا فن ہے کہ:-

جہاں سب ہیں وہاں بھی ہے وہ موجود

جہاں وہ ہے، وہاں کوئی نہیں ہے (م - ق)

خیابانِ تغزل

جناب ہاشم محمد اسمٰعیل کے توسط سے حضرت اشک مرحوم کی جو غزلیں ملی ہیں یہ انتخاب انہی غزلوں سے کیا گیا ہے

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگذر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے،
میری نظر کہیں ہے تو اُنکی نظر کہیں

خامیٔ وحشت نہ کر زنداں میں اتنا شرمسار
سر نہیں اُٹھتا مرا دیوار و در کے سامنے

سکون موت کے پردے میں ڈھونڈنے والے
فنا کے بعد بھی پھر نہ زندگی مل جائے

خدا ملے گا تو خود سے ملے گا اے زاہد!
دُعا یہ مانگ تجھے کوئی آدمی مل جائے

مرنے والا غم کی جیتی جاگتی تصویر تھا
آنکھ سوئے چرخ تھی، لیکن نظر جانے کہاں

ہزار بار پلٹ کر اگر شباب آتا
ہزار بار ترے غم سے ابتدا کرتے

وہ سرِ بزم نہ پوچھیں مرا حال
بات رہ جائے الٰہی میری

مُدعی تم ہو تو انصاف کرو
کون دیتا ہے گواہی میری

گلہ ہے تو ہے موت سے بے رُخی کا
مجھے زندگی سے شکایت نہیں ہے

یارا نہیں دل کو اب خوشی کا
اب ہاتھ بڑھا نہ دوستی کا

اللہ رے! ناصح یہ تری سحر بیانی
نام آتے ہی اس شوخ کا ہم اور کہیں تھے

تیرا دامن اور گواہی دے نہ میرے قتل کی
خون کے چھینٹے نہ ٹھیرے، کوئی گل بُوٹے ہوئے

حالتِ زخم دروں دیکھئے دل میں آکر
چشم خون بار تو اک منظر بیرونی ہے

گھر سے نکلے وہ مرے بعد تو بولے افسوس
وہی کم بخت نہیں ہے تو گلی سُونی ہے

ڈھل کے سانچے میں نکلتا ہے مرا ہر مصرع
ذہن میں جب سے قدِ یار کی موزونی ہے

جھجک ہوتی ہے سب پہلے پہل کی
قدم اٹھا تو پھر منزل ہی منزل

گردشِ چرخ سے ہے گردشِ قسمت کا یہ حال
پاؤں ٹکنے کہیں پایا بھی تو چکر آیا

وہ پوچھتے ہیں باعث افسردہ خاطری
ہم کیا بتائیں کون تغافل شعار تھا

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للّٰہ چلے جائیے میخانے سے

ہاتھ رکھ کر جو وہ پوچھیں دلِ بے تاب کا حال
ہو بھی آرام تو کہہ دوں، ابھی آرام نہیں

جھوٹا ہی سہی کرو تو وعدہ
یک رنگیٔ غم بڑی بلا ہے

للّٰہ یہ تو آپ کسی دن بتائیے
کے روز اور وعدۂ فردا کے رہ گئے

دھڑکا دل اس قدر کہ زباں بند ہو گئی
مشتاق وہ بھی عرضِ تمنا کے رہ گئے

روحِ انتخاب

آج کل مورخ آرنالڈ ٹائن بی کا نام زبان زد خاص و عام ہے اس کی شہرت کی وجہ اس کی معرکۃ الآرا تصنیف مطالعۂ تاریخ ہے۔ (جو دس ضخیم جلدوں میں کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے جس میں اس نے امم سابقہ اور گذشتہ تہذیبوں کے عروج و زوال پر بحث کرتے ہوئے اپنا فلسفہ تاریخ پیش کیا ہے اس کی کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے مورخ کے وسیع مطالعہ کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے اور آدمی اس کی محنت اور جانکاہی پر عش عش کر اٹھتا ہے۔

مجھے آنحضرت صلعم پر مستشرقین یورپ کے بے سند اور نازیبا حملوں کے سلسلہ تحقیق کے دوران خیال گزرا کہ ٹائن بی جس کی علمیت آج کل مسلم تصور کی جاتی ہے اور جس کے چند ایک حالیہ بیانات سے اس کی غیر جانبداری مترشح ہوتی ہے اس کی تصانیف پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالوں اور دیکھوں کہ آیا وہ کہاں تک تاریخی حقائق سے کام لیتا ہے اور کہاں تک اس کی روش آنحضرت کے بارے میں دیگر متعصب مستشرقین سے مختلف ہے، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس نے کسی عربی ماخذ سیرۃ رسول اللہ سے براہ راست کوئی استفادہ نہیں کیا محض مارگولیتھ کی ایک کتاب "محمڈنزم" کا دو تین جگہ دور از کار حوالہ دیا ہے اور اس عدم تحقیق و تفحص کے باوجود اس نے متعصب مسیحی مورخین اور کذاب پادریوں سے کبھی کچھ بڑھ چڑھ کر آنحضرت صلعم کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔

ٹائن بی اپنی دوسری تصنیف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"پیغمبر محمد (صلعم) مکہ میں بارہ سال بہت ایمانداری سے اپنے ضیم تبلیغی مشن کو چلاتے رہے جس میں ان کو بہت زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن چند ہی اشخاص کو مسلمان بنا سکے، بعد ازاں انھوں نے مکہ سے مدینہ جانے کے لالچ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔" (نقل کفر کفر نہ باشد)

اگر ٹائن بی کی نظر میں ریورینڈ مارگولیتھ ہی ایک واحد ہستی ایسی ہے جس کی تصانیف بطور استشہاد سیرۃ رسول اللہ کے سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں تو اس کی رسوائے عالم کتاب "محمد اور عروج اسلام" (Mohamed and Rise of Islam) کا ہی حوالہ دیا جاتا کیوں کہ اس نے کم از کم اس میں اصلی عربی ماخذوں سے تو کام لیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس نے شدید تعصب اور بددیانتی سے کام لے کر رسول اللہ صلعم کی سیرۃ مبارکہ پر نہایت بیہودہ حملے کئے ہیں جن سے بلبلا کر ایک مسلمان تو در کنار ایک عیسائی مورخ بھی یہ کہنے سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکا کہ مارگولیتھ کے بیان میں "طرح طرح کے تعصبات نے رنگ آمیزی بھی کر دی ہے"۔

["Also one, coloured by various prejudices" History of Religions Vol II P.530 (2nd Impression — By George Foot Moore, (Edinburgh — 1948)

بایں ہمہ اسی بدنام کتاب میں مار گولیتھ صفحہ ۲۶۳ پر لکھتا ہے " لیکن محمد (صلعم) نے اپنے جرنیل، مقنن، قاضی اور سیاستداں کے فرائض بجالاتے وقت اپنے تبلیغی اور تعلیمی مشن کو نظر انداز نہیں کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں :-

But amid all the duties of general, legislator, judge and diplomatist, the Prophet did not neglect those of preacher and teacher

"کیا دشمن اسلام مار گولیتھ جیسے شخص کی شہادت اس بات کی کھلی دلیل نہیں ہے کہ ٹائن بی کا نظریہ کہ آنحضرتؐ نے مدینہ پہنچکر دعوت رشد وہدایت کو خیرباد کہہ دیا اور طاقت کے بل بوتے پر مکہ پر اسلام مسلط کر دیا ایک نہایت ہی مکروہ اور ناپسندیدہ تعصب کی غمازی نہیں کر رہا ہے اور اس کا غیر جانبداری کا دعویٰ محض فریب نہیں ہے ؟"

ٹائن بی نے آنحضرت صلعم پر ایک عرب قیصر ہونے کا بھی الزام لگایا ہے اس سلسلے میں ریورنڈ باسورتھ سمتھ کا مشہور مقولہ بیان کر دینا کافی ہوگا۔ آنحضرتؐ پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں :-

"وہ ریاست اور مذہب کے سربراہ تھے، وہ بیک وقت قیصر اور پوپ دونوں تھے لیکن نہ ان میں پوپ کی جھوٹی شیخیتیں تھیں نہ قیصر کے جیوش وعساکر ان کے پاس تھے۔ نہ کوئی حراس یا پاسبانوں کا گروہ۔ نہ کوئی محل تھا اور نہ کوئی مقررہ آمدنی تھی اگر کبھی کسی انسان کو حکومت کرنے کا "خدائی حق" نصیب ہوا، تو وہ محمد (صلعم) تھے کیوں کہ اگرچہ ان کو اقتدار حاصل تھا مگر اس کی سب ظاہری اشکال اور مادی سہارے مفقود تھے۔"

ٹائن بی نے آنحضرتؐ کی پیغمبرانہ شان کو ملوث کرنے میں بھی نہایت دیدہ دہنی سے کام لیا ہے اس سلسلے میں میجر اے لیونارڈ کے غیر متعصبانہ تاثر کو بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں وہ لکھتے ہیں " اگر کبھی انسان نے اس کرۂ ارضی پر خدا کو پایا ہے اگر کبھی کسی انسان نے اپنی زندگی خدا کے لئے ایک اچھے اور پاکیزہ جذبے کے تحت وقف کی ہے تو یقینی طور پر وہ انسان پیغمبر عربی ہیں۔"

(ISLAM: HER MORAL + SPRITUAL VALUE لندن ۱۹۰۹ء ص ۱۸)

حقیقت میں گوئٹے سے کارلائل تک ایسے فرنگی ارباب فکر وقلم کی تعداد اب دہائیوں سے متجاوز ہے جنھوں نے گہرے غور وتحقیق کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والاصفات پر مدح وثنا کے موتی نچھاور کئے یا حیرت زدہ شاہدین کی طرح بے اختیار تحسین کے نعرے لگائے ہیں۔ ٹائن بی کے بعض نامور ہم وطن جیسے لارڈ ہیڈلی، سر آئن ہیملٹن، مارم ڈیوک پکتھال ڈاکٹر کرینکو وغیرہم حضورؐ کی رسالت پر ایمان لائے اور آپؐ کے حلقہ بگوش ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن ان کثیر شواہد کے انبار سے میں ایک اور بیان کے چند فقرات نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، جو ٹائن بی کے ایک ہم چشم فرانسیسی مورخ کی قریب زمانے کی کتاب Histoire de la Turquie تاریخ ترکیہ (جلد اول، ص ۲۷۶ بعد) میں آیا اور اس کا انگریزی اور غالباً اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ بالقابہ نے بھی اپنی تازہ فرانسیسی کتاب "سیرت پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی دوسری جلد میں اسے پورا نقل کر دینا ضروری خیال کیا (Le Prophete de l'ISLAM ۲، ص ۶۸۸) میں نے اصل کتاب سے مقابلہ کرکے یہ اقتباس لئے ہیں :-

"دنیا میں کسی انسان نے محمدؐ کے نصب العین سے بلند تر نصب العین اپنے سامنے کبھی نہیں رکھا۔ یہ عظیم مافوق البشر

نصب العین کیا تھا؟ خدا اور بندے کے درمیان سے توہمات کے پردے اٹھانا، خدا کو انسان کے قلب میں رچا دینا، خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا، اور صدہا باطل خداؤں کی بجائے واحد خدا کا منزہ اور مقدس تصور پیش کرنا۔ کبھی کسی انسان نے اتنے بڑے کام کا بیڑا نہیں اٹھایا، جس کے وسائل و ذرائع اتنے محدود ہوں اور مقصد اتنا دشوار اور اس کی قدرت سے باہر ہو۔۔۔ نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور پھر نتائج ایسے درخشاں حاصل کرنا، اگر یہ کسی انسان کی غیر معمولی قابلیت کا معیار ہیں تو کون ہے جو اس میدان میں محمد ؐ کے مقابلے میں کسی دوسرے انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟۔۔۔۔۔ اس نے تمام جھوٹے خداؤں کی عبادت گاہوں کو ڈھا دیا، ایک تہائی دنیا میں آگ لگا دی۔ اس کی پاک زندگی، عبادات، اس کی توہم پرستی کے خلاف مسلسل جنگ، مکی دور میں طرح طرح کے مصائب کا حیرت انگیز استقلال اور صبر سے مقابلہ کرنا، پھر اس کی ہجرت اور دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت، خدا کی راہ میں غیر منقطع جہاد کسی سلطنت سازی کے لئے نہیں بلکہ خالص خدائی مقاصد کی کامیابی کے واسطے۔۔۔۔ اس کی شبانہ روز کی نمازیں، دعائیں، اپنے معبود سے راز و نیاز کی باتیں، اس کی حیات، اس کی رحلت اور بعد وفات اس کی مقبولیت یہ تمام حقائق کس قسم کی سیرت کی گواہی دیتے ہیں۔۔۔۔ اتنا عظیم مفکر، مقنن، خطیب، سپہ سالار (نہ صرف اجسام بلکہ) اذہان و قلوب پر غلبہ پانے والا، صحیح نظریہ حیات کو علی وجہ البصیرت قائم کرنے والا۔۔۔۔ بہت سی دنیاوی سلطنتیں اور ان سب پر آسمانی بادشاہی کا بانی۔ یہ ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان تمام معیاروں کو اپنے ساتھ لاؤ جس سے انسان کی عظمت اور بلندی کو ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بتاؤ کہ کیا دنیا میں اس سے بزرگ اور کوئی انسان کبھی ہوا ہے؟"

(ظفر علی قریشی (ایم اے))

نظامِ تبلیغ واشاعت

تبلیغ دین اور اصلاح وعقائد و اعمال کا احساس کرتے ہوئے سرگودھا شہر میں "نظامِ تبلیغ و اشاعت" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس میں ملک کے مشہور و معروف خطیب حضرت مولانا گلزار احمد صاحب مہتمم جامعہ قاسم العلوم سرگودھا اور خطیب اہل سنت حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب گجراتی سابق ایڈیٹر "الفاروق" اپنے قیمتی اوقات عطا فرما رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر علماء بھی اس ادارہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ جملہ اہل اسلام جو اپنے ہاں دین اسلام کی اشاعت کے خواہشمند ہیں اور اس فریضہ کو پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس ادارہ سے مکمل تعاون حاصل کرنے کے لئے توجہ کریں۔

(نوٹ) "نظامِ تبلیغ و اشاعت" سے وقت لینے کے لئے ایک ماہ پہلے اطلاع دیجئے تاکہ مختلف اضلاع کے دوستوں کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

حافظ گل حسین ناظم "نظامِ تبلیغ و اشاعت" ۱۹۶/۸ سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

مطالعہ کی میز پر
نعیم صدیقی

سحر کا انتظار تھا
سحر کا انتظار ہے!

ناول ـــــــ ابوالخطیب

جس شخص نے کلیجہ چھلنی کر دینے والے احساسات کے تلخ گھونٹ حلق سے نہ اتارے ہوں اور جس نے اپنے دور کی زندگی کے کرب و اندوہ کا براہ راست تجربہ نہ کیا ہو مشکل ہے کہ وہ دنیائے ادب میں کوئی قابل قدر کارنامہ باقی چھوڑ سکے اور مشکل تر ہے کہ اس کے قلم سے کوئی اچھا ناول وجود پا سکے۔

میں ابوالخطیب کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور اس کے بارے میں یہ اعتماد رکھتا ہوں کہ وہ برسوں سے اپنی سانسوں کے ساغر اس کالے، کسیلے گاڑھے اور جگر گداز مشروب سے بھر بھر کے پیتا رہا ہے جو صدہا روزمرہ حوادث و تجربات کے خوشوں سے ٹپکنے والے رس سے تیار ہوتا ہے اور یہ خوشے معاشرے کے تاکستانوں میں وقت کی لمبی لمبی گھنی بیلوں کا گویا ماحصل ہیں!

ابوالخطیب کو میری نگاہوں میں ایک غیر معمولی پایۂ اعتبار اس لئے حاصل ہے کہ اس کے پیکر میں، انسان زندہ ہے ـــ وہ انسان جو ہمارے معاشرے میں تیزی سے مر رہا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے چاروں طرف لاشیں پھیلی ہوں، سڑ رہی ہوں، تعفن پھیل رہا ہو، اور ان لاشوں پر گدھ منڈلا رہے ہوں ـــ اور یہ گدھ بھی مسخ شدہ انسان ہی ہوں، انہی مرنے والوں کی ارواح آوارہ! انسان انسان کو کھا رہا ہے!

تو ابوالخطیب کا انسان زندہ ہے اور محض زندہ ہی نہیں، ماحول سے لڑ رہا ہے ـــ اس وبا سے، اس اخلاقی موت سے ـــ لڑ رہا ہے جو انسانوں کو کھائے جا رہی ہے۔

اسی ابوالخطیب کا ناول سامنے آیا۔ "سحر کا انتظار تھا، سحر کا انتظار ہے!" ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا ناشتے کے بعد سے کر قبیل دوپہر کی کسی ساعت تک! تنقیدی نظر سے نہیں پڑھا بلکہ ایک عام قاری کے سے شوقِ بے تابانہ کے ساتھ!

اس ناول کے متعلق یہ جان کر بڑا صدمہ ہوا کہ لاہور کے دو ممتاز ادبی جرائد نے اس پر اپنے ہاں تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس نظریاتی تعصب سے آگاہ ہونے کے بعد بے اختیار جی چاہا کہ اس ناول پر اپنی رائے لکھوں، اگرچہ میں اپنا کوئی ادبی جریدہ نہیں رکھتا جس میں اسے شائع کر کے سمجھوں کہ ایک فرض ادا ہوا۔ اب یہی ممکن ہے کہ میری یہ سطریں　　مصنف تک پہنچ جائیں۔

اس ناول میں نہ نفسیاتی تجزیہ کاری کا کوئی غیر معمولی مظاہرہ ہے، نہ فلسفیانہ غواصیوں سے سابقہ پڑتا ہے، نہ سیاسی پروپگنڈے کے کوئی آثار اس میں ملتے ہیں، سیدھی سادی ایک کہانی ہے جس کا موضوع "عام آدمی" ہے جو ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے یہ ایک جھگی ـــ یا صدہا جھگیوں کی کہانی ہے، صدہا جھگیاں سمٹ کر ایک جھگی بن گئی ہے، یہ چھوٹی سی جھگی اتنی وسیع ہے کہ اس کا ایک سرا بھارت میں یو۔ پی کے قصبہ فیض پور تک

پہونچتا ہے اور دوسرا سرا شہید آباد (کراچی) میں واقع ہے، اس جھگی کا ایک گوشہ مسجد سے جڑتا ہے اور دوسرا گوشہ معصیت سے!

ناول پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ جیسے یہ جھگی ایک زندہ وجود ہے، ایک عورت ہے۔ ایک عورت جو پہلے پردۂ حیا میں مستور رہتی، چلمن اور پھر نقاب میں سے جھانکنے لگتی ہے، پھر چلمن بوسیدہ ہو کر ختم ہو جاتی ہے اور نقاب آندھی میں اڑ جاتی ہے، پھر اس کا بدن لباس سے محروم ہو جاتا ہے اور وہ چوراہے پر عریاں دکھائی دیتی ہے اور بالآخر ہوس کی ماری نگاہیں اس کا گوشت بھی ریزہ ریزہ نوچ کر کھانے لگتی ہیں۔

یہ جھگی جھگی نہیں، غلاظت کے طوفان میں ایک کشتی معلوم ہوتی ہے، کھیون ہار اسے کھیتے ہیں مگر آخر ان کی قوت بازو ہار مان لیتی ہے، موجیں اس کے اوپر سے اچھل اچھل جاتی ہیں، پانی اس کے اندر گھسنے لگتا ہے، اس کے تختے چرچرانے لگتے ہیں، اس کے بادبانوں میں دامنِ عاشق کی طرح چاک آ جاتے ہیں، پھر یہ کشتی ڈوبنے لگتی ہے ـــــ گویا ساری انسانیت ڈوب رہی ہو، مگر ڈوبتے ڈوبتے اس کشتی کا پیندا ایک دھکے سے زمین سے لگ جاتا ہے ـــ

اس ناول میں ہمارے سماج کے کتنے ہی زخم دکھائے گئے ہیں، یہ زخم زبان رکھتے ہیں اور ابوالخطیب کے ناول میں ہم ان زخموں کی زبانی زندگی کی کہانی سنتے ہیں۔

اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد مہاجرین کی آمد سے کتنی بڑی اخلاقی آزمائش پیدا ہو گئی ـــــ پہلے کے لوگوں کے لئے بھی اور نئے آنے والوں کے لئے بھی ـــ اس آزمائش کی کسوٹی پر شرافت کے ڈھیروں سکّے اپنی سنہری تابانی کے باوجود کھوٹے ہو کے رہ گئے۔

پھر یہ ناول مشترک خاندانی نظام کی خوفناک تاریکیوں کو سامنے لاتا ہے ـــــ ساس بہوؤں اور نندوں کے گھٹیے جذبوں کا مہلک تصادم، اس سے پیدا ہونے والے انسانیت کش نتائج ـــــ اور پھر یہ عبرتناک حالت کہ ہندوؤں سے مستعار لئے ہوئے اس نظام کو ہمارے ہاں خدائی دین کا جزو لاینفک قرار دے کر لوگوں نے دانتوں سے پکڑ رکھا ہے۔ پھر یہ ناول ہمیں ان مشکلات سے آگاہ کرتا ہے جو معاشرے نے نکاح کے راستے میں حائل کر دی ہیں اور دوسری طرف ان سہولتوں کو دکھاتا ہے جو بدکاری کے لئے اس نے فراہم کر دی ہیں۔ کس طرح محلوں میں بدکاری کے اڈے کھل رہے ہیں اور کس طرح بردہ فروشوں نے عورتوں کو شکار کر کے گناہ کی منڈی میں لا بیچنے کے کاروبار چلا رکھے ہیں۔

اس ناول کے پردے پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کس بری طرح معیشت کی چکی میں پس رہی ہے ـــــ انسان کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت، اپنی ساری قوت اور اپنی ساری سوچ بچار اسی ایک ادنیٰ ترین مسئلے پر صرف کر دے۔ یہاں تک کہ اس سے آگے اعلیٰ تر ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے کوئی موقع باقی نہ رہے۔ غریب طبقے کے شرفا ساری عمر بے روزگاری کی چڑیل سے لڑتے رہیں، درمیانہ طبقہ کے لوگ زندگی کے وسیع تقاضوں اور اپنی کم آمدنی کے درمیان کی خلیج پاٹنے میں جانیں کھپا دیں اور سلاخ ہر لحہ آگے بڑھتے ہوئے معیارِ زندگی کی تمام راہیں جو ظلم کی وادی سے ہو کر نکلتی ہیں اور خدا پرست، مذہب پرست، شرافت کیش آدمی کے لئے سوائے فاقہ کشی کے کوئی راستہ نہیں رہا ـــــ الا ماشاء اللہ ـــ فاقہ کشی بھی تنہا نہیں آتی، بلکہ خاندانی روایات، شرافت کی قدروں اور عزت کی متاع کے لئے بربادی کا پیغام بھی ساتھ لاتی ہے۔ یہ تلخ حقیقتیں ابوالخطیب کے ناولوں کے کردار قاری کے سامنے بے نقاب کرتے جاتے ہیں۔

یہ ناول ایک پیغام کا امانت دار بھی ہے ـــــ کیونکہ اس میں خیر و شر کی قوتوں کا تصادم دکھایا گیا ہے ـــ سیاسی دائرے میں نہیں روزمرہ کی سماجی اور عوامی زندگی کے دائرے میں ـــ خیر و شر کی یہ کشمکش جو پورے ناول میں پھیلی ہوئی ہے، اس کا سب سے بڑا معرکہ کلثوم نامی کردار کی شخصیت کے اندر لڑا جاتا ہے۔ اور فی الحقیقت یہ معرکہ آج بے شمار شخصیتوں کے سینوں میں لڑا جا رہا ہے، ان میں سے بہت کم

اس معرکے میں کھیت رہیں، بہت سی زخمی ہو کر خاک و خون میں تڑپ رہی ہیں اور ایک خاصی تعداد ایسی ہے جو ابھی سماج کے دائرے میں بھی اور اپنی دنیائے دل میں بھی جنگ آزما ہے۔ یہی تعداد ہمارا کل سرمایہ ہے ـــــ اسی کا نام پاکستان ہے۔ ان میں کتنی ہی ہیں جو زخم کھاتے اور بے دم ہو کر گرتے ہیں مگر پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جیسے کہ کلثوم گرتی ہے اور پھر اٹھتی ہے۔

اس ناول کی جان ظہور کا کردار ہے جو خیر و شر کی کشمکش کے دوران میں عین اس لمحے جبکہ کلثوم کی زندگی کے میدان کارزار میں بدی میں اپنی آخری فتح کا علم نصب کرنے کے قریب ہوتی ہے۔ شر کے محاذ سے ابھر کر ضمیر کی ایک کروٹ کے زیر اثر خیر کی حمایت پر آجاتا ہے، وہ اپنی سیاہ زندگی کا کفارہ دینے کے لئے ہمدردی و ایثار کی ایک قندیل روشن کرتا ہے، وہ معاشرہ جس میں کلثوم کو ایک ایک فرد بھوکا بھیڑیا معلوم ہوتا ہے اس کی خوفناک تاریکی میں ظہور کی مشعل بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے ـــــ مگر ایک مشعل سے سحر تو نہیں ہو سکتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اس ناول میں ابوالخطیب نے زیادہ سے زیادہ ایک مشعل روشن کرنے والا کردار ہی ہمارے معاشرے کو پیش کیا ہے، سحر پیدا کرنے والا سورج بنانے اور خورشید کا سامان سفر تازہ کرنے والا کوئی کردار اس میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس ناول میں کوئی ایسی موج ابھری ہی نہیں جو ساحل توڑنے والی ہو۔ شاید ابوالخطیب کے سامنے کسی دوسرے ناول کا خاکہ ہو جو اس ناول کی کمی کو پورا کر دے یوں یہ ناول اس طرح کے غیر معمولی کردار کو اپنے اندر کھپا بھی نہیں سکتا، کیونکہ یہ عوامی زندگی کا ترجمان ہے۔

ابوالخطیب کی کہانی کے پلاٹ میں ٹھہراؤ بہت زیادہ ہے، بہت دیر تک واقعات کی موجیں ہلکی ہلکی اٹھتی ہیں، نصف حصے کے بعد ذرا تند لہریں اٹھتی ہیں ـــــ تاآنکہ ناول اپنے نقطۂ نصف النہار پر جا پہونچتا ہے۔ مگر نقطۂ نصف النہار پر جہاں کہانی ختم ہوتی ہے، قاری اس جگہ جا کھڑا ہوتا ہے جہاں آگے تاریکی ہی تاریکی ہے۔ کلثوم گھر سے چلی گئی، جبری گناہ کے خارزاروں سے گزری، پھر واپس آ گئی۔ محض واپس آ جانا کیا بات ہوئی۔ اس کی واپسی میں آگے کے لئے مثبت جذبہ نہیں، کسی مستقبل کا کوئی اشارہ نہیں، کسی عزم کا تصور نہیں، اگر ساری لڑائی کا انجام یہی کچھ ہونا تھا تو سرے سے لڑنا ہی کیا ضرور! ـــــ اور بھگوت گیتا کا افتتاحی اقتباس بھی معرکہ آرائی سے بچنے کا درس دیتا ہے۔

ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ناول میں جنسیت پر جو کچھ مواد دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر کہاں تک ٹھیک ہے۔ پہلی بات میرے سامنے یہ آئی کہ اصولاً ادبی نگارشات ـــــ خصوصاً ناول ـــــ میں جنسی مسائل پر بحث ہونی ہی چاہئے۔ پھر میری توجہ اس طرف گئی کہ کیا یہ ناول اپنے جنسیاتی جز کے لحاظ سے ایسا ہے کہ نچلے متوسط اور بالائی غریب طبقوں کی مستورات کے ہاتھ میں دیا جائے ـــــ

مثلاً کیا ناول کی ہیروئن کلثوم یا اس کی حریف مریم کو اس کا مطالعہ کرایا جانا چاہیئے تھا؟ میرا اولین جواب نفی میں تھا۔ دوسرا جواب یہ سامنے آیا کہ معاشرہ جس میں گندگی ہر طرف پھیل چکی ہے اور اخباروں، رسالوں، اشتہاروں اور سڑکوں کے مناظر، ریڈیو کے گانوں اور فلموں کے ذریعے ہر بچے اور ہر بچی تک پہنچ رہی ہے، شاید یہ مناسب ہو کہ جنسی چھلاووں کے پیچھے کی تاریکیوں سے نئی نسل کو باخبر کر دیا جائے تاکہ وہ اگر کسی جال میں پھنس جائے تو مقابلہ کر سکے۔ مگر پھر غور کرنے پر آخری نقطۂ نظر یہ قائم ہوا کہ ناول میں جنسی دائرے کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے مصنف کا قلم اعتدال و احتیاط کی حدوں سے آگے نکل گیا ہے۔ متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں جنسی استلذاذ کے لئے انداز بیان میں غیر شعوری کی دعوت پنہاں ہے اور حقیقت کے پیچھے چلتے چلتے مصنف قاری کو واقفیت کے ایسے دائرے تک لے جاتا ہے جہاں گناہ سے روکنے والی قوت حیا کمزور ہو جاتی ہے۔ گناہ کا مشاہدہ و مطالعہ اور گناہ کا تفصیلی علم اس روک کی قوت کو گھٹا دیتا ہے۔ موجودہ حالت میں میرا خیال تھا کہ یہ ناول شریف گھروں کی مستورات تک نہ جانا چاہئے ـــــ بلکہ کچے نوجوان اور طلبہ کے لئے بھی مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مصنف آئندہ اشاعت کیلئے

نظرثانی کرتے ہوئے ایسے تمام مقامات کو بدل دیں۔

ایک مسئلہ زبان کا ہے۔ناول اور تمام ادبی نگارشات کی قدروقیمت صحت زبان سے بنتی ہے۔اس ناول میں زبان کے لحاظ سے کمزوری رہ گئی ہے۔دوچار جگہ کی لغزشِ قلم کو تو نظرانداز کیا جاسکتا ہے، مگر یہاں معاملہ نظرانداز کئے جانے کی حد سے بہت آگے چلا گیا ہے۔اس کمزوری کو بھی دوسرے ایڈیشن میں دوہرایا نہ جانا چاہئے۔

ان ساری باتوں کے بعد میں یہ کہوں گا کہ یہ ناول اپنی چند کمزوریوں کے باوجود اس خلوص کی وجہ سے جو اس کی روح ہے، اس مطالعۂ حقیقت کی وجہ سے جس پر اس کی اساس ہے اور اس پیغام کی وجہ سے جو اس کے اندر مخفی ہے، اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے ؛

ہماری نظر میں

عظمتِ رفتہ از:- ضیاء الدین احمد برنی (بی۔اے) ضخامت ۵۲۶ صفحات، خوشنما ٹائپ، مجلد، رنگین سرورق، قیمت:- دس روپے۔ ملنے کا پتہ:- کراچی اُردو اکیڈمی سندھ، بندر روڈ کراچی۔

جناب ضیاء الدین احمد برنی اُردو دنیا کے جانے پہچانے قلم کار ہیں، موصوف متعدد کتابوں کے مُصنف، مولف اور مترجم ہیں، اُن کے لئے یہ فخر کیا کم ہے کہ اب سے ۴۲ سال پہلے اخبار "ہمدرد" میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت اور ہم نشینی کا انھیں فخر حاصل رہا ہے!

ضیاء الدین احمد برنی کو انگریزی دور کے متحدہ ہندوستان کی عظیم شخصیتوں کو دیکھنے، ملنے جلنے اور اُن سے خط و کتابت کرنے کے مواقع میسر آئے ہیں، مسٹر سی ایف اینڈریوز جیسے مشہور فاضل شخص برنی صاحب کے اُستاد رہے ہیں، مسٹر آصف علی مرحوم (سابق گورنر آسام) اُن کے کالج کے ساتھی اور مولانا محمد علی صحافت میں اُن کے معلم اور رفیق کار تھے۔

اس کتاب میں پاک و ہند کے ترانوے (۹۳) مشاہیر پر ضیاء الدین احمد برنی کے تاثرات و مشاہدات "تذکرہ" کی صورت میں اُن کی تصاویر کے ساتھ ملتے ہیں، ان شخصیتوں میں تنوع کا یہ عالم ہے کہ لیڈر، علماء، اطباء، شعراء، اخبار نویس، گورنر، یہاں تک کہ گاما پہلوان اور "منکرین سنت" کے گورو گھنٹال مولوی عبداللہ چکڑالوی تک پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔

"عظمتِ رفتہ" کی زبان سلیس و رواں اور اسلوبِ نگارش تکلف و تصنع سے پاک ہے! کتاب شروع کرنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ بس ختم کر کے ہی دم لیجئے!

"عظمتِ رفتہ" کے ذریعہ پہلی بار اس کا علم ہوا کہ مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم شاعر بھی تھے اور "اسیر" تخلص کرتے تھے ——— بنارس ہندو یونیورسٹی کا آغاز سنٹرل ہندو کالج سے ہوا جس کو مسز اینی بسنٹ نے ۱۸۹۸ء میں قائم کیا اور ۱۹۱۳ء میں پنڈت مدن موہن مالوی کے حوالہ کر دیا ——— کرشن لال جھویری بمبئی کی عدالتِ خفیفہ کے چیف جسٹس تھے انھوں نے انگریزی میں "اخلاقِ محسنی" کی شرح لکھی اور "مطائباتِ سعدی"[1] کے ایک جزو کا اور "دیوانِ حافظ" کی دو سو غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا! اس قسم کے معلومات آفریں واقعات بلکہ "انکشافات" اس کتاب میں ملتے ہیں۔

سی ایف اینڈریوز کا ایک علمی لطیفہ:-

"ایک دن اینڈریوز نے ہماری جماعت کے تختۂ سیاہ پر یہ عبارت لکھوادی:-

Mr. Andrews will not take his classes today.

ایک لڑکے کو جو شرارت سوجھی تو اس نے "کلاسیز" کا ابتدائی حرف "سی" مٹا دیا دوسرے دن جب اینڈریوز جماعت میں آئے، تو انھوں نے بورڈ پر یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی:-

Mr. Andrews will not take his lasses today.

اینڈریوز نے کچھ نہیں کہا، بلکہ مسکراتے ہوئے بورڈ کی طرف بڑھے اور "لیسیز" کا ابتدائی حرف "ایل"

[1] کتاب میں "طیباتِ سعدی" چھپا ہے!

مٹادیا، اب یہ عبارت رہ گئی :-

Mr. Andreas will not take his asses today.

جماعت کے لڑکے اس لطیفہ سے بیحد لطف اندوز ہوئے"۔

مسز سروجنی نائیڈو کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے فاضل تذکرہ نویس نے میر کے ایک مصرعہ کا کتنا برمحل استعمال کیا ہے:-

"مسز نائیڈو اوائل عمر ہی سے دل کی مریض تھیں، ۱۹۲۰ء میں جب وہ انگلستان میں تھیں، ان کی حالت یکایک خراب ہو گئی تھی، اور ڈاکٹروں نے برملا کہہ دیا تھا کہ دل کی حالت خطرناک حد کو پہونچ چکی ہے، مگر اس کے باوجود وہ برابر کام کرتی رہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی ؎

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

سید فضل شاہ مرحوم کے "کردار" پر ان دو تین سطروں میں کتنی ادبیت اور واقعیت پائی جاتی ہے:-

"بمبئی جیسے شہر میں اتنے عرصہ تک رہنے کے باوجود وہ وہاں کی رنگینیوں سے کبھی لطف اندوز نہ ہوئے، وہ ساحل پر کھڑے تماشا دیکھتے تھے مگر خود ایکٹر نہ بنتے تھے"۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی زندگی کی ایک جھلک :-

"مولانا نے اپنے زمانے میں جتنی قلمی لڑائیاں لڑیں، ان کا کچھ حد و حساب نہیں، کبھی وہ خواجہ حسن نظامی سے اُلجھتے ہیں، تو کبھی مولانا محمد علی سے، کبھی سالک و مہر سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو کبھی آریہ سماجیوں سے، کبھی مرزا بشیر الدین محمود[a] سے برسرِ جنگ ہوتے ہیں، تو کبھی پنڈت مدن موہن مالویہ سے، کبھی کانگریس سے جھگڑتے ہیں تو کبھی احرار سے ! ۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ اپنے دور کی ایک مشہور ہستی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے تا زندگی وفادار رہے۔ ۔ ۔"

محمد رفیع کاشمیری کے تذکرہ میں، برنی صاحب لکھتے ہیں :-

"انھوں نے اپنی پنج سالہ فلمی زندگی میں متعدد تصویریں بنائیں وہ فلمی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے خوب واقف تھے، وہ ان سیاکاریوں سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے جو پس پردہ ہوا کرتی ہیں، میں نے جب ان سے پوچھا کہ آیا شریف خواتین کو فلمی زندگی اختیار کرنی چاہیے یا نہیں، انھوں نے ہمیشہ نفی میں جواب دیا، وہ کہا کرتے تھے کہ "مجھے موقعہ نہیں ملتا ورنہ میں اخبارات میں مضامین لکھ کر شریف اور عصمت مآب عورتوں کو اس لائن میں آنے سے قطعاً روک دوں۔ ۔ ۔"

علامہ اقبال کا ایک لطیفہ :-

"۔ ۔ ۔ ۔ دورانِ گفتگو میں عطیہ بیگم نے کہا "اقبال ! یاد رکھو بچہ کے لئے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر پوچھا :" اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے" عطیہ بیگم نے جھڑک کر انہیں خاموش کر دیا ۔"

لارڈ لائڈ بمبئی کے مشہور گورنر گزرے ہیں "سکھر کا عظیم الشان بند انہی کے زمانۂ حکومت کی یادگار ہے" ایک مسلمان وزیر نے

[a] مرزا بشیر الدین محمود اور انکے باپ (نبی کاذب) کی تردید میں مولانا ظفر علیخاں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے لئے نجات کا پروانہ اور مغفرت کی سند ہے (م - ق)

پونا میں انہی لائڈ صاحب کی دعوت کی، اس دعوت میں شراب کا بھی انتظام تھا، مگر :-

"لارڈ لائڈ نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ میں مسلمان کے گھر میں شراب نہیں پیوں گا"۔

پاکستان کے "قصر نشینوں" کے لئے درسِ عبرت !!

"والد اپنے عقائد میں بیحد سخت تھے، انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی، جو اُن کے عقائد کے خلاف ہو، یا جو خلاف اخلاق یا سوقیانہ ہو، ایک مرتبہ انھوں نے آدھی کتاب لکھ کر واپس کر دی، یہ کہہ کر کہ وہ اُن کے عقائد کے خلاف ہے، لکھے ہوئے حصہ کی اجرت بھی انھوں نے نہیں لی"۔

جناب ضیاء الدین احمد برنی کے والد منشی محمد الدین مشہور خطاط تھے، یہ ایک کاتب اور خوشنویس کے دینی احساسات کا عالم ہے، ورنہ آج کل کے ناشرین اور کتب فروش کتابوں کے چھاپنے اور بیچنے میں کسی اصول و مسلک کا لحاظ نہیں رکھتے، وہ تو بس پیسہ کمانا جانتے ہیں، چاہے وہ قرآن و سنّت کی تردید اور اسلام کی تضحیک کرنے والی کتابوں کے ذریعہ ہی حاصل ہو۔

دُوسرا رُخ :-

...... الغرض وقت کے وقت جو مسئلہ سامنے آجاتا اس پر بے دھڑک اپنے مخصوص مجذوبانہ انداز میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے (صفحہ ۳) "مجذوبانہ" لکھنا چاہیئے تھا۔ "خواہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اُن کی نظروں میں مطلق نہ سماتا تھا (ص ۳) "نہ جچتا تھا" لکھتے تو اس مفہوم کی بہتر ترجمانی ہوتی — "ایک دہلی کیا سارا ہندوستان مولوی صاحب کے شاگردوں سے پٹا پڑا ہے"۔ (ص ۵) مولوی محمد اسحٰق رامپوری کے شاگردوں کی تعداد میں خاصے مبالغے سے کام لیا گیا ہے ——— "مولوی محمد ایوب جو اپنی خداداد لسانی اور فصیح البیانی کی وجہ سے دہلی اور کراچی میں خاص شہرت کے مالک ہیں"۔ (ص ۶) مولانا محمد ایوب صاحب "لسان" نہیں ہیں، بلکہ خوش بیان متکلم ہیں، اور اُن کی شہرت کا سبب اُن کی فصاحت نہیں بلکہ حکیمانہ دینی بصیرت اور استدلالی انداز ہے۔ برنی صاحب "لسانی" "صمیمانہ" "قبیل" اور "صیانت" یہ چار لفظ جگہ جگہ لائے ہیں، اور بعض مقامات پر یہ الفاظ کھٹکتے ہیں۔

تعویذ گنڈوں، فتیلوں وغیرہ کے قائل نہ تھے" (ص ۱۸) صحیح لفظ "فتیلہ" ہے، مگر اردو روزمرہ "فلیتہ" ہے اس لئے "فتیلہ" میں تکلف پایا جاتا ہے — "پریمی، واحدی، غزالی، خواجہ پرشاد سب انہی (خواجہ حسن نظامی) کے دیئے ہوئے لقب ہیں (ص ۲۲) ممکن ہے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ہندو لڑکے (ارجن کمار) کا "نسیم اسلامی" نام خواجہ حسن نظامی ہی نے رکھا ہو، مگر یہ نام ہے "لقب" نہیں ہے "غالباً ۱۹۲۷ء تھا جب کہ خواجہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، (ص ۲۳) برنی صاحب نے برسوں "ترجمہ" کا کام کیا ہے، اس لئے انکی نثر میں بھی کہیں کہیں "ترجمہ" کا انداز آجاتا ہے۔

"انھوں نے مسلمانوں کی بہت سی بیجا رسوم اور عادات کے خلاف جہاد کیا" (ص ۳۲) اس تعریف کا مصداق مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تو ہو سکتی ہے، خواجہ حسن نظامی مرحوم کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، مسلمانوں کی وہ رسوم جن میں شرک کی آمیزش تک پائی جاتی ہے، خواجہ صاحب اُن کے سب سے بڑے مُبلّغ تھے — "مگر اس ناتواں پیکر میں ایک صابر اور بے باک دل رکھتے تھے"۔ (ص ۳۳) مال، دولت اور شہرت کے معاملہ میں خواجہ حسن نظامی صابر و قانع نہیں بلکہ حریص تھے، اپنے بارے میں پروپیگنڈے کرنے کا فن اُن کی برابر شاید ہی کسی دوسرے کو آتا ہو — "مولوی حافظ نذیر احمد کی طرح"۔ (ص ۴۱) "نذیر احمد" مولوی کیا علامہ کہے جانے کے مستحق ہیں مگر "ڈپٹی" اُن کے نام کا جزو لاینفک بن گیا ہے ——— "مولانا محمد علی اپنے مخصوص اسلامی درد سے مجبور ہو کر چندہ

جمع کرنے میں مصروف تھے" (ص ۴۸) اسلامی ورد کا "مخصوص" ہونا عجیب سا لگتا ہے۔
"وہ داغ کے داماد تھے اور شاگرد بھی" (ص ۵۷) نواب سراج الدین احمد خاں سائل کو داغ کی حقیقی بیٹی نہیں بلکہ منہ بولی بیٹی بیاہی تھیں ———— "سائل زندگی بھر اردو کی خدمت میں منہمک رہے"۔ (ص ۵۷) یہ بات مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی جیسی شخصیتوں کے بارے میں البتہ کہی جاسکتی ہے ———— "بیماری سے پیشتر ان (مولوی ذکاء اللہ) کے ایک ہم جماعت خواجہ الطاف حسین حالی ان سے ملنے کے لئے پانی پت سے دہلی تشریف لائے" (ص ۱۰۱) انگریزی میں تو اس طرح (.. ome) بولتے اور لکھتے ہیں مگر اردو کے جملہ میں اس طرح "ایک" آجانے سے مولانا حالی کی شخصیت کتنی چھوٹی ہوجاتی ہے ———— "جس خاتون سے ان (ڈاکٹر سید سجاد دہلوی) کا نکاح ہوا، وہ ریاست کے چیف جسٹس ضیا یار جنگ کی دختر نیک اختر تھیں" (ص ۱۳۵) نواب ضیا یار جنگ مرحوم حیدر آباد دکن کی عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) کے رکن (جج) تھے۔ میر مجلس یعنی چیف جسٹس نہ تھے ———— "وہ (پروفیسر سید سجاد) طلباء سے آپ اور جناب عالی کر کے بات چیت کرتے تھے" (ص ۱۳۸) "آپ" تک تو خیر غنیمت ہے مگر ایک پروفیسر کا اپنے طلبا کو "جناب عالی" کہہ کر خطاب کرنا مضحکہ ہی سا لگتا ہے۔
———— "تقریباً بیس سال سے مولانا نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ وہ ہر سال حج کے لئے جائیں (ص ۱۹۲) یہ ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے۔
"محض بارہ برس کی عمر میں مدراس سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد..." (ص ۲۱۳) اردو میں ایسے موقعوں پر "محض" نہیں "صرف" بولتے ہیں ― "کان پور کی مسجد کا واقعہ ہائلہ تازہ تازہ ختم ہوا تھا" (ص ۲۶۷) واقعہ کا تازہ تازہ ختم ہونا وجدان کو کھٹکتا ہے۔
"ان دونوں کمیٹی کا ہر ممبر دیانت وصیانت کا پتلا تھا" (ص ۲۹۲) "صیانت" تو حفاظت پاسبانی اور نگہبانی کے معنی میں بولا جاتا ہے اس کا مفعول "مصئون" آتا ہے کسی کو "صیانت" کا پتلا کہنا، بے معنی بات ہے ———— "مگر شیخ صاحب کا زمانہ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا" (ص ۲۹۲) پروفیسر شیخ عبدالقادر کا بڑھاپا ہوگا اور برنی صاحب کی جوانی ۔ تو اب سے تقریباً پچاس سال پہلے زمانہ کو "خلفائے راشدین کا زمانہ" کہنا کتنی بیجا مبالغہ آرائی ہے ———— صفحہ ۳۱۶ پر ساغر نظامی کو "میرٹھی" لکھا ہے حالانکہ وہ علی گڑھی ہیں ———— "وہ بلبل ہزار داستان تھے" (ص ۳۵۷) مولانا سید سلیمان ندوی جیسے خاموش اور کم سخن شخص کو "بلبل ہزار داستان" کہنا واقعہ کی غلط ترجمانی ہے!

"..... نہ صرف یہ بلکہ حیدر آبادی بھی ان کے مخالف ہو گئے۔ جس کی وجہ غالباً ان کا یہ شعر تھا :

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں، ہندوستاں سے دور (ص ۴۰۸)

حیدر آباد دکن میں کوئی شک نہیں ملکی اور غیر ملکی کا تعصب پایا جاتا تھا، مگر وہاں کے لوگ فانی کے مخالف نہیں تھے، اور اس شعر میں فانی نے اس بات پر طنز کی ہے کہ یو۔ پی کے رہنے والوں کو "ہندوستانی" کہا جاتا تھا، حالانکہ دکن بھی ہندوستان ہی کا ایک حصہ تھا۔
فانی کے جو تین شعر برنی صاحب نے نقل کئے ہیں ان کا حیدر آباد دکن کے حالات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے! ان میں سے یہ دو شعر:

زمینِ شعر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ
مجھے اپنے وطن کی سی زمیں معلوم ہوتی ہے

اور ———— زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

فانی نے دکن میں آنے سے بہت پہلے، کہے تھے۔

اپنے والد کے زمانہ کے جن خوشنویسوں کے نام برنی صاحب نے لکھے ہیں، اُن میں حافظ امیر الدین پنجہ کش (صفحہ ۴۵۵) کا بھی تذکرہ ہے، دہلی کے مشہور خطاط جو "میر پنجہ کش" کے لقب سے مشہور تھے اور جن کو خطاطی میں "عمادِ ثانی" سمجھا جاتا تھا، وہ تو سنہ ستاون کے ہنگامہ میں پھانسی پاگئے! صفحہ ۴۵۶ پر "میاں نذیر حسین" کو "مولوی نذیر احمد محدث دہلوی" لکھا ہے ـــــــ "۔۔۔۔ انھوں نے (قائد اعظم) قیادت کی جن اعلیٰ صفات کا مظاہرہ کیا وہ محض "محیر العقول" ہیں (ص ۴۸۸) "وہ محض محیر العقول ہیں" عجیب انداز بیان ہے؟

"انگریزی کی مشہور مثل (simple living & high thinking) کا وہ پیکر مجسم تھے" (ص ۵۰۵) ـــــ حالانکہ مولوی عبد الحق بابائے اُردو کی زندگی کا بیشتر حصہ ترفہ اور راحت و آرام میں گزرا ہے، اُن کا سب سے بڑا "عیش" اچھا کھانا تھا ـــــ اورنگ آباد اور دکن میں مولوی عبد الحق امیروں کی طرح رہتے تھے۔

وفات پائی ہوئی شخصیتوں کا ذکر بھلائی کے ساتھ ہی کرنا چاہیے، اسی نظریہ کو ضیا الدین احمد برنی نے پیش نظر رکھا ہے اس لئے تمام "تذکروں" میں عموماً شخصیتوں کا روشن پہلو ہی پایا جاتا ہے، مگر یہ یک رُخی تصویر کشی ہے! شخصیتوں کے دوسرے پہلوؤں کو، بہ انداز رمز و اشارت" ہی سہی، سامنے ضرور لانا چاہیے! مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے اپنے اُستاد ڈپٹی نذیر احمد کی سیرت نگاری میں تصویر کے دونوں رُخ نمایاں کئے ہیں، اور لطف یہ کہ شائستگی اور ادب و سنجیدگی کی حدوں سے تجاوز نہیں کیا۔

خواجہ کمال الدین کے بارے میں برنی صاحب کا یہ لکھنا:-

> "اُن کی موت سے اسلام کا ایک زبردست شیدائی اور خدمت گزار ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوگیا" (ص ۴۷۹)

وسیع المشربی اور رواداری کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے! خواجہ کمال الدین مرزا غلام احمد قادیانی نبیٔ کاذب کو "نبی" تو نہیں مگر اپنا پیشوا اور اُمت کا مجدد سمجھتے تھے، یہ عقیدہ اپنی جگہ کھلی ہوئی بے دینی ہے! جھوٹے نبی کو، کوئی نبی مانے یا مجدد، بہرحال اس سے "نبوت کاذبہ" کی تحسین و تصدیق ہی ہوتی ہے اور یہ کفر ہے۔

اسی طرح مسز اینی بسنٹ کے بارے میں تذکرہ نگار نے لکھا ہے:-

> "جب وہ اپنے رب سے ملی ہوں گی، تو وہ اس خیال سے یقیناً مسرور ہوں گی کہ اُن کی ساری ارضی زندگی ذات پات کی قیود سے بالاتر ہو کر خالصتہً بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف ہوئی، ان کی زندگی درحقیقت، "افضل الاشغال، خدمت الناس" کی تفسیر تھی (ص ۸)

حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایک غیر مُسلم کا کوئی نیک عمل بھی آخرت میں اُس کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتا! برنی صاحب نے مسز اینی بسنٹ کے "رب سے ملنے" کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے، جیسے یہ گمراہ عورت اپنے وقت کی "رابعہ بصری" تھی!

اپنے والد کے حالات میں وہ لکھتے ہیں:-

> "اُجرت کے معاملہ میں والد بہت بے پروا واقع ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشخاص پر رقمیں رہ گئیں، غلاف کعبہ کی تیاری کی سعادت ہندوستان کے حصہ میں صرف ایک بار آئی، اور اس غلاف کعبہ پر قرآنی سورتیں والد نے لکھیں، والد نے چھ مہینے کی محنت شاقہ کے بعد غلاف کعبہ تیار کیا تھا، مگر انھیں اپنی محنت کا پھل نہ مل سکا۔ اس محنت کا معاوضہ

سعودی حکومت نے اسماعیل غزنوی کو دیا تھا جسے وہ ہضم کر گئے ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۲۶۱)

اپنے والد مرحوم کے معاملہ میں جب برنی صاحب نے ایک شخصیت کے کردار کی کمزوری پر پردہ نہیں ڈالا اور اُسے منظرِ عام پر لے آئے تو اسی طرح وہ دوسری شخصیتوں کی زندگی کے دونوں رُخ سامنے لاسکتے تھے، یا دوسرے رُخ کی طرف کم سے کم لطیف انداز میں اشارے تو کر سکتے تھے! حیرت ہے کہ عبداللہ چکڑالوی جیسے گمراہ شخص سے وہ ملتے ہیں، اور اُس کے مسلک ضلالت پر تنقید کرنے کی بجائے، تحسین آمیز الفاظ میں اُس کا ذکر فرماتے ہیں :-

"بہرحال مجھے خوشی ہے کہ میں نے کم سے کم ایک بانیٔ مذہب کی زیارت تو کرلی، مگر افسوس رہا کہ میں علامہ کی خدمت میں دوبارہ حاضر نہ ہو سکا۔" (ص ۳۴۱)

کمزوریاں انسانوں کی لکھی ہوئی کس کتاب میں نہیں ہوتیں، "عظمتِ رفتہ" ان تسامحات کے باوجود ایک دل چسپ کتاب ہے مشاہیر کی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ پاک و ہند کے تمدن و تہذیب اور سیاست و معاشرت کی مختصر تاریخ آپ ہی آپ مُدوّن ہوتی چلی گئی ہے، جناب ضیاء الدین برنی کے قلم کی متانت، سنجیدگی اور شائستگی خود اُن کے کردار کی ترجمان ہے۔

ہندوستانی مسلمان

از :- سید ابوالحسن علی ندوی، ضخامت ۲۲۴ صفحات، مجلد، رنگین سرورق، قیمت :- تین روپیہ پچاس نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنو۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا نام ہی اس کتاب کے "عظیم و مُفید" ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے، یہ کتاب مولانا موصوف کے مختلف مضامین پر مشتمل ہے، جن میں دلائل و براہین کے ساتھ اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے تمدن و تہذیب کی تشکیل اور ملک کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اُن کے دینی اور سیاسی کارنامے بھی عظیم الشان ہیں۔ اور اُن کے موجودہ مسائل و مشکلات کیا ہیں؟

"یہ بات صرف ناواقفیت تک محدود نہیں ہے، زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک پوری کی پوری قوم کی تہذیب و تاریخ، اس کے گزشتہ کارناموں اور ملک کے آزاد کرانے کی جدوجہد میں اس نے جو مرکزی اور اہم پارٹ ادا کیا ہے، اور اس راہ میں جو بیش بہا قربانیاں کی ہیں، اُن کو نظرانداز کرنے کا رجحان پیدا ہو چلا ہے، ہندوستان کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کی ایک منظم کوشش کی جارہی ہے کہ گویا مسلمانوں کا دور ایک پردیسی قوم کا سامراجی دور تھا، جو ہر طرح کی خوبی اور حُسن سے خالی تھا ۔ ۔ ۔ ۔"

۔ ۔ ۔ ۔ "لیکن یہاں تو پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا جارہا ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جارہا ہے، یا ان پر سیاہی پھیری جارہی ہے، اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا کیا جارہا ہے، جو صدیوں کو محیط ہے ۔"

ان سطروں میں کتنا معقول و منصفانہ مگر دردناک احتجاج پایا جاتا ہے!

اس کتاب کے جلی عنوانات یہ ہیں :-

ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کے اثرات۔ ــــــــ علماء ہند کے کارنامے ــــــــ ہندوستان کی باکمال اسلامی

شخصیتیں ——— عربی کے اثرات ہندوستانی زبانوں پر ——— ہندوستانی اسلامی تہذیب ——— قدیم نظامِ تعلیم کی خصوصیات ——— مسلمانوں کے موجودہ علمی اور ثقافتی مرکز اور اُن کی تعلیمی تحریکیں ——— ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ ——— ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مسائل و مشکلات!

فاضل مصنف نے ہر عنوان پر جو کچھ لکھا ہے، سچ تو یہ ہے لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے، پوری کتاب میں کہیں "معذرت" کی جھلک نہیں، جو بات کہی ہے جرات اور ہمت کے ساتھ کہی ہے، دلائل وزنی اور اندازِ بیان اثر انگیز و دلنشیں ہے، مولانا علی میاں بھارت میں درحقیقت حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلکِ حق گوئی کی تجدید کر رہے ہیں! اُن کی یہ ایمانی جرأت اپنی جگہ بہت بڑا جہاد ہے (اللھم کثر امثالہ)

یہ کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی کارناموں اور دینی کارناموں کا "تعارف نامہ" ہے، جس میں تاریخ کی درجنوں عظیم شخصیتیں منظرِ عام پر آگئی ہیں، ایک افق پر اتنے بہت سے جگمگاتے ستارے!! جزاک اللہ!

یہاں تو روشنی ہی روشنی معلوم ہوتی ہے

ایک بات البتہ کھٹکی کہ ہندوستان کے علماء، اربابِ فکر اور اہلِ قلم کے تذکرے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ذکر چھوٹ گیا، ممکن ہے کسی مصلحت کی بنا پر اس "فروگذاشت" کے لئے فاضل مصنف نے اپنے کو مجبور و معذور پایا ہو ——— ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ مولانا مودودی کے تذکرہ کے بغیر نامکمل اور ناقص سمجھی جائے گی۔

فسادات جبل پور و ساگر اور اُس کے بعد!

مرتبہ:- ابوالفہم وحید حیدر آبادی، ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت: دو روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ الہلال اسٹال، الٰہ آباد ۳

اس کتاب میں جبل پور و ساگر کے فسادات کا پیش منظر اور پس منظر نمایاں طور پر ملتا ہے، پوری کتاب اپنی جگہ مجسم فریاد و احتجاج ہے! پولس کے دردناک اور انسانیت سوز تشدد کی ایک جھلک:-

"جبل پور میں مسماۃ تاج بی بی جو آج بھی موجود ہے اُس کی گود سے ایک ننھے بچے کو چھین کر خود پولیس کے ایک کارکن نے زمین پر پٹخا اور پیروں سے روند کر اُسے ہلاک کر ڈالا۔"

خود کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کی رپورٹ نے اس کا صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ بڑے پیمانے پر ہونے والے فسادات کے لئے وہاں کی پولیس اور تمامی حکام ذمہ دار ہیں، جو اقلیت کے مفادات میں قطعی طور پر ناکام رہے۔

اس الم انگیز کتاب میں بتایا گیا ہے کہ "جن سنگھی فرقہ پرستوں نے مسلمانوں پر حملے کئے۔ اور سرکاری اعلان میں اس کی خبر اس طریقہ سے دی گئی کہ گویا مسلمانوں نے جارحانہ حملہ کیا اور ہندوؤں نے اپنا بچاؤ کیا، مسلمان عورتوں کی عصمت دری کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا، پولیس نے مسلمانوں کے محلوں کو گھیر لیا اور جن سنگھیوں نے پولیس کی حفاظت میں مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی اور جب وہ نکل کر بھاگنے لگے، تو مردوں کو مارا پیٹا اور پکڑ لیا گیا، اور عورتوں کے زیورات اور قیمتی اثاثہ لوٹ لیا گیا۔"

یہ کتاب "غم نامہ" ہے، درد انگیز مرثیہ ہے، خونیں داستان اور لہو رُلانے والا المیہ ہے، ہم اپنے درد و غم کو اپنے اللہ کے سوا اور کس سے کہیں! کاش! اپنے دینی بھائیوں کی اس تباہی و ہلاکت کے دیکھنے سے پہلے ہمیں موت آجاتی! مگر خون اور آگ، اور اشک و آہ کے اس درد انگیز ماحول میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے اُمید ہے کہ وہ ظلم کا ضرور انتقام لے گا، اُس کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں! ہمارا ایمان ہے کہ ظلم کے سہارے کوئی نظامِ حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را　　چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

القاموس الجدید

مرتبہ :۔ وحید الزماں القاسمی الکیرانوی، ضخامت ۶۷۱ صفحات، مجلد (خوبصورت پاکٹ ایڈیشن) قیمت :۔ سات روپے، ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ دار الفکر دیوبند (یو۔ پی)

مولانا وحید الزماں قاسمی "القاموس الجدید" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہندوستان میں عربی زبان سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں عرصہ سے ایک ایسے معجم کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی تھی جس میں اُردو الفاظ کا مفہوم موجودہ عربی زبان میں منتقل کیا جائے جس سے اُردو داں بالخصوص طلبہ مدارس کے لئے نہ صرف عربی زبان دانی سہل ہوجائے بلکہ انہیں موجودہ عربی کے ضروری الفاظ، اصطلاحات اور تعبیرات سے اس حد تک واقفیت ہوجائے کہ انہیں ترجمہ و انشاء اور اپنے مافی الضمیر کی ادائگی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ . . ."

یہ اُردو عربی ڈکشنری اس ضرورت کو بڑی خوبی کے ساتھ پورا کرتی ہے۔ چند نمونے :۔

بھوک ہڑتال کرنا۔ عربی :۔ الاضراب من الطعام — ٹوٹل (TOTAL) عربی المجموع، ڈائل (گھڑی کا) میناء الساعہ (ڈائل (ٹیلیفون کا) قرص الارقام، ریلوے گارڈ۔ (عربی) مستحفظ القطار، فرقہ وارانہ فساد، اضطراب طائفی (عربی)

القاموس الجدید عربی طلبہ اور عوام بلکہ پاک و ہند کے عربی داں طبقہ کے لئے بھی کار آمد اور مفید اُردو عربی ڈکشنری ہے۔

نوائے امروز

از :۔ ابوظفر نازش رضوی، ضخامت ۱۷۶ صفحات، رنگین و جاذب نظر سرورق، کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت :۔ ساڑھے تین روپے۔

ملنے کا پتہ :۔ ادارہ ناشرین منہاس اسٹریٹ، پیسہ اخبار لاہور

جناب ابوظفر نازش رضوی اُردو اور فارسی کے پختہ مشق شاعر ہیں، اُن کے کلام میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے، نازش کے اس مجموعۂ کلام پر جناب عبد المجید سالک مرحوم نے مختصر سا مقدمہ اور حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر "نیرنگ خیال" نے "پیشِ لفظ" تحریر فرمایا ہے۔

"ان تمام خصائص کے امتزاج سے آپ کے کلام نے جو چیز پیدا کی ہے اُس کی مثال دورِ حاضر کے مشہور و معروف شعراء فرداً فرداً پیش کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ میں تو یوں کہتا ہوں کہ موجودہ اُردو شعراء میں سوائے چند صاحب طرز شعراء کے اور کسی سے نازش کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا"

تعارف نگار کی یہ خوش اندیشی کتنی مبالغہ آمیز ہے !!

"لہٰذا غیور اور احساس فن کار شعر کہتے وقت فرسودہ اور پامال مضامین کی آورد سے یکسر کنارہ کش رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ "نوائے امروز" کی ہر نظم گل و بلبل کے تعلقات پر روشنی ڈالنے کی بجائے خیال انگیز ہے۔"

"فرسودہ اور پامال مضامین کی آورد سے کنارہ کشی" اور "گل و بلبل کے تعلقات پر روشنی ڈالنا" اور "ہر نظم کا خیال انگیز ہونا" —— عجیب انداز بیان ہے !

چودھری عبد الرشید تبسم نے "نوائے امروز" کا دیباچہ لکھا ہے اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے "اعتراف" تبسم صاحب لکھتے ہیں :۔

"نازش کا خیال ہے کہ مسلمان مجاہد دنیوی حرص و ہوس کا بندہ نہیں بن سکتا، نرم و نازک زندگی

بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں ۔۔۔۔"

جواز و عدم جواز کا فتویٰ دینے کی بجائے، کہنا یوں چاہیئے تھا "مسلمان عیش و ترفہ کی زندگی سے دلچسپی نہیں رکھتا، کہ وہ فطری طور پر سخت کوش اور جفاکش واقع ہوا ہے"۔

فرو ہو جنگ کا خدشہ، سلامتی کا ہو دور — قیام امن میں ہم کامیاب ہوں ہر گام (صـــ)

پورا شعر سپاٹ ہے۔

سبق ہر ایک کو دیں اتحاد جوئی کا — جہاں میں ہم سے عبارت ہو دوستی کا پیام (صـــ)

"اتحاد جوئی" کا سبق، کیا بات ہوئی؟

فرض رہنا ہے مجاہد کے دلِ بیباک میں — ہے سکونت اس کی اہلِ عزم کے ادراک میں (صـ۱۵)

"مجاہد کے دلِ بے باک" میں "فرض کا رہنا" ہی کم عجیب نہ تھا، کہ اس کی "اہلِ عزم کے ادراک" میں "سکونت" نے شعر کو ایک مضحکہ بنا دیا

پتنگے محو تھے جس کی لگن میں — وہ شمع آگئی ہے انجمن میں (صـ۵)

حیرت ہے کہ چالیس سال کی مشقِ سخن اور مطالعہ کے بعد شاعر کو اس کا پتہ نہیں کہ "شمع" کا وزن کیا ہے!

اور اس شعر میں ؎

پھر شمع فسردہ تابندہ ہوگئی ہے! — غیرت کی حسِ مُردہ پھر زندہ ہوگئی ہے (صـ۶۲)

تو "شمع" کا استعمال شاعری کے ساتھ مذاق ہے۔

گرم عمل ہو جس کی حرارت سے حسِ عزم — دل کے لئے کچھ ایسے شرارے تلاش کر

پہلا مصرعہ کس قدر غیر شاعرانہ بلکہ بچکانہ ہے۔

بہار آئی ہے سرو و سمن کی بات کرو
چمن کا ذکر ہو اہلِ چمن کی بات کرو
کنارِ آب شب ماہتاب مستی میں
نگاہ ساقی توبہ شکن کی بات کرو

——— اور ———

چمکے گا یوں ہی نام شہیدانِ وطن اور — پھیلے گی ابھی نکہتِ گل ہائے چمن اور
حق، کہنے سے منصور پہ جتنی ہوئی سختی — اتنا ہی بڑھا ولولہ دار و رسن اور
اک حال پہ قائم نہ رہا ہے نہ رہے گا — بدلے گا کئی رنگ ابھی چرخ کہن اور

کاش! "نوائے امروز" میں شاعر اس "آہنگ" کو قائم رکھ سکتا۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ :- "الحسنات" رامپور (یو-پی)

"اُردو ڈائجسٹ" اپنی شان اور طرز کا سب سے منفرد مجلّہ ہے، جو بڑے اہتمام کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے اور اس کا ہر شمارہ پچھلے شمارے سے خوب تر ہوتا ہے۔ ترتیب و تنوع کے اعتبار سے مضامین کا انتخاب اس قدر دل چسپ ہے کہ :-

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

سائنس، شخصیات، تنقید، افسانہ، تاریخ، نفسیات ...... کی رنگا رنگی نے "اُردو ڈائجسٹ" کو "گل صد برگ" بنا دیا ہے، پھر لطف یہ ہے کہ خواص و عوام کے ذوق کی رعایت کے ساتھ شائستگی اور ادب و اخلاق کے تقاضے پوری طرح ملحوظ رہتے ہیں!

"اُردو ڈائجسٹ" کی مجلسِ ادارت، اس ماہنامہ کی اشاعت پر اُردو دنیا کی طرف سے تحسین و تبریک کی مستحق ہے!

انوارِ اسلام

نگراں :- ابو محمد امام الدین - مدیر :- محمد قمر الدین مدیر معاون :- تاج الدین اشعر - مدیر منظومات :- فاروق بانسپاری، سالانہ چندہ :- چار روپے، قیمت فی پرچہ :- ۳۷ نئے پیسے

ملنے کا پتہ :- دفتر "انوارِ اسلام" رام نگر بنارس

"انوارِ اسلام" بلند پایہ دینی، علمی اور ادبی ماہنامہ ہے، اس کے تمام مضامین مفید اور با مقصد ہوتے ہیں، مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری کا علم، تجربہ، پختہ مشق، مطالعہ اور دینی ولولہ، اس مجلّہ کی ترتیب و تدوین میں کام آ رہا ہے، جو اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

خدا کرے "انوارِ اسلام" مالی طور پر خود مکتفی ہو جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ علم و ادب اور دین و اخلاق کی خدمت مسلسل ہوتی رہے تاریکی کے اس دور میں اسلام کے انوار ہی دُنیا کے ماحول کو جگمگا سکتے ہیں۔

ماہنامہ "پھلجھڑی"

مدیر :- مسٹر دہلوی، سالانہ چندہ پانچ روپے، ملنے کا پتہ :- دفتر ماہنامہ "پھلجھڑی" ۱۹ء اوریئنٹل چیمبرس ساؤتھ نیپیر روڈ، کراچی۔

"پھلجھڑی" کا نام ہی خود بتا رہا ہے کہ میں کیا ہوں؟ یہ ماہنامہ سچ مچ مزاح کے انار اور ہوائیاں اور ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتا ہوا اُفقِ صحافت پر نمودار ہوا ہے، مسٹر دہلوی بڑے سلیقے کے ساتھ اس رسالہ کو مرتب کرتے ہیں، دل چسپ کارٹونوں کے ساتھ پورا پرچہ آفسیٹ پر چھپتا ہے! مزاح و ظرافت تیز ہو جائے تو اس میں بازاری پن آ جاتا ہے، "پھلجھڑی" کا مزاج شائستہ ہے اور اس کے شاعر اور مضمون نگار ہنسی ہنسی میں کام کی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں!

"پھلجھڑی" نے لکھنؤ کے "اودھ پنچ" کی یاد کو تازہ کر دیا ہے، ہم اس "پھلجھڑی" کی "خوش درخشید گی" کے لئے "شعلہ دوام" بننے کی دُعا کرتے ہیں۔

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی، کراچی
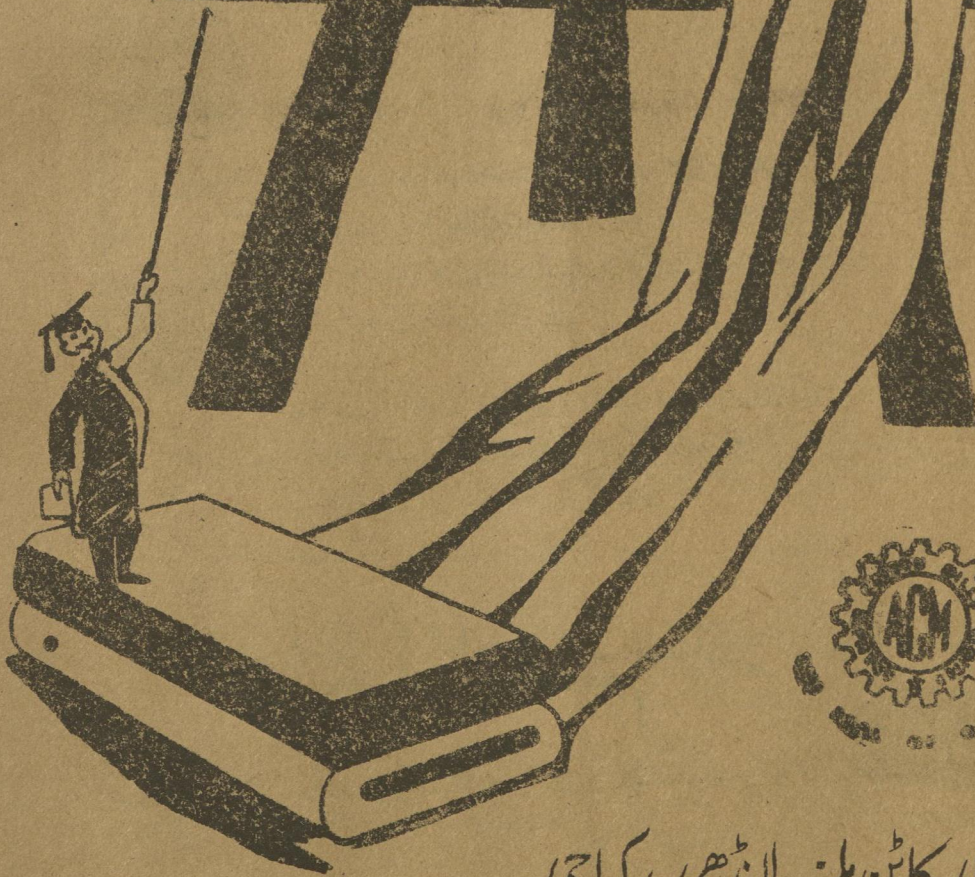
کے-ٹو کے مستقل قدرداں
K-2
K-2
CIGARETTES
اوروں سے زیادہ ہیں۔
کے-ٹو چوٹی کے سگریٹ ہیں
پریمیئر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ۔

عمدہ عمارتیں
بڑی عمارتیں
رہائشی عمارتیں
حسین عمارتیں
چھوٹی عمارتیں
اور تمام مضبوط عمارتیں
ZEALPAK
ZEALPAK
زیل پاک سیمنٹ
سے بنائی جاتی ہیں
جدید تعمیرات کیلئے پاکستان کا بہترین سیمنٹ
مینیجنگ ایجنٹس
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

یہی جگہ ہے

CINEMA

جہاں آپ کا پیسہ ضائع ہوا!

جب آپ کی کار ٹھہری ہوئی ہوتی ہے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب تیزابی مادے
پرزوں کو کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ تیزابی مادوں کا موجب احتراق سے
پیدا ہونیوالے تیزاب اور پانی کا مرکب ہوتا ہے۔ تیزابی مادے انجن کے سب سے بڑے
دشمن ہوتے ہیں اور پسٹنوں، سلنڈروں کے چھلوں اور دیگر اہم پرزوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ لیکن
شیل x-۱۰۰ موٹر آئل میں القلی شامل ہوتا ہے جس سے تیزابی مادے ناکارہ ہو جاتے ہیں
اپنے انجن کی حفاظت کرنے اور اپنی کار کی عمر بڑھانے کیلئے آج سے ہی
شیل x-۱۰۰ موٹر آئل کا استعمال شروع کر دیجئے

تیزابی مادے ہی انجن کو سب سے زیادہ نقصان پہونچاتے ہیں

شیل X-100 موٹر آئل

ان تیزابی مادوں کا اثر زائل کرتا ہے

BSP-3

چمکدار لیکن سکونِ بخش
پاکستان میں بنے ہوئے
جی سنز
لیمپ
جی سنز کے لیمپس قلیل مدّت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے۔
آپ انہیں مکانوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے۔
درحقیقت ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی
گئی ہی، آپ جی سنز ہی استعمال کیجئے، اس لئے کہ یہ بہترین ہیں۔

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

فاران
کراچی

جلد ۱۳

شمارہ ۱۲

ایڈیٹر۔ ماہر القادری

ماہ مارچ سنہ ۶۲ھ

چندہ سالانہ

۶ چھ روپے

فی پرچہ

پچاس پیسے (۵۰)

ترتیب

مقام اشاعت، دفتر ماہنامہ "فاران"، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقش اوّل!

ہندوستان میں اُردو زبان کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جا رہا ہے، اُس کے ثبوت میں ہندوستان ہی کے اخباروں اور [رسالوں] کے ہزاروں صفحات پیش کیے جا سکتے ہیں جو اپنی جگہ مجسّم احتجاج اور سراپا فریاد ہیں! اُردو کے معاملہ میں ہندوستانی حکومت کا شکوہ کرتے ہوئے ہمیں شرم آتی اور ندامت محسوس ہوتی ہے کہ خود پاکستان میں اُردو کو وہ مقام کہاں مل سکا ہے جس [کی] وہ مستحق ہے! دین، زبان اور تہذیب و معاشرت کے بارے میں، پاکستان بننے سے پہلے جو وعدے کیے گئے تھے، پاکستان [بن] جانے کے بعد، اُنہیں فراموش کر دیا گیا، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

تو

[غریب] اُردو کو "بڑے لوگوں" کی اِس وعدہ فراموشی اور "بھول جانے کی عادت" کا زخم سہنا پڑا! مگر ان تمام ناانصافیوں اور [وعدہ] فراموشیوں کے باوجود اُردو زبان، ہندوستان اور پاکستان میں بڑھتی پھیلتی اور چھاتی چلی جا رہی ہے، اور عوام [کی] پسند اور مانگ نے راج شکتی اور سطوتِ خسروی کو شرمسار کر دیا ہے ——— اُردو زندہ و پائندہ باد!

حکومتوں کی اس دانستہ غفلت شعاری اور بے پروائی بلکہ ناانصافی کے باوجود اُردو کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت جو معجزے اور کرامت کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، اُس کا سبب اُردو زبان کی سادگی، سلاست، شیرینی اور اُردو ادب کی دل کشی اور جامعیت ہے! اُردو کی کہاوتیں فطرت کی ترجمان، اُس کے محاورے دل نشین اور اُس کا روزمرہ سادہ و پرُکار ہے! اُردو کے خوانِ نعمت پر چٹخاروں کی وہ بہتات ہے کہ کام و دہن بے ساختہ صلِّ علیٰ اور مرحبا پڑھنے لگتے ہیں! ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

اُردو زبان دُنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے مگر اپنی گیرائی اور جامعیت میں کسی بڑی بوڑھی زبان سے کمتر نہیں ہے بلکہ سب سے زیادہ شوخ و شنگ اور طرحدار ہے کوئی مفہوم کتنا ہی پیچیدہ، نازک، گہرا اور بلند کیوں نہ ہو، اُردو زبان اُس کے ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر تو اصل مفہوم اُردو زبان کے قالب میں ڈھل کر اور زیادہ حسین و دل کش بن جاتا ہے، اور اربابِ ذوق اس فرق کو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ مظروف سے زیادہ ظرف حسین ہے۔

فردوسی کا یہ شعر ؎

بہم بستہ مُوُ را بصد پیچ و تاب | گرہ داد شب را بسِ آفتاب

کس قدر پُرشکوہ ہے! لیکن اس کے مقابلہ میں مثنوی زہرِ عشق کے اس شعر ؎

رُخ پہ گیسو ہوا سے ملتے ہیں | چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

کی دل کشی اور رنگینی کا بھی کوئی جواب ہے۔؟

اسی مثنوی کے دو شعر ہیں ؎

صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ علیہا فان

اور

مار ڈالا تماش بینوں کو زہر کھلوا دیا حسینوں کو

پہلا شعر زاہدوں، پاکبازوں اور دینداروں کے کام کا ہے اور دوسرے شعر سے رنگین مزاج لطف اندوز ہو سکتے ہیں! ایک ہی جام میں بادۂ طہور بھی اور شراب پرتگالی بھی!!

پنڈت دیا شنکر نسیم اپنی مثنوی کا آغاز کس شان سے کرتے ہیں۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے زباں کا حمدِ باری

بات قدرے تکلف سے کہی ہے مگر اس حسنِ تکلف پر کتنی بہت سی سادگیوں کو قربان کیا جا سکتا ہے!

مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ شعر ؎

خالق نے دیئے تھے چار فرزند دانا، عاقل، زکی، خردمند

صنعتِ ایجاز کا شاہکار ہے!

دانا تو کب اس طرف کرے میل ہارا ہے جُوئے کے نام سے بیل

اور

؎ گڑ سے مرے تو زہر کیوں دو

ضرب الامثال، کس خوبی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کا تنہا یہ مصرعہ ؎

سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

سینکڑوں "لوک گیتوں" پر بھاری ہے۔

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط (خواجہ میر درد)

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم! کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھیرے گا (مصحفی)

پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں ہم اور خاک میں مل جائیں گے اُٹھانے سے (وحید الہ آبادی)

ان شعروں میں کس قیامت کی نازکی اور معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی (مومن)

شعر کیا ہے، عشق عاشقی کے معاملات کا ایک "صحیفہ" ہے!

؎ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

سینکڑوں کامیاب رُومانی نظمیں اور مثنویاں پڑھنے کے بعد بھی، غالب کے اس مصرعہ کا لُطف کم نہیں ہوا۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

شاہ ظفر کا یہ مصرعہ تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا (دانیس)

اس اندازِ بیان نے اردو شاعری کی آبرو بڑھائی اور اس چمن کو رنگینی اور طراوت بخشی ہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

حالی کے یہ شعر شاعری کی معراج ہیں۔

کیا شان ترے جمال میں ہے — ہر وقت زمانہ حال میں ہے (اکبر الہ آبادی)

اسی قسم کے شعروں پر "جزویست از پیغمبری" کا اطلاق ہوتا ہے۔

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں — وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے (اکبر الہ آبادی)

شاعرانہ تصویر کشی کا یہ وہ مقام ہے جہاں فنِ مصوری درماندہ و عاجز نظر آتا ہے۔

جب سے کھو یا گیا ہے دل اپنا — چیز رکھتا ہوں، بھول جاتا ہوں (حیات بخش رسا)

کس قدر سچا، صاف، سادہ اور دل نشین شعر ہے! کسی قسم کا تکلف اور صنعت نہیں، کوئی مبالغہ نہیں، سامنے کی بات۔ مگر ہائے — !؟!!

یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ میکدہ — مائل! تمہیں سلام کہا ہے بہار نے (مرزا مائل دہلوی)

پیری و کہن سالی پر اتنی لطیف طنز! یہ وہ شعر ہے کہ ایک بار پڑھیئے اور ساری عمر یاد رکھیئے، —————— دہرائیے اور لطف لیجئے!

اُڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری (اقبال)

اتنی بھرپور نغمگی —— اس قدر حلاوت اور دل نشینی۔

کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

کچھ اس ادا سے مرا اس نے مدعا پوچھا! — ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود (اصغر گونڈوی)

"آنسو" کے دو منظر اور دو کیفیتیں پیش کیں، مگر دونوں کا لطف اور عالم جدا جدا!

سن تو لیا ہے حالِ دل، دیکھیے سن کے کیا کہیں — پھر مرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دل نشیں سہی (رعنائی)

اس اندازِ بیان کے قربان! پڑھیے اور وجد کیجیے!

خود تجلی کو بھی اذنِ حضوری فانی — آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

وہ جو فرزدق نے کہا تھا کہ شاعری میں بھی وہ مقامات آتے ہیں، جہاں سجدہ واجب ہو جاتا ہے، تو فانی کا یہ شعر اسی پایہ کا ہے!

جبینِ یار پر غصہ میں حسرت — فروزاں ہے جمالِ سرگرانی

"عتابِ محبوب" پر اتنا کامیاب شعر، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں مل سکے —— بلکہ حق یہ ہے کہ نہیں مل سکے گا۔

حشر کے دن وہ گنہگار بخشا جائے — جس نے دیکھا تری آنکھوں کا پشیماں ہونا (جگر مراد آبادی)

شعر نہیں "سحرِ حلال" ہے!

اُردو شاعری کی مثالوں کے سلسلہ کو اگر طُول دیا جائے، تو یہ مضمون پُوری کتاب بن جائے گا، چند جھلکیاں اور نمونے یہ دکھانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں کہ اُردو شاعری کا یہ وہ اسلوب، زبان و بیان کا لُطف اور خیال واظہار کا آہنگ ہے، جس نے اُردو زبان وادب کو مقبول خاص وعام بنایا ہے، یہی رنگ اُردو نثر کا ہے، تنقید نگاروں اور انشا پردازوں میں تنہا شبلی نعمانی اپنی ذات سے دبستانِ شعروادب اور علم وفضل کی دانشگاہ (اکیڈمی) ہیں! اور شعر کی جیسی پرکھ شبلی کو تھی، اُس کی پرچھائیں بھی کسی تنقید نگار پر پڑ جائے گی، تو وہ باریک بیں، شعر فہم اور صاحبِ بصیرت ہوجائے گا۔

غزل ہو نظم و رباعی ہو، تنقید ہو، افسانہ اور ناول ہو، تاریخ، فلسفہ اور علمِ کلام ہو، سارا لُطف خیال ومفہوم کے صحیح اظہار سے وابستہ ہے، جو بات بھی کہی جائے، قرینہ کے ساتھ کہی جائے، بیان ژولیدہ اور مُبہم نہ رہے، نازک سے نازک مفہوم سلجھاکر بیان کیا جائے بات "چیستاں" اور معمّہ نہ بننے پائے۔

اُردو شعروادب کا وہ سرمایہ جس نے اُردو زبان کو آفاق گیر بنایا ہے، نزاکتِ مفہوم، رفعتِ خیال، تعمقِ فکر اور مطالب و معانی کی وسعت وجامعیت کے ساتھ زبان کی سلاست وروانی اور پیرایہ بیان کی دل کشی کا بھی حامل ہے! شاعروں اور ادیبوں نے الفاظ برمحل استعمال کئے ہیں، عبارت کا دروبست ہموار اور متوازن ہے، موضوع اور مقام ومحل کے اعتبار سے لفظوں میں نغمگی بھی ہے، شکوہ بھی ہے، نرمی بھی ہے، کرختگی بھی ہے! ایجاز واختصار ہے، تو وہ ایسا نہیں ہے کہ قاری کی طبیعت گھٹن محسوس کرنے لگے، شرح واطناب ہے، تو اُسے پڑھ کر انشراح پیدا ہوتا ہے طبیعت اُکتانے نہیں پاتی ــــــ "طلسمِ ہوش رُبا" ہی کو دیکھ لیجئے کہ اُس میں مناظر اور کرداروں کا طُوفان اور افسانوی خاکوں کا ایک جنگل ملتا ہے مگر انکے درمیان کس قدر سلیقہ کے ساتھ ربط اور ہم آہنگی قائم کی گئی ہے، اسی چیز نے اس دفترِ بے پایاں کو دلچسپ بنادیا ہے۔

اُردو کے ان مایہ ناز شاعروں اور قابلِ فخر ادیبوں نے موضوع کی مناسبت سے پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، جیسا موضوع اور ماحول ہے ویسا ہی آہنگ ہے! یہ نہیں ہے کہ ڈھول اور نقاروں کا ماحول ہو اور وہاں بلبل اور قمری کی "لے" اختیار کی جائے دوشالہ پر انھوں نے ٹاٹ کا پیوند نہیں، زربفت کی گوٹ لگائی ہے! موضوع اور ماحول کے اعتبار سے آواز میں گھن گرج بھی ہے اور لہجہ نرم وشیریں بھی ہے! اُن کی تحریر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ زبان کے مزاج کو پہچانتے ہیں، اور لفظوں کے برتنے کا سلیقہ انہیں آتا ہے، لفظوں کے استعمال میں وہ بے پروائی اور اُس "آزادی" کو روا نہیں رکھتے، جو بے ڈھنگے پن کی دلیل ہے! وہ زبان وبیان میں ضرورت کے وقت اجتہاد سے بھی کام لیتے ہیں، مگر انکے اجتہادات میں بڑا حُسن پایا جاتا ہے، اُن کی وضع کی ہوئی اصطلاحیں اور تراشی ہوئی ترکیبوں سے عوام وخواص بہت جلد مانوس ہوجاتے ہیں اور زبان وادب کے مرقعے ان جدید تراکیب کو بڑی آسانی سے قبول کرلیتے ہیں۔

زبان وادب جامد اور متحجر نہیں ہیں، ان کا "نمو" اپنی جگہ مُسلّم ہے مگر زبان وادب کا نمو جنگل کے جھاڑ جھنکار کی طرح نہیں بلکہ لالہ وگل کے نمو کی مانند ہوتا ہے۔ اور لالہ وگل کی شاخوں کے اس فطری نمو پر فنِ چمن بندی بھی صرف کیا جاتا ہے۔ ہمارے نامور ادیبوں اور شاعروں نے زبان وادب کے اس فطری نمو کو "خوش آمدید" بھی کہا ہے اور دوسری طرف اس کی بڑھوار کو جھاڑ جھنکار کی طرح ناموزوں اور بے سلیقہ ہونے سے بھی بچایا ہے!

زبان وادب کو ان فنکاروں نے ثروت اور وسعت عطا کی ہے اور صرف ثروت و وسعت ہی نہیں، دل کشی اور رعنائی بھی! زبان وادب کا یہی وہ سرمایہ ہے، جس کے سہارے اُردو طرح طرح کی مخالفتوں اور بے انصافیوں کے باوجود نہ صرف یہ

زندہ ہے بلکہ مقبول ہے، غالب ہے اور نکہت گل کی طرح اُردو زبان پھیلتی اور آگے بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

مگر

یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ مدت سے زبان وادب کے جو نمونے ہمارے سامنے آرہے ہیں، انہیں دیکھ کر وجدان سخت کرب و اذیت محسوس کر رہا ہے، کتنی بہت سی غزلیں، نظمیں، افسانے اور تنقیدی مضامین ہیں جنہیں پڑھ کر دل جھنجلا کر اور دماغ چکرا کر رہ گیا ہے! یہ ضربیں دل و دماغ پر برابر پڑ رہی ہیں۔ برسوں ہو گئے ہیں کہ احساس و وجدان ان صدموں سے دوچار ہیں۔ نئے لکھنے والے خاص طور سے اس بے راہ روی کا شکار ہیں، رسالوں کی بہتات اور نئی کتابوں کی کثرت کو دیکھ کر طبیعت ایک طرف خوش ہوتی ہے تو دوسری طرف اُن کے مضامین کو پڑھ کر طبیعت بجھ سی جاتی ہے کہ زبان و ادب کے خرمن میں اضافہ تو ہو رہا ہے مگر ناقص پیداوار کا اضافہ ہو رہا ہے! ہائے! وہ خزانہ جس میں کھوٹے سکوں کے چٹے پر چٹے لگتے چلے جا رہے ہوں اور صرافوں کی کسوٹیاں اور کھوٹے کھرے کو جانچنے اور پرکھنے کے آلے بیکار پڑے ہوں۔

پست اور سطحی ادب کو کسی نہ کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے، پچھلے ادیب اور شاعر بھی سب ایک جیسے نہ تھے، اُن کے یہاں بھی بلندی کے ساتھ پستی پائی جاتی ہے، ہاں! پستی مگر بے راہ روی نہیں! کم سے کم وہ صحیح زبان تو استعمال کرتے تھے، انکی تحریریں وجدان کو بے مزہ بناتی ہیں لیکن بے راہ روی کی طرف نہیں لے جاتیں۔

کسی زبان کا ادب اُس وقت تک "بلند" اور "جاندار" ہو ہی نہیں سکتا جب تک اُس ادب میں جو زبان استعمال ہوتی ہے، وہ صحیح، بامحاورہ اور سلیس و رواں نہ ہو! اور آج اُردو کے جدید شعر و ادب میں سب سے زیادہ بے پروائی زبان کے ساتھ برتی جا رہی ہے، مثلاً کہنا یہ ہے کہ کسی شخص کو کان پکڑ کر اٹھا دیا، اس مفہوم کو ظاہر یوں کیا جاتا ہے۔

"اُسے کان سے پکڑ کر اُٹھا دیا" ——

اچھے خاصے انشا پرداز اور افسانہ نگار "اٹنا" اور "پٹنا" کا صحیح مفہوم نہیں جانتے، اور ان لفظوں کو غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔

"میز کتابوں سے اَٹی ہوئی ہے"۔

ایسے وجدان خراش جملے ان گنہگار آنکھوں کو پڑھنے پڑتے ہیں، اِن جدت پسندوں کو کون سمجھائے کہ "اٹنا" گرد و غبار کے لئے استعمال ہوتا ہے، کتابوں اور دوسری چیزوں کے ساتھ "پٹنا" بولتے ہیں، یوں:۔

"کتابوں اور کاپیوں سے میز پٹی ہوئی ہے"۔

اور

میرا جسم راستہ کی گرد سے اٹ گیا"۔

"درد و غم" تو جمع بولے جاتے ہیں، اور "غم" کی بھی اُردو میں جمع آتی ہے مگر "درد" کی جمع اُردو میں نہیں آتی، ہاں "دردِ زہ" کے لئے درد کی جمع بے شک مستعمل ہے بلکہ روزمرہ ہے:۔

"اُس عورت کے درد ہو رہے ہیں"

مگر ہم نے "غم" کی طرح "درد" کی جمع بھی پڑھی ہے، اور بے اختیار ہنسی آگئی ہے! فلمی زبان میں "درد" سے "دردیلا" بنایا گیا (یہ راگ ہیں دردیلے) توبہ!

شبلی، حالی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ ناقدین کی تحریریں کتنی سلجھی ہوئی ہیں، اپنی بات وہ کس سلیقہ کے ساتھ

کہتے ہیں؟ مگر آجکل کے بعض جدت پسند تنقید نگاروں کی تحریر کا یہ رنگ ہے:۔

"البتہ فرانسواز ساگاں کی ناولیں عموماً ایک انفرادی تجربہ تک محدود ہیں، گو یہ تجربہ ایک مکمل تجربہ ہوتا ہے اور اس کی پیش کش بڑی حد تک تسکین بخش۔۔۔" عہ

کیا ناول تجربہ کے لئے لکھے جاتے ہیں؟ پھر انفرادی اور اجتماعی تجربہ کا فرق اس سے زیادہ غور طلب اور محلِ نظر ہے! اس پر مستزاد تجربہ کا مکمل ہونا؟ کسی ایسے ناول کی نشان دہی کی جائے جس میں تجربہ نامکمل رہ گیا ہو۔ اور ان سب پر قیامت "اس (تجربہ) کی پیش کش، جو تسکین بخش بھی ہوتی ہے ——— اس عبارت میں ہمارے پلّے تو کچھ پڑا نہیں!

اور سنیئے

"تسلسل اور تکمیل طویل مختصر افسانہ کے نہایت ضروری لوازمات میں سے ہے"۔ آخر یہ کیا بات فرمائی گئی ہر افسانہ چاہے مختصر ہو یا طویل "تسلسل" تو اُس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، جس افسانے میں "تسلسل" ہی سرے سے غائب ہو، اُسے افسانہ کون کہے گا، اور تسلسل کے بعد "تکمیل" کو جو طویل مختصر افسانہ کے لئے لازمی بنایا گیا ہے، یہ ایسی ہی مضحکہ خیز دریافت ہے، جیسے کوئی کہے کہ تندرست آدمی کے لئے سانس لینا ضروری ہے!

یہ تنقیدی مقالہ ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:۔

"کسی بھی آرٹ فارم کی طرح طویل مختصر افسانہ کی ہیئت اُوپر سے عائد نہیں کی جاسکتی، بلکہ موضوع مواد اور افسانہ کی باطنی ضروریات سے اُس کی تخلیق عمل میں آتی ہے"۔

آخر یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ کس قدر ژولیدہ اندازِ بیان ہے؟ "ہیئت کا اوپر سے عائد ہونا" یہ بات کیا ہوئی؟ کسی ایسے افسانہ کا اتا پتا بھی دینا چاہیئے تھا جس میں "ہیئت اوپر سے عائد کی گئی ہو" پھر "افسانہ کی باطنی ضروریات" نے اور زیادہ الجھاؤ پیدا کر دیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے تنقید نگاروں میں کچھ "صوفی" اور "مجذوب" بھی پائے جاتے ہیں!

ایک دوسرے ناقد فرماتے ہیں:۔

"رشتوں کی تلاش ایک دردبھرا عمل ہے، مگر ہمارے زمانے میں وہ شاید زیادہ ہی پیچیدہ اور دردبھرا ہو گیا ہے، مولانا حالی اور اُن کے بعد علامہ اقبال نے مسلمانوں کی تاریخ کو پورا حوالہ جانا، اور اس بنیاد پر ماضی سے رشتہ قائم کیا"۔

کوئی شک نہیں اس تنقید میں "تاریخی رشتوں" کا ذکر چلا آرہا ہے مگر پیراگراف کا اس طرح آغاز کہ "رشتوں کی تلاش ایک دردبھرا عمل ہے"۔ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ شاید بیاہ شادی کے رشتے تلاش کئے جا رہے ہیں، اور حالی کے اس شعر

جو بیٹی کے پیوند کی فکر کیجے
تو بدراہ ہیں بھانجے اور بھتیجے

کی مقالہ نگار نے ترجمانی کی ہے پھر "دردبھرا عمل" یہ کتنی نامانوس زبان ہے! اس عبارت کے اس جملہ میں:۔

"مولانا حالی اور ان کے بعد علامہ اقبال نے مسلمانوں کی تاریخ کو پورا حوالہ جانا۔۔۔"

عہ ہم نے نثر و نظم کے اقتباسات میں لکھنے والوں کے نام قصداً نہیں دیئے ۔ (م۔ق)

اگر کتابت کی کوئی غلطی نہیں ہے، تو اس میں اہمال کے سوا اور کیا دھرا ہے؟

ایک اور صاحب ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پوری آیڈیالوجی کو سر کے بل کھڑا کرنے میں کہیں طنز یا جھلاہٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔۔۔"

تنقید نگار کو شاعر کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہ دکھائی دی کہ اُس نے پوری آیڈیالوجی کو سر کے بل کھڑا کر دیا! آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے، یہ کیسی نگاہ تنقید ہے؟ شعر و ادب کے ساتھ ایسا مذاق، اس طرح کا ظلم! ؎

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

وجدان پر جبر کر کے فرض بھی کر لیا جائے کہ شاعر نے اپنے کلام میں آیڈیالوجی کو سچ مچ سر کے بل کھڑا کر دیا ہے، مگر ایسا کرنے میں شاعر نے جھلاہٹ سے دامن بچایا ہے تو کیا کمال کیا؟ کیا آیڈیالوجی کو سر کے بل کھڑا کرتے وقت، شاعر نے بھی جمناسٹک کی تھی اور وہ خود بھی سر کے بل اپنی ٹانگیں اوپر کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔

یہ جدید تنقید کے نمونے تھے، اس کے مقابلہ میں شعر العجم کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

"جب کسی نہایت نازک، اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے، تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتی، اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے اگر اُن کو چھوا، تو ان کو صدمہ پہنچ جائے گا، جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے، ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا۔"

"واقعاتِ عالم پر جب وہ (شاعر) عبرت کی نظر ڈالتا ہے تو ایک ایک ذرہ ناصح بن کر اس کو اخلاق اور عظمت کی تعلیم دیتا ہے، اس عالم میں وہ گورِ غریباں میں جا نکلتا ہے تو بوسیدہ ہڈیاں علانیہ اُس سے خطاب کرتی ہیں:۔

کو زنہار اگر مردے آہستہ تر	بھائی! ذرا دیکھ کے چل
کہ چشم و بنا گوش در روے است سر	یہاں، آنکھیں ہیں، چہرے ہیں، سر ہیں

عالم شوق میں وہ پھول ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے، تو اُس کو معشوق کی خوشبو آتی ہے اور پھول سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

"یہ باتیں کسی اور کی زبان سے ادا ہوں تو ہم اسے مجنوں سمجھیں گے، لیکن شاعر اس انداز سے کہتا ہے کہ سننے والوں پر بڑا اثر ہوتا ہے، کیوں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، اثر میں ڈوبا ہوتا ہے اور حقیقی حالت کی تصویر ہوتا ہے۔"

"۔۔۔ اس عالم میں شاعر کی تاریخ زندگی عجیب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہے، بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے، پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے وہ رات بھر سوزِ دل کہتا رہا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے، بارہا اُس نے غنچہ کی اُس وقت پردہ داری کی ہے جب وہ

معشوق کا تبسم چرا رہا تھا۔"

الفاظ کس طرح اور کب "متروک" قرار پاتے ہیں؟ اس کا جواب علامہ شبلی نعمانی کی زبانِ حقیقت بیان سے سُنیئے:۔

"ایک نکتہ خاص طور پر یہاں لحاظ رکھنے کے قابل ہے، اکثر الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں ثقل ہوتا ہے، لیکن ابتدائی زمانہ میں جب لوگوں کا احساس نازک نہیں ہوتا تو اُن کا ثقل محسوس نہیں ہوتا کثرتِ استعمال اس ثقل کو کم کر دیتی ہے، لیکن بالآخر جب احساس نازک ہو جاتا ہے، تو وہ الفاظ کھٹکنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ متروک ہو جاتے ہیں۔"

"تخیل جس قدر قوی، باریک، متنوع اور کثیر العمل ہوگی اُسی قدر اس کے لئے مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی جس قدر بلند پرواز طائر ہوگا، اُسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت زیادہ درکار ہوگی . . ."

ان مثالوں سے "قدیم تنقید" اور "جدید تنقید" کے اسلوب، طرزِ فکر اور اندازِ نگارش کے فرق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، ہم نے "قدیم" کا لفظ امتیاز قائم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ جس "تنقید" کے نمونے اوپر پیش کئے گئے ہیں، وہ تنقید ہر دور میں تازہ اور شاداب ہی رہے گی۔

ایک "بے سروپا (آزاد) نظم" کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

نغمہ درجاں، رقص برپا، خندہ برلب

دل، تمناؤں کے بے پایاں الاؤ کے قریب

لفظوں کی ناہمواری کا یہ عالم ہے کہ "نغمہ درجاں" "رقص برپا" اور "خندہ برلب" جیسی فارسی ترکیبوں کے ساتھ دوسرے مصرعہ میں "الاؤ" لایا گیا۔ پھر "تمناؤں کا الاؤ" بھی ایک بے تکی سی بات ہے، اور "الاؤ" کو بے پایاں کہنا، اس سے زیادہ مہمل بات! یہ بھی غور طلب ہے کہ تمناؤں کا یہ الاؤ دل میں ہے، یا دل کے علاوہ کسی اور جگہ ہے؟

یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو!

ریگ اپنی خلوتِ بے نور و خود بیں میں رہے

اپنی یکتائی کی تحسین میں رہے

اس الاؤ کو سدا روشن رکھو

یک دلی ایسی کہ ہوگی فہم انساں سے ورا

یک دلی ایسی کہ ہم سب کہہ اُٹھیں

اس قدر عجلت نہ کر

اژدہام گلُ نہ بن

کہ اُٹھیں ہم "تو غمِ کل تو نہ تھی، اب لذتِ گل بھی نہ بن" روزِ آسائشِ بیدردی نہ بن"

حیرت ہے کہ اس قسم کی مہملات اور خرافات رسالوں میں چھپتی ہیں اور تنقید نگاران پر مضامین بھی لکھتے ہیں! کاش! دوسرے اخلاقی جرائم کی طرح شعر و ادب کے مجرموں پر بھی احتساب کیا جاتا!!

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں :-

عمر کیا ہے فقط سر کی زنجیر ہے
میری شب کی کمانِ کشیدہ میں بھی
میری بے خواب ساعت ہی کا تیر ہے
خندہ زن ہر طرف روحِ اسرار ہے
شش جہت سے لپکتی ہے کوئی صدا
راہرو تو سفر کا سزاوار ہے
فطرتِ بے عناں روندتی ہے ابھی
بے سپر آگہی ۔ عشقِ بے باک کو
گردشِ آسماں روندتی ہے ابھی
اک مقفل خرد کی رصد گاہ میں
عصمتِ جستجو اور میرا ضمیر
محوِ پیکار ہیں ایک جنگاہ میں

خدا جانتا ہے کہ یہ بے تکے جملے نقل کرتے وقت، میں اپنے وجدان سے شرمسار ہوں! توبہ! توبہ! استغفر اللہ!!

ایک دوہا :-

نمبر دار کے چھورے نے چھیڑا تھا جب گوری کو
ایسے تڑپ کے بھاگی تھی جیسے رہو مچھلی ہو

ہندی دوہے، گیت اور چھند کتنے ہلکے پھلکے اور رسیلے ہوتے ہیں، ان میں کس قیامت کی نغمگی پائی جاتی ہے، یہ دوہا کتنا سپاٹ اور بے مزہ ہے، خاص طور سے دوہے کے آخری ٹکڑے ـ جیسے رہو مچھلی ہو ـ نے تو ذوقِ شاعرانہ کو تلملا دیا!

آ کے اب جنگل میں یہ عقدہ کھلا　　بھیڑیئے پڑھتے نہیں ہیں فلسفا
ریچھنی کو شاعری سے کیا غرض　　ننگ ہے تہذیب ہی کا قافیا
کھال چکنی ہو تو دھندے ہیں ہزار　　گیدڑی نے کب کوئی دوہا سنا
گورخر کی دھاریوں کو دیکھ لو!　　سوٹ چوپائے بھی لیتے ہیں سلا
لومڑی کی دُم گھنی کتنی بھی ہو　　ستر پوشی کو نہیں کہتے حیا

شہر میں ان کے جو گزرا ہے ـ ـ ـ ـ!
لکھ دیا ہے میں نے سارا ماجرا

غضب یہ ہے کہ یہ "خرافات" ایک مشہور و معروف رسالے میں "غزل" کے نام سے چھپی ہیں! اردو زبان کی آدھی مقبولیت

"غزل" کے دم قدم سے ہے! اس صنفِ لطیف پر بھی ظالموں نے ہلّہ بول دیا!

ناوک نے اُن کے صید نہ چھوڑا زمانے میں

فریاد! فریاد!

مگر کہاں تک فریاد و ماتم کیجیے گا، جدید ادب میں ذوق و وجدان کی قدم قدم پر تیر و نشتر سے پذیرائی کی جاتی ہے کچھ کے پر کچھ کے اور چر کے پر چرکے:۔

زور وہ اور ہے پاتا ہے بدن جس سے نمو — لاکھ کوئی کوئی ٹانگوں میں دبا کر موسل

تری جانب سے دل میں وسوسے ہیں — یہ کتے رات بھر بھونکا کئے ہیں

نہ پوچھو عقل کی چربی چڑھی ہی اسکی بوٹی پر

کسی شے کا اثر ہوتا نہیں کم بخت موٹی پر

یہی علیش ایک دن اہل ہوس کا خون جائے گا

ابھی کچھ دن لگا رکھیں وہ اس کتے کو روٹی پر

یہ اشعار بھی سنجیدہ غزل ہی کے نام سے پبلش کئے گئے ہیں! توبہ!

افسانوی ادب کا یہ رنگ ہے:۔

"ویسے آخری سال تو محض کھانسیوں اور بیماریوں میں کٹ گیا۔"

"ویسے" اور "محض" کا استعمال اور محل قابل غور ہے۔ پھر اس پر طرفہ تماشا "کھانسی" کی جمع "کھانسیوں" اس کے بعد شاید "زکاموں اور "کھجلیوں" کا نمبر آئے گا۔ افسوس!

"منہنی[1] سا آدمی چھوٹی بڑی ٹانگوں پر بھٹک کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔"

"ٹانگوں پر بھٹک بھٹک کر چلنا" یہ آخر کس دیس کی زبان ہے! یعنی جو جی میں آیا لکھ مارا، اور جو کچھ لکھدیا گیا، وہ چھپ بھی گیا اور اس شان سے چھپا، جیسے یہ اُردو زبان و ادب کا کوئی شہ پارہ ہے!

"اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُسے لگا کہ ہر چیز اسے چھوڑ کر جا رہی ہے۔"

اس جملہ میں "لگا" پڑھتے وقت زبان کتنی بے مزہ ہوتی ہے۔

"مچھروں کی تیز گردش اس کے قریب ہی اپنا وحشیانہ رقص جاری رکھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور ہجوم در ہجوم مچھروں کے ڈنکوں سے اس کے جسم کے ساتھ اس کی روح بھی چھلنی نظر آتی"

"گردش کا رقص کرنا" واہ! کیا اندازِ بیان ہے! اس پر مستزاد "روح کا چھلنی ہو جانا"۔

"۔۔۔۔۔ اس قدر تیز تیز اور تیکھا نغمہ کہ موسیقی کی ساری نرمی ساری حلاوت اسکی نذر ہو کر رہ جاتی، ذرا بھی جذب و ارتعاش باقی نہ رہتا۔"

خدا کے نیک بندو! جب تمہیں زبان و بیان پر قدرت نہیں ہے، تو افسانہ لکھنے کی آخر کیا مار پڑی ہی!!

---

[1] جو لوگ "غیظ" کو "غیض" اور "تلاطم" کو "طلاطم" لکھتے ہوں، وہ اگر "منحنی" کو "منہنی" لکھدیں تو کون سے اچنبھے کی بات ہے، جن کی "انشا" غلط ہو اُن کا "املا" بھی غلط ہو سکتا ہے۔

یہ تو "جدید ادب" کے چند نمونے ہیں، جو سرسری مطالعہ کے بعد سامنے آگئے ہیں، ورنہ اس سلسلہ کو اگر طول دیا جائے، تو یہ "دفترِ بے معنی" "بے پایاں" نکلے گا!

سوچئے تو سہی!

شاعری کا لطف پھیلاؤ اور شرح و اطناب میں نہیں ایجاز و اختصار میں ہے، جدید شاعری میں جہاں رمز و اشاریت اور ایجاز و اختصار سے کام لیا جاتا ہے، وہاں عام طور پر ابہام اور اہمال پیدا ہوجاتا ہے اور ان مبہم اور مہمل شعروں کو پڑھتے ہوئے طبیعت میں شدید انقباض پیدا ہوتا ہے، اکثر و بیشتر طویل نظمیں رسالوں میں دیکھنے میں آتی ہیں، ایک ہی بات کو بار بار دُہرایا جاتا ہے، اس تکرار میں جہاں آہنگ بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں نظم میں ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے، مصرعے دولخت اور غیر مربوط ہوتے ہیں، کئی کئی صفحوں کی نظم مگر نظم پڑھنے کے بعد بیچارے قاری کو ذہنی آشفتگی، انتشارِ خیالی اور اکتاہٹ کے علاوہ اور کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی! کہیں کہیں دل نشین مصرعے اور نازک خیالات آجاتے ہیں، تو اُن کے ساتھ کے دوسرے کاواک اور اَن مل بے جوڑ مصرعے، ان اچھے خاصے مصرعوں کا لطف بھی خاک میں ملا دیتے ہیں۔

تشبیہات میں نئی بات کہنے کے ہوکے نے جدید شاعری کو ایک مضحکہ بنا دیا ہے، غیر محسوس کو محسوس اشیاء سے تشبیہ دینا نہ صرف فن بلکہ فطری اعتبار سے بھی غیر مستحسن ہے! کہیں کہیں تو ایسی تشبیہ کھپ جاتی ہے بلکہ لطف پیدا کرتی ہے مگر اس قسم کی غیر فطری تشبیہوں کی بھرمار شاعری کو مصنوعی بنا دیتی ہے! کسی شاعر کو دریا میں بھنور دیکھ کر، اگر محبوب کی آنکھیں یاد آنے لگیں تو اس سے بڑھ کر اور بدذوقی کی کیا بات ہے! وہ آنکھ جو بھنور اور جزیرے کے مانند ہو گئی، کتنی خوفناک اور بھیانک آنکھ ہو گی۔ گلاب کا پھول بڑی اچھی چیز ہے، لیکن کوئی شاعر محبوب کی ناک کو گلاب کا پھول کہدے، تو یہ تشبیہ کتنی عجیب ہے

جدید نظموں میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا پیوند جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے اور عاشق خود واعظ اور ناصح بن کر محبوب کو نصیحتیں کرتا اور اُس کے سماجی فرائض کو یاد دلاتا ہے، سلیقہ سے بات کہی جائے تو اس قسم کی نظم میں افادیت کے ساتھ لطف بھی پیدا ہو سکتا ہے، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اندازِ بیان کی خامی اس قسم کی نظموں کو "کاواک" بنا دیتی ہے، نہ تو بیچارے سماج ہی کی عکاسی ٹھیک طرح سے ہو پاتی ہے اور نہ غریب محبت کی ترجمانی کا حق ادا ہوتا ہے! ان نظموں میں شاعر ایک "مشین" نظر آتا ہے! "محبت" کی لطافت صنعت، سیاست، فلسفہ اور معاشی مسائل کے بارِ گراں کی متحمل نہیں ہو سکتی! "مقصد و پیغام" اور "رومان" ان کے جدا جدا میدان ہیں، اقبال کی شاعری میں یہ فرق نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

محبت شاعری میں اور خاص طور سے غزل میں اس "لے" اور "آہنگ" کو چاہتی ہے:-

ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد　　قربانِ لبِ یار گئے غنچہ، کہے گل

گویند دل بہ آں بتِ نامہرباں مدہ　　دل آں زماں ربود کہ نامہرباں نبود

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری　　کہ ہم نے آہ تو کی، اُن سے آہ بھی نہیں ہوئی

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار　　جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو　　کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے　　تماشا کامیاب آیا تمنا بیقرار آئی!

اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح　　میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

گرتے گرتے اُن کا دامن تھام لے　　گرنے والے! لغزشوں سے کام لے

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگذر کہیں　　　پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

ایک تو نیناں مدہ بھرے، دوجے انجن سار
لیے باورے! دیت ہیں متوارے ہتھیار

جدید شعراء یا تو اردو فارسی اور ہندی شاعری کے اس سرمایہ سے بے خبر ہیں اور با خبر ہیں تو ان کا ذوق غالباً اس انداز بیان کی پذیرائی کی صلاحیت سے محروم ہے! اُن کے یہاں "محبت" میں بڑی آور دپائی جاتی ہے، جہاں محبت کی رنگین ترجمانی ہے، وہاں عریاں اور ہوسناکی کی وہ شدت کہ شرم وحیا پسینہ پسینہ ہوجاتی ہیں! جدت اور ترقی کی سب سے بڑی علامت خدا اور مذہب پر طنز ہے! اس طرح یہ فنکار موجودہ دُنیا کی غالب اکثریت کی دل آزاری کرتے ہیں!

موقعہ ہو یا نہ ہو، سیاق و سباق اس کی اجازت دے کہ نہ دے، مگر نظم میں کہیں نہ کہیں "لہو کے دیپ" ضرور جلائے جائیں گے! لفظوں کے مفہوم و معنی سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ "نکتہ" اور "نقطہ" کو مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں، ہندی لفظوں کے لانے کا شوق مگر "گمبھیر" اور "گمبھیرتا" کے معنوں کا پتہ نہیں! "لہو" کا استعمال نظموں اور غزلوں میں بڑی کثرت سے ہوتا ہے، مگر اُس کا رنگ یہ ہے ؎

خاکِ رہ آج لئے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم

شاعر کو اس واقعیت سے سروکار نہیں کہ "لہو" سے پرچم کیا بن بھی سکتا ہے؟ ایک خیال ذہن میں آیا اور جھٹ سے نظم کردیا اور پھر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اس قسم کی بے تکی شاعری کو سراہنے اور اُس کی تشریح کرنے کے لئے تنقید نگاروں کی ایک پلٹن موجود ہے!

کاش! جدید نسل دوسروں کی نقالی کی بجائے اپنی زبان اور ادب کے اُن عظیم فنکاروں سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرتی، جو شعر و ادب کی سرزمین کو کہکشاں اور قوسِ قزح بنا گئے ہیں، اور جن کے اندازِ فکر اور طرزِ ادا کا سایہ بھی کسی پر پڑ جائے گا تو وہ صاحبِ ذوق اور اہلِ نظر ہو جائے گا ____ کوئی قنوطیت اور انارکی کے لئے ہی عوام کو اُبھارنا چاہتا ہو، تو اقبال کے اس شعر ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

اس شعر میں تنہا لفظ "مداری" معنویت کا ایک دفتر ہے! لفظوں کو صحیح طور پر سلیقہ کے ساتھ برتنا ہی شاعری کا آرٹ ہے محسن کاکوروی کی مثنوی کے دو شعر ہیں:-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے　　　داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
گویا کے نہا کے آئی فی الحال　　　جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال!

اس اندازِ بیان میں کتنا لطف ہے، کس قدر تازگی اور شادابی ہے۔

”شاہدِ کلیسا“ (Miss) کی تعریف میں اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں:۔

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں — سرکشی ناز میں اتنی کہ گورنر جھک جائیں

چال کی دل کشی کے ساتھ ستاروں کا رک جانا اور ناز کی سرکشی کے ساتھ گورنروں کا جھک جانا اس میں کیا کیفیت ہے، کس قدر لطف اور زورِ بیان ہے، کتنی سچی باتیں ہیں، لفظوں میں کتنی نغمگی ہے اور شاہی شکوہ بھی

اربابِ اقتدار اور عوام کے باہمی تعلق اور ان کی نفسیات پر اکبر الٰہ آبادی کا یہ ایک شعر ے

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

شعر و ادب کا صحیفہ اور منشور ہے! تنہا اس ایک شعر میں اربابِ اقتدار پر طنز ہے، محکوموں کی بیچارگی اور سادہ لوحی کی طرف اشارہ ہے، عبرت و موعظت ہے، پیغام ہے! مقصدیت کے ساتھ اس شعر میں شاعرانہ خوبیاں اس طرح جھلک رہی ہیں جیسے موتی میں آب!

کہنا یہ ہے کہ نورجہاں، جہانگیر کے دور میں حکومت کے کاروبار میں بہت کچھ دخل رکھتی تھی، شبلی نے اس خیال کو اللہ اللہ! کس قدر شاعرانہ قوت کے ساتھ ادا کیا ہے:۔

اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ

جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

صفی لکھنوی نے ”صبحِ بنارس“ پر ایک نظم کہی ہے، جس کا ایک مصرعہ ہے ے

ساریاں قوسِ قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئیں

شاعری کا یہی وہ مقام ہے جہاں فلسفی، مصور اور مغنی کے حواس گم ہو جاتے ہیں۔

جس شاعری کی چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں! اس کے مقابلہ میں جدید شاعری کتنی پھیکی، بے رنگ اور خام و نارسیدہ نظر آتی ہے! شاید اس نوبت پر کہا جائے کہ ”یہ ایٹمی دور“ ہے، زندگی کے نئے نئے مسائل ابھر رہے ہیں، اور زمان و مکان کے فاصلے سمٹتے چلے جا رہے ہیں، آج کے ادیب اور شاعر کا اندازِ فکر اور طرزِ ادا بھی بدل چکا ہے۔

مگر یہ ”معذرت“ اس قسم کی معذرت ہے، جسے ”بدتر از گناہ“ کہا گیا ہے، زندگی کے نئے نئے مسائل جب ابھرتے ہیں، تو کیا اس وقت ادیبوں اور شاعروں کا زاویہ نگاہ ٹیڑھا، سوچنے کا انداز غلط اور اسلوبِ اظہار مضحکہ خیز ہو جایا کرتا ہے؟ ایٹمی دور نے کیا شعر و ادب اور نگارش و انشاء کا سلیقہ اور حسن چھین لیا ہے! سرمایہ داری کی مخالفت اور مزدور کی ہمدردی میں زبان و قلم اور دل و دماغ کیا بوکھلا جایا کرتے ہیں! کیا پچھلے شاعروں اور ادیبوں کو آشوبِ زمانہ سے دوچار ہونا نہیں پڑا، کیا ان کو زمانے سے جراحتیں اور تلخیاں نہیں ملیں، انھوں نے اپنے غم کو شعر و ادب کی زبان میں بیان کیا ہی، مگر اس طرح کہ ”از دل خیزد بر دل ریزد“! بیان کی وہ لذت، کہ ہر شخص نے یہی جانا ——— کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

دعوتِ عمل

ہم نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ حکومتوں کی غفلتوں اور ناانصافیوں کے باوجود 'اُردو زبان پھیلتی اور ترقی کرتی چلی جا رہی ہے مگر "جدید شعر و ادب" کا یہ طوفانِ بدتمیزی اگر کچھ دن تک یوں ہی رواں دواں رہا تو اُردو کی ہردلعزیزی اور مقبولیت کو بڑا صدمہ پہونچے گا۔ اس کی ساری دل کشی اور جاذبیت غارت ہو جائے گی اور اُس کا حسن خاک میں مل جائے گا، اور یہ عروسِ جمیل اپنے چاہنے والوں ہی کے ہاتھوں بے آبرو اور ننگی لُوچی ہو کر رہ جائے گی! اور اس باغ میں جہاں اب تک گل و لالہ اور نسترن و یاسمن اُگتے رہے ہیں، وہاں یا تو خاک اُڑا کرے گی یا پھر ببول، ناگ پھنی اور دھتورا پیدا ہوا کرے گا۔

جن لوگوں کی سمجھ میں ہماری بات آجائے، یا جو اربابِ فکر ہماری طرح جدید شعر و ادب کی بے راہ روی کو محسوس کرتے ہوں اُن کا فرض ہے کہ وہ اصلاح و درستی کے لئے اپنی تمام امکانی قوتیں صرف کر دیں! پرائیویٹ صحبتوں میں، ادبی نشستوں اور عام جلسوں میں اسی موضوع پر مذاکرے ہوں، نئے شاعروں اور انشا پردازوں کو اُن کی غلطیوں پر ٹوکا جائے، نوجوانوں کے سامنے شعر و ادب کے صحیح نمونے پیش کئے جائیں! رسالوں میں مضامین لکھ کر نئی نسل کو بتا یا جائے کہ فلاں فلاں شاعر و ادیب غلط نگار رہے ہے۔ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کی کتابوں میں خاص طور سے نثر و نظم کے وہ منتخب شہ پارے شامل کئے جائیں، جو زبان، بیان اور فکر و خیال کے صحیح نمونے ہوں! جو رسالے والے اپنی غلط روش کی اصلاح نہ کریں، اُن پر اربابِ ذوق کم سے کم یہ تو واضح کر دیں کہ تم زبان و ادب کی خدمت نہیں کر رہے ہو بلکہ انہیں بگاڑ رہے ہو، تم گلفروش نہیں ہو، گھسیارے ہو!

اس جرأت اور عزم کے ساتھ کہ:-

اب مجھے خود ہی بدلنی ہے زمانے کی فضا
آخری بار مرا گردشِ دوراں کو سلام

اصلاح کی کوشش کی جائے، تو انشاء اللہ کامیابی ہوگی! اور یہ جو شعر و ادب کے افق پر دُھند نظر آتی ہے، چھٹ جائے گی!

"فاران" کی قیمت میں واجبی اضافہ

"فاران" نے ناسازگار فضا میں دین و اخلاق اور علم و ادب کی جیسی بھی خدمت انجام دی ہے اُس کا صحیح اندازہ قارئین کرام ہی کو ہو سکتا ہے! اخلاقی پابندیوں کے سبب دینی پرچے بہت سے فوائد سے محروم ہیں جو دوسرے رسالوں کو حاصل ہیں! ——— اللہ تعالیٰ کے فضل سے ماہِ اپریل ۶۲ء سے "فاران" کا چودھواں سال شروع ہو رہا ہے اس شمارے سے "فاران" کے سالانہ چندے میں صرف ایک روپیہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے یعنی اب "فاران" کا چندہ چھ روپیہ کی بجائے سات (۷) روپیہ ہوگا، اور ایک پرچہ کی قیمت پچاس پیسوں (۸/) کی بجائے باسٹھ (۶۲) پیسے (۱۰/) ہوگی!

یقین ہے کہ فاران کے خریدار صاحبان اور ایجنٹ صاحبان تعاون فرمائیں گے! منیجر "فاران"

ماہر القادری

روزہ!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص "ملازم" اور "نوکر" ہے تو ملازمت اور نوکری کے ساتھ ہی یہ تصور فطری طور پر آپ ہی آپ ابھرتا ہے کہ اس شخص سے یقیناً ملازمت کی کچھ ذمہ داریاں وابستہ ہیں، جنہیں وہ پوری کرتا ہے، اور کچھ احکام ہیں جنہیں وہ بجا لاتا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص "نوکر بھی ہو اور کوئی خدمت (DUTY AND SERVICE) اس سے متعلق نہ ہو۔ نوکر غفلت شعار اور کام چور تو ہوسکتا ہے مگر ایسا ممکن نہیں ہے کہ وہ سرے سے نوکری اور تابعداری ہی نہ کرے، مگر اس کی ملازمت اور نوکری بحال رہے۔

اسی مثال پر "بندگی" کا قیاس کیا جاسکتا ہے، بندگی کے معنیٰ ہی اطاعت اور سرفگندگی کے ہیں، یہ اطاعت اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت ہے۔ بندگی اور اطاعت لازم و ملزوم ہیں، بندہ کو اپنے آقا اور مالک اور معبود و رب کا اطاعت گزار اور فرماں بردار ہونا ہی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، بندگی کا نصب العین ہے۔

اللہ تعالیٰ یہ بھی کرسکتا تھا کہ غیب سے صدائیں آیا کرتیں کہ اے میرے بندو! فلاں کام کرو، اور فلاں کام نہ کرو، احکام کی لکھی لکھائی کتابیں بھی نازل ہوسکتی تھیں بادلوں کے ٹکڑوں، درختوں کی چھالوں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر بھی اللہ کے احکام منقوش اور مکتوب ہوسکتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور مشیت کا ملہ نے اس کے لئے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ انسانوں ہی میں سے بہترین کردار و سیرت رکھنے والے نفوس منتخب کئے اور ان پر احکام اور ہدایت نازل فرمائی تاکہ وہ نفوس قدسیہ قولاً اور عملاً اس ہدایت اور احکام کو انسانوں تک پہنچا دیں۔

ہر دور میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت، نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچتی رہی یہاں تک کہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ گرامی پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا، اور حضور خاتم النبیین کے بعد نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اب جسے بھی سعادت و فلاح ملے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ملے گی جس راہ میں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہی صراط مستقیم ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

احکام دین اور مصلحتیں

اللہ کی ذات بے نیاز ہے وہ کسی کی بندگی، اور فرمانبرداری کا محتاج نہیں ہے، اگر (خدانخواستہ) ساری دنیا اللہ تعالیٰ کی منکر اور باغی ہوجائے تو اس انکار و بغاوت اور کفر و بطلان سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور تمام کائنات ہر آن اس کی عبادت کرنے لگے اور ہر لمحہ اس کا ذکر کیا جائے تو یہ ذکر و عبادت، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں رائی کے دانہ کی برابر بھی کوئی اضافہ نہیں کرسکتے، بندگی، عبادت اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں خود بندوں ہی کا فائدہ ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات سود و زیاں سے ماورا اور بے نیاز ہے!

اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں، وہ انسانوں کی فطرت اور ضرورت کے عین مطابق ہیں، ان احکام کے بجالانے سے

انسانوں کے جسم کا روح کا، دین اور دنیا کا فائدہ مدِ نظر ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی غرض و غایت ہی انسانوں کی فلاح و بہبود ہے یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے انسان کو وجود اور زندگی بخشی، تو اس کے ساتھ ہی زندگی بسر کرنے کے لئے "ضابطہ" بھی عطا کیا، اسی ضابطہ حیات کا نام اسلام ہے۔

بندہ کا کام اپنے آقا اور مالک کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت ہے اُس کو اپنے آقا سے یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ اس حکم کی پہلے مصلحتیں اور فوائد بتا دیئے جائیں اس کے بعد حکم کی تعمیل اور فرمان کی اطاعت کی جائے گی، جو کوئی اپنے آقا اور مالک کے حکم کی تعمیل مصلحتیں اور مفادات دیکھ کر اور جان کر کرتا ہے، وہ در اصل اپنے آقا کا مطیع و فرماں بردار نہیں، بلکہ فوائد اور مصلحتوں کا بندہ ہے۔

اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہے اور حکیم کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو دینی اور اخلاقی پابندیاں (تکلیفات) عائد کی ہیں اور جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اُن میں .... یقیناً بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں اور انسانوں کے لئے گوناگوں فائدے پائے جاتے ہیں۔ مگر مردِ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے اس یقین و عقیدہ کے ساتھ سرِ تسلیم خم کرے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، چاہے اُس حکم کی مصلحتیں، اس کی سمجھ میں آئیں، یا نہ آئیں۔

روزہ

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر سال بھر میں ایک مہینہ کے "صیام" فرض کئے ہیں، فارسی میں "صوم" کو روزہ کہتے ہیں، ہندی میں "برت" اور انگریزی میں "FAST" مگر ہندوؤں کا "برت" اور انگریزوں کا "FAST" صوم کی ٹھیک طرح سے ترجمانی نہیں کر سکتے! ان میں مقصد و غایت کے علاوہ احکام کا فرق بھی پایا جاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من صام شہر رمضان ایماناً واحتساباً غفر لہ ماتقدم من ذنبہ۔	جو کوئی ماہِ رمضان کے روزے ایمان اور ثواب کے ارادے سے رکھے اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

رمضان کے روزے گناہ بخشے جانے کا سبب بن جاتے ہیں۔ مردِ مومن کی یہ کتنی بڑی سعادت اور خوش بختی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

کل عمل ابن آدم یضاعف لہ حسنۃ بعشر امثالہا الی سبعمائۃ ضعف۔ قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی یدع شہوتہ وطعامہ من اجلی	بنی آدم کے ہر نیک عمل کا ثواب دس گنے سے سو گنے تک زیادہ دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزے کے سوا، کیونکہ وہ خاص میرے لئے ہے، میں اس کا (اچھا) بدلہ دوں گا،

کیونکہ روزہ دار میرے ہی لئے اپنی خواہش اور کھانے کو چھوڑ دیتا ہے۔

جس نیک عمل کے لئے اللہ تعالیٰ خاص طور سے فرمائے کہ "یہ خاص میرے لئے ہے"۔ اُس عمل کی برکت و ثواب کا کیا پوچھنا۔ نماز زکوٰۃ، حج اور جہاد ایسے اعمال ہیں جو لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ اس لئے اُن میں ریاکاری اور خود پسندی کا بھی امکان ہے مگر روزہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس لئے اس میں ریاکاری اور دکھاوے کے لئے بہت ہی کم گنجائش ہے اسی اخلاص کے سبب غالباً اللہ تعالیٰ نے روزے کے بارے میں فرمایا کہ "یہ میرے لئے ہے"۔ ایک اور حدیث ہے۔

الصیام جنۃ :۔ روزے ڈھال ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ روزہ دار پر تلوار اثر نہیں کر سکتی، اور روزہ دار کا جسم ہر قسم کے گزند سے محفوظ رہتا ہے۔ ارشادِ نبوی کا مفہوم یہ ہے کہ روزہ دار، روزے کے سبب گناہوں سے بچتا رہتا ہے۔ اور اس طرح روزہ اُس کے لئے ڈھال بن جاتا ہے۔ روزہ کی حالت میں سہو و نسیان ہو جائے، تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھوٹ

دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من نسی وھو صائم فاکل وشرب فلیتم صومہ فانما اطعمہ اللہ وسقاہ۔

جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لیا تو اُسے چاہیئے کہ اپنے روزے کو پُورا کرلے، کیوں کہ اسے اللہ تعالٰی نے کھلایا پلایا ہے۔

اللہ تعالٰی کے نزدیک روزہ دار کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بُو بھی اللہ تعالٰی کو پسند ہے۔ حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد ہے۔

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ

جو شخص روزے میں جھوٹ بولنے اور اس پر عمل کرنے سے باز نہ آئے۔ تو اللہ تعالٰی کو اُس کے کھانے پینے کو چھوڑ دینے کی کوئی حاجت نہیں۔

روزہ جسم و رُوح کے تزکیہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ روزہ دار روزہ رکھ کر اور مشقت برداشت کرکے، اللہ تعالٰی کی بندگی اور اطاعت کا ثبوت دیتا ہے، روزہ دار جس طرح کھانے اور پینے اور جماع سے پرہیز کرتا ہے، اسی طرح اُسے جھوٹ اور دُوسری باتوں سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔ ورنہ گناہ کرتے رہنا اور روزہ رکھنا ایک طرح کا فاقہ ہے۔ روزہ کے ذریعہ مردِ مومن کے اندر "تقویٰ" کی صفت پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ صفت قوی بھی ہوتی چلی جاتی ہے، اللہ تعالٰی کے حکم کی تعمیل میں بعض جائز و حلال خواہشوں کا چھوڑ دینا تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی علامت ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ بھی دوسرے مہینوں اور دنوں میں روزے رکھتے تھے۔

جس طرح سونا آگ میں تپ کر "کندن" بنتا ہے اسی طرح روزہ کی مشقت انسان کی سیرت اور کردار کو نکھارتی ہے، روزہ اللہ تعالٰی کے حکم سے خواہشوں کے خلاف ایک طرح کا جہاد ہے، روزہ کی حالت میں آدمی کو اپنے نفس کی خواہشوں پر صبر کرنا، پڑتا ہے، روزہ صبر، شکر اور ضبطِ نفس ان تین صفات کا مظہر ہے۔

روزہ اور جسمانی صحت

روزہ رکھنے سے مردِ مومن کو "ضبطِ نفس" کی عادت ہوتی ہے۔ ضبطِ نفس کے آدمی کی روح پر ہی نہیں جسم پر بھی اچھے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، ضبطِ نفس کرنیوالے شہوات پر حریص نہیں ہوتے۔

روزے کی حالت میں کھانا چھوڑ دینے سے، آدمی کو اس بات کا صحیح طور پر احساس ہوتا ہے کہ "بھوک" کتنی تکلیف دہ چیز ہے اور بھوکے کو کھانا کھلانا کتنی بڑی نیکی ہے، روزہ مسلمان کو بھوکوں، فاقہ زدوں اور ناداروں کی غم خواری پر اُبھارتا ہے۔

وہ جو مشہور کہاوت ہے کہ — کم کھانا اور غم کھانا مردوں کا کام ہے — تو روزہ رکھنے سے آدمی کے اندر سچ مچ قوتِ مردانگی عود کر آتی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ صحتِ جسمانی کا بہت کچھ دارومدار معدہ کے ٹھیک رہنے پر ہے، جس کا معدہ اور ہاضمہ درست نہیں اس کی صحت درست نہیں، اور روزہ "معدہ" میں اعتدال پیدا کرتا ہے، اور ساتھ ہی پانی پینا چھوڑ دینے سے اخلاط کی مفرط رطوبت بھی معتدل ہوجاتی ہے۔ پرخوری کی عادت دراصل ایک طرح کا مرض ہے، جس کے سبب آدمی کے بدن کو طرح طرح کے روگ لگ جاتے ہیں، روزہ پرخوری کی عادت کو چھڑا دینے کا کامیاب گر ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔

اذا فطر احدکم فلیفطر علی تمر فانہ برکۃ فان لم

تم میں سے جب کوئی شخص افطار کرے، تو چھوارے سے افطار

یجد فلیفطر علیٰ ماءٍ فان طہور۔ کرے کیوں کہ اس سے روزہ افطار کرنے میں برکت ہے۔
اور اگر چھوارا میسر نہ آئے تو پانی سے روزہ کھولے اس لئے کہ وہ پاک چیز ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ روزہ افطار کرتے وقت بھی آدمی کو صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے۔ پرخوری کوئی پسندیدہ چیز ہے نہیں۔ چھرے دار بندوق کی نالی کی طرح پیٹ کو بھر لینا ندیدے پن اور بے صبری کی دلیل ہے، یہ عادت روزے کے فلسفہ کے خلاف جا کر پڑتی ہے، صائم (روزہ دار) کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کھانے پینے میں اعتدال کا لحاظ رکھتا ہے اور اس کی ملکوتی قوت، بہیمی قوت پر غالب آجاتی ہے۔ روزہ بدن کی فربہی اور جسم کے موٹاپے کا بہترین فطری علاج ہے۔ روزہ بدن میں چستی پیدا کرتا ہے، جو لوگ افطار کے بعد زیادہ کھانا کھا لیتے ہیں انکے بدن میں چستی کے بجائے گرانی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب تراویح پڑھنے میں بار بار جماہیاں آتی ہیں اور بعض اوقات نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے سارے دن بھوکا رہنے کے بعد زیادہ مقدار میں کھانے پینے سے بدن ہلکا پھلکا نہیں رہتا بھاری ہو جاتا ہے، اور بدن کا یہ بھاری پن نماز کو بے کیف بنا دیتا ہے۔
بھوکا رہنے کے بعد کھانا کھانے میں اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے روزہ اس طرح کھولنا کہ بھوکا رہنے کی ساری کسر پوری کرکے رہیں گے معدہ کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

اندروں از طعام خالی دار تا درا و نورِ معرفت بینی

تو۔ پرخوری "معرفت الٰہی اور صحتِ جسمانی" دونوں ہی کا نقصان ہے۔
اوپر کہا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کسی مصلحت اور فائدے کے بغیر برضا و رغبت کرنی چاہیئے، ایک مسلمان روزہ اس لئے رکھتا ہے کہ روزہ رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ مزید احسان ہے کہ اس حکم کی تعمیل میں روزہ دار کے نفس و روح کے ساتھ اس کے جسم کا بھی تزکیہ ہو جاتا ہے، جس خالق نے روح کو پیدا کیا ہے، اسی نے جسم کو بھی خلق فرمایا ہے اس لئے روح اور جسم دونوں کے حق ادا کرنا اور ان کے درست و صحیح رکھنے کی فکر کرنا بھی، دین ہی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحت مند قوی مسلمان، ایک کمزور و مریض مسلمان کے مقابلہ میں بہتر اور پسندیدہ ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار ساتھیوں اور سرفروش رفیقوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے دشمنوں کے بڑے بڑے لشکروں کو دست بدست جنگ میں جو شکستیں دی ہیں اُس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اللہ اور رسولؐ کے حکم کی اطاعت میں روزے رکھنے کے سبب اُن کے جسم طاقتور اور پھرتیلے ہو گئے تھے۔ دشمنوں پر خدا کے یہ نیک بندے عقاب کی طرح جھپٹتے، شیر کی طرح حملہ کرتے اور صفِ اعداء میں بجلی کی مانند تیرتے ہوئے چلے جاتے، دنیا میں فتح و نصرت اُن کے نام اور کام سے پہچانی جاتی تھی
اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر چلنے اور دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے عزت کا معیار جو "تقویٰ" کو مقرر فرمایا ہے، ہم بھی اسی معیار پر شخصیتوں کو جانچیں اور پرکھیں، اور کسی کی ظاہری شان و شوکت سے مرعوب نہ ہوں۔ العظمۃ اللہ۔۔۔!

افریقہ میں اسلام کی اشاعت

(پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن، اردو کالج ــ کراچی)

براعظم افریقہ کے شمالی علاقے، بنی نوع انسان کے تمدن کے گہوارہ اور قدیم تہذیبوں کے مرکز رہ چکے ہیں۔ یہاں وہ علاقے ہیں جہاں مصر کی عظیم الشان تہذیب حضرت مسیحؑ سے دو ہزار سال پہلے وجود میں آئی جس کی عظمت کے نشانات اب بھی اہرام کی صورت میں باقی ہیں۔ سلطنت روما کے زمانے میں فونیشین کی قائم کی ہوئی قابل قدر سلطنت کارتھیج (Carthage) اسی شمالی افریقہ کے خطہ میں پیدا ہوئی جو ایک عرصہ تک عالمی اقتدار کا خواب دیکھتی رہی۔ بعد ازاں آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں یہ تمام علاقے یکے بعد دیگرے عربوں اور پھر بربری مسلمانوں کے زیر اقتدار آگئے جو اب تک قائم ہیں۔

رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت تاریخ عالم میں ایک واقعہ عظیم ہے۔ آنحضرتؐ اس دنیا میں اس وقت تشریف لے آئے جب کہ ایران اور بازنطین کی قدیم سلطنتیں مسلسل جنگ وجدل کے بعد آخری ہچکیاں لے رہی تھیں۔ جزیرۃ العرب جیسے بیابان اور غیر مانوس خطہ ارض میں ایک ایسی ہستی کا وجود میں آنا جس نے دنیا کی پریشان مادی وروحانی دُنیا کی از سرِ نو تنظیم کی وقت کی یہی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سو سال کے اندر مجاہدینِ اسلام، افریقہ کے اُن ریگستانوں، بیابانوں اور جنگلوں کو عبور کرکے جہاں انسانوں کا گزر مشکل تھا۔ اسلام کا ہلالی پرچم لہرانے میں کامیاب ہو گئے۔

افریقہ کے شمالی مشرق میں ملک حبش واقع ہے۔ تاریخ اسلام اس خطے کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ وہی ملک ہے جہاں حضرت بلالؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے گیارہ مردوں اور چار عورتوں کے ہمراہ، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے (اسیاسی پناہ لینے) پہنچے تھے۔ جس قافلہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، زبیر بن عوامؓ، حضرت عثمانؓ اور انکی بیوی رقیہؓ (جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں) شامل تھے۔ ان مہاجرین کی روانگی کے بعد مکہ معظمہ سے دیگر مسلمان چھپ چھپ کر، وقتاً فوقتاً ہجرت کرکے حبشہ جاتے رہے یہاں تک کہ چند سالوں میں وہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی اور اسلام صرف جزیرۃ العرب تک محدود نہ رہا۔ اس واقعے کے چند سال کے بعد، مسلمانانِ مکہ نے، اہلِ قریش کے ظلم وستم سے تنگ آکر دوسری بار ہجرت کی اس قافلے میں ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتیں شامل تھیں۔ اس طرح اسلام، عرب کے لق ودق ریگستانوں سے نکل کر افریقہ کے دشت وجبل اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں جا پہنچا، جہاں سے اللہ کے بندے، تبلیغ وتلقینِ اسلام کے لئے، شمالی افریقہ کی جانب بڑھنے لگے۔

چونکہ وادیِ نیل کو بازنطین سلطنت کا زرخیز علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اسکندریہ بازنطین کا بحری مرکز تھا اور افریقہ کا شمالی حصہ، جزیرہ نمائے عرب سے ملحق تھا عربوں کی نگاہیں اس علاقہ پر پڑنا ضروری تھیں۔ فاتح اعظم حضرت خالد بن ولیدؓ کی نمایاں عسکری کامیابیوں سے متاثر ہوکر، ۶۳۹ء میں حضرت عمرو بن العاصؓ، ۴۰۰۰ دلیر و جانباز لشکر کے ساتھ فلسطین سے ہوتے ہوئے میدانی علاقوں کو عبور کرکے مصر کے دارالخلافہ اسکندریہ پر حملہ آور ہوئے۔ ۶۴۰ء میں شہرہ آفاق سینٹ مارک اور بلند ترین سر ایم انکی ہیبت سے سرنگوں ہو گئے حضرت عمرو بن العاص نے ہیلیو پولس کو دارالاسلام بنایا اور اللہ کے پاک بندوں نے اس سرزمین

پر پہلی سجدہ گاہ تعمیر کی۔ اسکندریہ کے مغلوب ہونے کے بعد مصر کے زیریں علاقے خود بخود مسلمانوں کے تسلط میں آگئے۔ ۶۴۳ء میں تریپولی کا علاقہ حلقۂ اسلام میں آگیا۔ اور کارتھیج کے لئے مسلمانوں کا راستہ صاف ہوگیا۔ آخر میں ۶۹۸ء میں کارتھیج کی حکومت کا خاتمہ ہونے پر مسلمان ساحل کے ساتھ ساتھ المغرب کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں میں، اور ان بڑے نخلستانوں میں جہاں پانی میسر تھا یا دریاؤں کی وادیوں میں آباد ہو چکی تھی۔ عرب لشکروں کے ہمراہ، ان کے خاندان کے لوگ بھی جنگوں میں شریک رہتے تھے اور جو علاقے فتح ہوتے تھے وہاں جاکر آباد ہو جاتے تھے۔ یا وہاں کے مقامی باشندے اگر اسلام قبول کر لیتے تھے تو بہت سے عرب اشاعتِ دین کی خاطر ان کے ساتھ مستقل طور پر رہ جاتے تھے۔ چونکہ عرب میں معاشی وسائل محدود تھے اور جغرافیائی ماحول کی سختی کی وجہ سے انسانی زندگی بیحد دشوار تھی۔ اس لئے بیشمار عرب، علاقوں کے مفتوح ہونے کے بعد اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کے، افریقہ کے زرخیز علاقوں میں مستقل طور پر آباد ہو گئے لاتعداد لوگ مقامی عورتوں یا ان کنیزوں سے شادی کر لیتے تھے جو جنگ میں دستیاب ہوتی تھیں یا بطور تاوانِ جنگ ملتی تھیں۔ اس سے عرب ایک حکمراں قوم کی طرح نہیں بلکہ اس ملک کے شہری کی حیثیت سے اس قوم میں مدغم ہوتے رہے۔ چونکہ اسلام مساوات کا علمبردار ہے اس نے اسلامی اخوت نے نسل، زبان، اور جغرافیائی امتیازات میں بٹی ہوئی قوموں کو آزادی دلاکر، کلمۂ توحید کے نام پر متحد کر دیا اور افریقہ کی وہ قومیں جو عرصۂ دراز سے پسماندہ اور حقیر تصور کی جاتی تھیں اسلام کی برکتوں سے فضل ترین ہو گئیں۔ ان کے درمیان حاکم و محکوم، امیر و غریب، کالے اور گورے کا امتیاز ختم ہوگیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ افریقہ میں اسلام کی کامیابی، عظمت اور استحکام کا سب سے اہم راز یہی "اسلامی اخوت" ہے۔ مسلمانوں کے ذاتی عمل اور بلند کرداری اور جذبۂ ایمان نے (Hamitic) قوم کو (Semitic) کی طرح دینِ محمدیؐ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ تلوار کے زور سے نہیں بلکہ تبدیلی مذہب میں باہمی خلوص و محبت اور اسلامی اخوت کا زیادہ دخل تھا۔ جہاں جہاں مسلمان لباسِ انکساری و بے نیازی میں پہنچے غیر مذہب کے امرا نے بھی اس انکساری و بے نیازی کو، دینِ نجات سمجھ کر بخوشی قبول کر لیا۔

یہی وجہ ہو کہ عیسائی مذہب جن علاقوں میں صدیوں ۔۔۔۔ میں بھی عوام کے لئے قابلِ قبول نہ ہوا۔ اسلام نے مختصر عرصہ میں اپنا اثر قائم کر لیا۔ بربر ایسی سخت اور جابر قوم نے قرآن پاک کو کتاب الٰہی اور عربی زبان کو زبانِ رائج الوقت تسلیم کر لیا۔ یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی روحانی فتح تھی اور یہ فتح سیاسی فتح سے کہیں زیادہ مستحکم اور دیرپا ثابت ہوئی۔ بربری علاقوں کے عیسائیوں کا مسلمان ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ (St. Augustine & Cyprian, St. Tertullian) کلیساؤں نے یہاں تبلیغ کا آغاز کیا تھا لیکن ساحل سے دور کے خانہ بدوش قبیلے روما یا بازنطینی تمدن سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ اسلام کی روحانی عظمت کو قبول کئے بغیر نہ رہے المغرب سے مسلمانوں نے ہسپانیہ کی جانب رُخ کیا۔ لیکن مسلمانوں کی زیادہ آبادی کوہستان اٹلس کے شمال میں محدود رہی۔ دریائے نیل کی وادی سے لے کر ٹیونس تک، ساحل روم سے ۱۰۰ میل کے اندر تک مسلمان آباد تھے — آب و ہوا کی سختی، معاشی وسائل کی تنگی کی وجہ سے جنوب کی طرف کم لوگوں نے رُخ کیا ساحلی پٹیوں میں مستحکم حکومت قائم ہونے کے بعد، ہسپانیہ ہی ایک ملحق ملک تھا وہاں پیش قدمی ممکن تھی اور وہاں افریقہ کے ریگستانی اور بیابانی خطوں کے مقابلہ میں بہتر زندگی کی امید تھی۔ بحکم موسیٰ ابن نصیر جو ۶۹۱ء سے گورنر تھے۔ ۷۱۱ء میں مشہور جرنیل طارق ابن زیاد ۔۔۔۔ ۷ مسلم سپاہیوں کے ہمراہ، جبل الطارق کے مقام پر اتر پڑے۔ طارق کے مٹھی بھر جانباز سپاہیوں نے سرزمین ہسپانیہ میں جو شجاعت کے کارنامے انجام دیئے۔ تاریخ اسلام میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ چونکہ میرا موضوع صرف افریقہ کے مسلمانوں تک محدود ہے اس لئے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے

فتوحات ان کی آبادی اور اسلام کی اشاعت پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

خلفائے بنو امیہ کے زمانے میں المغرب کا مکمل حصہ، بحر اوقیانوس تک مسلمانوں کا علاقہ بن چکا تھا۔ یہ زمانہ اسلامی تاریخ میں "فتوحات اور توسیع" کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ سے لے کر خلیفہ الولید (یعنی ۶۶۱ء — ۷۱۵ء) تک شمالی افریقہ کے زیادہ تر علاقے مسلمانوں کے زیر اثر آ چکے تھے خلافت راشدہ کے مبارک و کامیاب دور..... میں نوبیا کے شمالی خطے، پورا مصر (یعنی دریائے نیل کا نشیبی طاس) لیبیا اور المہدیہ جو ٹیونیشیا کے جنوب میں واقع تھا، فتح ہو چکے تھے۔

سرزمین مصر کو "دریائے نیل کا تحفہ" کہتے ہیں۔ یہ علاقہ چونکہ نہایت زرخیز ہے۔ اس لئے ہر زمانہ میں تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ مسلمانوں نے جب مصر کو فتح کیا تو یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا اور مہذب دنیا کی تجارت وصنعت و حرفت کا مرکز تھا۔ یہاں کے باشندے کوپٹک ([illegible]) عیسائی نہایت فارغ البال تھے۔ دریائے نیل کے کنارے متعدد بڑے شہر تھے جن میں الفسطاط نہایت مشہور و معروف شہر تھا۔ بقول سر ٹامس آرنالڈ سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۱۶۹ء تا ۱۱۹۳ء) کے دور حکومت میں عیسائی رعایا پر جو کثیر جزیہ کی رقم مقرر تھی وہ بہت کم کر دی گئی اور اس سلطان کے فیاضانہ سلوک کی وجہ سے بے شمار کوپٹک عیسائی مسلمان ہو گئے ایوب کی وفات کے بعد، ایک مشہور جغرافیہ داں کے اندازے کے مطابق اسی وقت تقریباً دو لاکھ مسلمان اور ۱۸ لاکھ عیسائی نشیبی مصر میں رہتے تھے جن میں کوپٹک عیسائیوں کی تعداد ۸۰ فیصد تھی۔

مصر کے جنوب نیوبیا میں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ خلیفہ المعتصم باللہ (۸۳۳ء ۸۴۲ء) کے دور میں دونوں ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم تھے۔

بارھویں صدی عیسوی تک نیوبیا کے عیسائی آزاد رہے گو کہ کئی بار مصر سے فوج کشی کی گئی۔ اس سلسلہ میں جغرافیائی حالات ہمیشہ نیوبیا کے لئے موافق رہے اور مصری فوجوں کے لئے بالائی نیل کی جانب پیش قدمی ناممکن ہو گئی۔ ۱۲۷۵ء میں نیوبیا کے دو شمالی صوبے، مصری افواج کے قبضے میں آ گئے۔ لیکن اس سے چند صدی پہلے نیوبیا کے مختلف صوبوں میں بالخصوص "صوبہ" میں مسلمان خاص طور سے نخلستانوں یا دریائے نیل کے دونوں طرف آباد ہو چکے تھے اور وہ وہاں کاشتکاری یا مویشی پالنے کا کام کرنے لگے۔

تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں جو ہنیا قبائل جو عرب تھے نیوبیا کے جنوب کی جانب جا کر کہستانوں میں جہاں پانی دستیاب تھا آباد ہونے لگے۔ یہ لوگ عموماً چراگاہوں میں کام کرتے تھے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ افریقہ میں اسلام صرف دو قسم کے لوگوں کے ذریعہ پھیلا۔ اول تاجر ملاحوں کے ذریعہ سے یا چرواہوں کے ذریعے سے جو افریقہ کے مختلف گرم گیاہستانی علاقوں، ریگستانوں یا نخلستانوں میں جا کر آباد ہو گئے اور آنے جانے والے قبیلوں اور چراگاہوں سے رابطہ قائم کر کے، اپنے مذہب کو اندرونِ افریقہ میں لے گئے۔ تاجروں اور ملاحوں نے افریقہ کے ساحلی علاقوں میں وہی کام انجام دیا جو اندرونی علاقوں میں چراگاہوں نے کیا۔

ابن بطوطہ چودھویں صدی کے وسط میں "نیوبیا" کے متعلق رقم طراز ہے "کہ اس وقت بھی یہاں عیسائی اکثریت میں تھے گو کہ اس علاقہ کے خاص شہر ڈنگولا (DANGOLA) کا بادشاہ مسلمان ہو چکا تھا۔ وہ بادشاہ ناصر بن قلون (NASIR BIN [illegible]) تھا جس کی وفات ۱۳۴۰ء میں ہوئی وہ مصر کے مملوک سلطان کے زمانہ میں تھا۔

المقریزی کی رائے میں پندرھویں صدی کے اوائل میں "نیوبیا کے عیسائیوں نے دینِ محمدؐ کو صحیح مان لیا اور مسلمانوں کے کمالات پر

بھروسہ کرلیا۔"

ایک پرتگالی پادری جس نے ۱۵۲۰ - ۱۵۲۷ عیسوی میں جبش (Abyssinia) کی سیاحت کی لکھتا ہے: -

"نیوبیا کے رہنے والے نہ تو عیسائی، نہ یہودی اور نہ مسلمان ہیں لیکن ان کا رجحان کسی قدر محمدؐ کی طرف ہے۔ ان کے یہاں کوئی پادری نہیں ہے۔"

۱۱۶۰ء میں مشہور مسلمان جغرافیہ داں الادرکیسی کی تحریر کے مطابق "میرو" اور "باجا" کے علاقوں میں "یوسفی" عیسائی رہتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کے چند سال بعد یہ لوگ مسلمان ہو گئے ہوں اور یہ علاقہ فنج کی مسلمان سلطنت میں شامل کر لیا گیا ہو۔ ۱۴۹۹ء - ۱۵۲۰ء میں سینار کی سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جو نیوبیا کی سرحد اور مشرق میں جبش کی سرحد سے ملتی تھی۔

کتاب عرب فقیہ کے مطابق ۱۵۳۴ء میں، سلطان مغازا نے سینار اور جبش کے درمیانی علاقے پر ۱۵۰۰۰ سپاہیوں کے ہمراہ حملہ کیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تمام سپاہی نیوبیا کے مسلمان تھے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس وقت نیوبیا کے لوگ کثیر تعداد میں مسلمان ہو چکے تھے۔

دسویں صدی عیسوی تک ابی سینیا میں، صرف چند عرب خاندان ساحلی علاقوں میں رہتے تھے۔ ۱۳۰۰ء میں ابوعبداللہ محمود کی قیادت میں ایک تبلیغی وفد، ابی سینیا میں بھیجا گیا۔ دوسرے ہی سال تقریباً دو لاکھ افراد کی فوج جمع کر کے، عبداللہ محمود ذامحارہ کی سلطنت پر حملہ آور ہوا سیفہ ارلاد بادشاہ (۱۳۴۲ء - ۱۳۷۰ء) نے مسلمانوں کو بری طرح کچلا اور تمام مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے سے انکار کیا انہیں جلا وطن کر دیا۔ لیکن ساحلی علاقوں میں مسلمانوں نے طاقت حاصل کرنا شروع کی اور کچھ عرصہ کے بعد ابی سینیا کے عیسائیوں کو اندرونی علاقے سے مار بھگایا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ (Belda maryam) (۱۴۶۸ء - ۱۴۷۸ء) نے اپنی حکومت کا بیشتر دور مسلمانوں سے جنگ کرنے میں گزارا۔

مسلمان زیادہ تر ساحلی علاقوں میں تجارت کرتے تھے یا گلہ بانی کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں یہ لوگ زیادہ تر ابی سینیا کی شمالی سرحدوں کے نشیبی علاقوں میں منتشر طور پر آباد تھے۔ ان کی آبادی بحر احمر سے سیکار تک تھی۔ عدل احمد گراں نے جو ایک "ایجو" پادری کا بیٹا تھا اور مسلمان ہو گیا تھا اپنے آپ کو مضبوط کر کے ۱۵۲۸ء سے لیکر ۱۵۴۳ء تک جبش پر یلغار کرتا رہا۔ اس بابرکت ہستی کی ذاتی کرامات کے باعث بیشمار عیسائی، مسلمان ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے عیسائی امراء اور شاہزادے بھی اسلامی صف میں شامل ہو گئے۔ مشہور عیسائی مورخ آرنالڈ کہتا ہے کہ ۱۵۳۱ء میں، ایک مسلمان جرنیل، عیسائیوں کے ظلم کی وجہ سے عیسائی بن گیا۔ لیکن حقیقت میں، اس نے دین محمدیؐ کو فراموش نہ کیا۔ اس نے عیسائی فوج میں رہ کر تقریباً بیس ہزار مسلمان بنائے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

لیکن پرتگالیوں کی مدد سے، جبشہ کے عیسائیوں نے، سلطان احمد گراں کو ۱۵۴۳ء میں قتل کر دیا اور مسلمانوں کا زور کم ہو گیا مگر عیسائی کلیساؤں کی نااتفاقیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے اسلام نے پھر دوبارہ جڑ پکڑنی شروع کی اور ۱۶۳۲ء کے بعد ملک میں افراتفری کا دور رہا اور مسلمانوں کی آبادی تیزی کے ساتھ جنوب کی جانب بڑھتی رہی۔ سترھویں صدی میں ابی سینیا میں مسلمانوں کی آبادی ۱/۳ ہو گئی۔

جبشہ میں اسلام کی کامیابی کی وجہ، عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا کردار، ان کی بلند اخلاقی اور جذبۂ ایمان تھا۔ مشہور سیاح روپل (Ruppell) کا کہنا ہے کہ جب کبھی کسی ملازمت میں ایماندار آدمی کی ضرورت ہوتی تھی تو سب

پہلے مسلمانوں کو منتخب کیا جاتا تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ مسلمان، عیسائیوں سے زیادہ حوصلہ مند، صاحب کردار، باعمل اور جفاکش تھے۔
مسٹر پلاؤڈن (Plowden) جو ابی سینیا میں حکومت برطانیہ کی جانب سے ۱۸۴۴ء — ۱۸۶۰ء تک کونسل تھے
بیان کرتے ہیں کہ "تین (Tigre) قبیلے جو ۱۶ عرض بلد اور ۱۷½ عرض بلد کے درمیان، مساوی کے شمال مغرب میں آباد تھے۔
گذشتہ سو سال کے اندر مسلمان ہو چکے تھے اور وہ تمام عیسائی تھے۔
۱۸۵۲ء میں (Theodore) بادشاہ کے تخت نشین ہونے پر، مسلمانوں نے راس علی کے زمانہ میں جو وائس ریجنٹ تھے۔ کافی ترقی کی، گو وہ خود عیسائی تھا لیکن اس نے بڑی بڑی ملازمتوں پر مسلمانوں کو مقرر کیا اور اس زمانہ میں وسطی ابی سینیا کی تقریباً نصف آبادی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔"
آگے چل کر کسی مورخوں نے تحریر کیا ہے کہ اس صدی کے آخری حصوں میں بیشتر تجارتی اداروں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور بڑے شہروں میں ان کی اکثریت ہو گئی تھی۔ ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۸۲ء میں، مصر اور ابی سینیا کے مابین جنگ کی وجہ سے بیرونی افواج یعنی مسلمانوں کے خلاف، ابی سینیا کے عوام متنفر ہو گئے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں بادشاہ جان نے ابی سینیا کے تمام پادریوں کی ایک کانفرنس طلب کی اور ۱۸۸۰ء تک اس نے تقریباً ۵۰،۰۰۰ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مظلوم عوام اسلام کی جانب زیادہ راغب ہونے لگے اور خاموشی کے ساتھ بیشمار لوگ مسلمان ہو گئے "اسلام اِن اتھوپیا" کے مصنف کی تحریر کے مطابق تقریباً تین لاکھ عیسائی مسلمان ہو گئے۔ کافہ کا بادشاہ "اٹالیا" مہدی کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا۔
اس نے ۱۸۹۷ء تک عیسائیوں کا مقابلہ کیا لیکن آخر کار شہنشاہ (Menalik) کے ہاتھوں قید ہوا اور عیسائیت دوبارہ ملک حبش میں رائج ہو گئی۔ لیکن اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے عیسائیوں نے پھر گھٹنے ٹیک دیئے۔ متعدد جنوبی قبیلوں نے جو حرار اور سراموں میں آباد تھے اسلام کی فوقیت کو تسلیم کر لیا اور کلمۂ توحید کے قائل ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ امحارہ اور گالا کے بہت سے بت پرست قبیلوں میں اسلام کا نور پھیلنا شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں بڑی تیزی کے ساتھ ابی سینیا کے جنوب میں روڈلف جھیل کے آس پاس اور یوگانڈا میں بت پرست قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔
افریقہ میں رومن صوبے جن میں عیسائی رہتے تھے ساحل سے زیادہ سے زیادہ ۸۰ یا ۱۰۰ میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ جنوب میں صحرائے اعظم کے بیابان، لق و دق ریگستانی علاقے، آبادی کے لئے نہایت موزوں تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب سلطنت روما کے زوال کا آغاز ہوا، تو جنوب کے ریگستانی علاقوں کے غیر اہل کتاب اور ملحد مور، نومیڈین اور لیبیائی علاقے کے قبیلوں نے شمالی ساحلی شہروں پر یلغار شروع کی۔ اور چند سالوں میں ہزاروں کلیساؤں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت ان علاقوں میں عیسائیت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔
لیکن مسلمان مورخوں کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ روما کے زوال کے بعد اور جنوبی قبیلوں کے ہاتھوں کلیساؤں کی بربادی کے باوجود بھی وہاں متعدد گرجا گھر موجود تھے اور شہروں کی آبادی کے بیشتر لوگ عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے۔ یہاں عیسائی مورخ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ شمالی افریقہ میں صرف بت پرست اور ملحد لوگ ہی مسلمان ہوئے، عیسائی تو تھے بھی نہیں، یہ غلط ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے ربط قائم ہو جانے کے بعد، بیشمار عیسائی برضا و رغبت مسلمان ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ جنوب میں بھی اسلام کی شمع روشن کرنے کے ذمہ دار یہی عیسائی تھے۔ یہ بھی کہنا غلط ہے کہ شمالی مغربی افریقہ میں پیش قدمی کے وقت، مسلمانوں

نے تمام کلیساؤں کو برباد کیا اور عیسائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے برعکس تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حرمت ہمیشہ برقرار رکھی اور ضعیفوں، بچوں اور عورتوں پر کبھی بھی ہاتھ نہ اٹھایا، وہ ان کو پناہ دیتے تھے جو ہتھیار ڈال دیتے تھے یا اسلام قبول کر لیتے تھے۔ صرف ان کو قتل کراتے تھے جو مسلمانوں کو قتل کرنے کے ارادے سے آتے تھے یا مزاحمت پر آمادہ ہوتے تھے۔ تاریخ اسلام میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں جب کہ مسلمانوں نے صلح کو جنگ پر ترجیح دی اگرچہ صلح میں ان کا نقصان رہا۔

اب میں آپ کی توجہ بربری علاقوں کے غیر اہل کتاب اور ملحد قبیلوں میں اسلام کی اشاعت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں اس سلسلہ میں نہ زیادہ مواد میسر ہے اور نہ اس کے متعلق قابل ذکر تحقیق ہے، میں اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بربر قومیں ایک عرصہ تک عربوں کی پیش قدمی کا مقابلہ کرتی رہیں۔ آخر ۷۰۳ء میں بربروں کی آخری قوت مدافعت ختم ہو گئی اور بربری پیغامبرہ الکاہینہ نے مسلمان فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور خود لڑتی ہوئی ماری گئی۔ اس طرح شمالی افریقہ کے مکمل حصے پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔ بہت سے بربری باشندے، عربی افواج میں شریک کر لئے گئے اور ان کو برابر کا رتبہ دیا گیا۔ عرب مختلف شہروں میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ان میں بہتوں نے بربری لڑکیوں سے شادی کر لی۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھتی رہی۔

مشہور سپہ سالار

موسیٰ بن نصیر، فاتح اعظم افریقہ نے خلیفہ عبدالملک سے اجازت لے کر، اپنی جیب خاص کی رقم سے بیشمار غلام خریدے جنھوں نے مسلمان ہونے کا وعدہ کیا۔ چند سالوں میں مسلمان غلاموں کی ایک بڑی تعداد موسیٰ بن نصیر کے ساتھ جمع ہو گئی۔ ۷۱۸ء میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اسمٰعیل ابن عبداللہ کو شمالی افریقہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے بربر قوم کو دعوت اسلام پیش کی۔ مختلف تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بربر علاقوں میں، افواج اسلام کو ملا کر چالیس ہزار مسلمان تھے جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں لیکن چند سالوں میں اشاعت اسلام نے اتنا زور پکڑا کہ مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ پہنچ گئی۔ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں "الموراود"...... (ALMORAVID) کی تحریک خاص اہمیت رکھتی ہے جس کی وجہ سے ہزاروں بربر قبیلے آغوش اسلام میں آ گئے۔

شیوخ تبلیغ

گیارھویں صدی کے شروع میں الحاج یحییٰ بن ابراہیم جو "شہناجا" قبیلہ کے سردار اعلیٰ تھے۔ عبداللہ بن یٰسین کے ہمراہ تبلیغ اسلام کے لئے نکل پڑے لیکن صحارا کے علاقہ میں ان کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن یہ حوصلہ مند مرد مجاہد ہمت نہ ہارا اور جنوب کی طرف چلتا رہا۔ آخر میں سوڈان میں پہنچ کر تبلیغ کا کام شروع کیا۔ عبداللہ بن یٰسین اپنے چند شاگردوں کے ساتھ دریائے سینیگل کے کنارے گوشہ نشین ہو گئے۔ وہاں پر ہزاروں افراد، اطراف و جوانب سے آ کر مرید ہوتے رہے۔ اور چند عرصہ کے بعد تمام (Lamtuna) قبیلہ جو شہناجا قبیلہ کا ایک خاص جزو تھا مسلمان ہو گیا۔ جن کی تعداد تقریباً ... اتھی۔ عبداللہ بن یٰسین نے ۱۰۴۲ء میں، اپنے مریدوں کا وفد بنایا جن کو "مرابطین" یا "الموراوڈ" کہتے ہیں۔ اپنے مریدوں کی مدد سے انھوں نے ہزارہا ملحد قبیلوں کو مسلمان بنایا۔ سرٹامس آرنالڈ کا یہ کہنا کہ مرابطین نے وسطی افریقہ اور سینیگل کے علاقوں میں ملحدوں اور مشرکوں کو زبردستی مسلمان بنایا سراسر لغو ہے۔

عبداللہ بن یٰسین کی وفات ۱۰۵۱ء میں ہوئی لیکن وہ تحریک ان کے بعد بھی زندہ رہی جس کی برکت نے منتشر قومیں اور قبیلے، پرچم اسلام کے تحت آ کر روحانی، مادی اور سیاسی اعتبار سے منظم ہو گئے تھے۔ وہ قبیلے جو نیم وحشی تھے، غیر متمدن اور غیر مہذب تھے، اسلام نے ان کو ایک مہذب قوم کی شکل دی۔

"ڈان آف ماڈرن جغرافیہ" میں بیزلے لکھتا ہے" کہ الادریسی نے ۱۱۶۰ء میں جب اسی خطہ میں سیاحت کی تو وہاں مسلمانوں

ی تعداد کافی تھی لیکن باشندوں پر الحاد غالب تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود بھی۔ بہت سے قبیلوں کے رسومات وہی پرانے تھے۔
بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک دوسری تحریک "الموحد" (Almohads) سے بھی اسلام کو بے حد تقویت پہنچی۔ تحریک الموحد کے بانی و روح رواں ابن طومرت نے بربری زبان میں اشاعت اسلام شروع کی۔ پندرھویں صدی عیسوی تک اس علاقہ کے تمام باشندے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

۱۲۳۹ء میں قرطبہ سے مسلمانوں کا اخراج شروع ہوا۔ اور ۱۴۹۲ء میں قوحید کے علمبرداروں کو "الوداع یا ہسپانیہ" کہنا پڑا۔ ہسپانیہ جہاں مسلمانوں نے تقریباً ۶۰۰ سال تک مستحکم حکومت کی جن کی ہیبت سے فرانس اور جرمنی و برطانیہ کے شہنشاہ لرزتے تھے باہمی اختلافات کی وجہ سے سیاسی اقتدار ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہسپانیہ کے المناک واقعہ نے تمام دنیائے اسلام میں نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ ہسپانیہ سے آئے ہوئے مظلوم مہاجروں نے شمالی افریقہ میں ترویج اسلام کی اشاعت میں نمایاں کام انجام دیا۔ مظلوم مسلمانوں کے لرزہ خیز واقعوں اور عیسائیوں کے ظلم و تشدد کی داستانوں سے قبیلے بہت متاثر ہوئے اور اس کا رد عمل یہ ہوا کہ کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے۔

ہسپانیہ کے عیسائیوں کے ظلم و تشدد سے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں المغرب میں نئی سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ مراقش سے نور اسلام سوڈان کی نیگرو قوموں میں پھیلنا شروع ہوا۔ کثیر تعداد میں بربری مسلمان، پرانے کارواں کے راستے شمال سے وسطی افریقہ میں آنے جانے لگے بہت سے مسلمان تاجروں نے مغربی افریقہ میں بحر اوقیانوس کے ساحل پر اسلام کی اشاعت شروع کی لیکن وہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی۔ کیونکہ شمالی مغربی ساحل کی ہوائیں جنوب کی طرف جانے کے لئے موافق تھیں لیکن، بادبانی جہازوں کی واپسی پر تند ہوائیں چلتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی افریقہ سے مسلمانوں کے تبلیغی وفود، شمالی مشرقی علاقوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مراقش اور ایشیا سے اور وسط افریقہ کے تجارتی شہروں تک قافلے جاتے تھے۔ ان قافلوں کے ساتھ مسلمانوں کو تبلیغ کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔
بربری مسلمان، جنھوں نے سینیگل اور نائیجیریا دریا کی وادیوں میں شمع اسلام روشن کی تھی، رفتہ رفتہ اشاعت کے لئے گھانا اور سانگھے کے بت پرست علاقوں میں داخل ہونے لگے۔ شہنا تجا کے دو قبیلے لمتونا اور جدالا جو پہلے سے مشرف باسلام ہو چکے تھے، نہایت جوش و جذبہ کے ساتھ تبلیغی کاموں میں بربری مسلمانوں کے ساتھ رہے۔

سلطنت مراقش کے بانی یوسف بن تاشفین (۱۰۶۲) کے زمانہ میں اشاعت اسلام کا خاطر خواہ کام ہوا۔ ۱۰۷۶ء میں گھانا حکومت نے مسلمانوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور قبیلہ (Soninke) کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے لیکن تیرھویں صدی میں اس پر مینڈنگو (Mandingo) کا قبضہ ہو گیا۔ سونگھے کی قدیم سلطنت کا پندرھواں فرمانروا (Za Kam) نے (۱۰۰ء - ۱۰۱۰ء) بغیر کسی سیاسی دباؤ کے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۰۴۳ (۴۳۵ ہجری) میں مغربی سوڈان میں جینی (...) کی بنیاد رکھی گئی تھی جو چند سالوں میں، ایک مشہور تجارتی اور تبلیغی مرکز بن گیا۔

دریائے نائیجیریا، صحرائے اعظم کے جنوب مغرب میں سب سے بڑا دریا ہے۔ فرانسیسی گنی کے پہاڑوں سے نکل کر، سوڈان جمہوریہ، نائیجر اور نائیجیریا سے ہوتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ اس دریا میں مستقل پانی رہتا ہے اور اس کے کنارے کئی بڑے بڑے شہر پائے جاتے ہیں۔ دریائے نائیجیریا کی وادی نہایت زرخیز اور شاداب ہے۔ جنوب میں، دہانہ سے سو میل کے فاصلہ پر استوائی گھنے جنگلات میں سے گزرتا ہے۔ اس دریا کے شمالی حصہ میں جہاں اطراف و جوانب سے کارواں کے راستے ملتے تھے۔

مسلمانوں نے ۱۱۰۰ء میں ٹمبکٹو کا شہر آباد کیا جہاں سے مغرب میں ڈاکر، جنوب میں عکرہ، مشرق میں زندر کے تجارتی شہروں کا فاصلہ تقریباً یکساں تھا۔ شمال سے تقریباً تمام قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ یہ شہر تھوڑے عرصہ میں کارواں کی رہائش گاہ اور ایک تجارتی اور ثقافتی مرکز بن گیا (Jenne) کا بادشاہ کُن بورو (Kunburu) ۱۲۰۰ عیسوی میں مسلمان ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ شہر کی تمام رعایا مشرف باسلام ہوگئی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے مسلمان ہونا طے کیا تو اپنی سلطنت کے تقریباً ۴۲۰۰ علما کو جمع کیا۔ بقول آرنالڈ یہ تعداد مبالغہ آمیز ہے لیکن اس سے ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے واقعی اس کی سلطنت میں کافی اثر قائم کر لیا تھا۔ اس نے اپنے محل کو مسمار کر کے ایک عظیم مسجد تعمیر کی ٹمبکٹو رفتہ رفتہ ثقافت اسلامی کا مرکز بن گیا۔ ابن بطوطہ جو چودھویں صدی عیسوی کے وسط سے گزرا تھا۔ وہ حبشیوں کے صوم وصلوٰۃ اور قرآن کی تعلیم کے بارے میں تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جمعہ کو اگر کوئی وقت سے پہلے نہ پہونچے، تو مسجدوں میں جگہ ملنی مشکل ہوتی تھی۔

اس زمانہ میں مغربی سوڈان کی سب سے بڑی قوت مالی (Malli یا Melle) تھی (Mandingos) نے جب مملکت گھانا فتح کیا۔ تو اسلام کی شہرت قرب وجوار کے ملکوں میں پھیل گئی (KANO) کانو کرانیکل کے مطابق ہوسا لوگوں میں اسلام کی شمع مینڈنگوز (Mandingo) نے روشن کی۔ بقول مشہور مورخ پامر (Palmer) ہوسا کا پہلا مسلمان فرمانروا ۱۴۵۶ء میں زورو ہوا۔ ہوسا لوگ نہایت ہی ذی فہم چست اور عقلمند تاجر تھے جو بری اور بحری تجارت میں ماہر تھے۔ اپنے پیشہ کے سلسلہ میں جہاں بھی وہ گئے، تبلیغ اسلام کو کبھی بھی فراموش نہ کیا اس زمانہ میں بھی ہوسا تاجر ساحل گنی سے لے کر قاہرہ تک پائے جاتے ہیں۔

چند مورخوں کی تحریر کے مطابق، ہوسا میں اسلام کا تعارف مشہور صحابی الفزاری نے کیا تھا۔

۱۱۷۱ء میں فاطمی خلفا کے زوال کے بعد، ہزاروں عرب سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے، مصر سے سینکڑوں میل ریگستانی علاقوں سے سفر کر کے، مشرقی سوڈان میں آباد ہوگئے۔ مشرقی سوڈان اور کردفان کے تاجر فخریہ اپنے کو عربی النسل کہتے ہیں۔

چاڈ جھیل کے شمال اور مشرق میں بھی اسلام، مصری عربوں کے ذریعہ پھیلا۔ منتشر قبیلے رفتہ رفتہ متحد ہوکر ایک بڑی قوت کے مالک ہوگئے اور مشرق میں مصر اور نیوبیا تک اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی کانیم کا پہلا مسلمان فرمانروا، غالباً گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں یا بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں نظر آتا ہے۔

جھیل چاڈ کے ملحق علاقوں میں گلہ بانی خاص پیشہ ہے۔ یہ علاقہ افریقہ کے تقریباً وسط میں ہے۔ اس کو افریقہ کا "دل" کہا جاتا ہے تو مناسب ہوگا۔

سردی کے ایام میں شمال سے، خانہ بدوش قبیلے، جنوب کی جانب چلے آتے تھے اور ان کی معرفت بہت سے جنوبی خانہ بدوش قبیلوں نے رابطہ حاصل کر کے، اسلام قبول کیا لیکن چاڈ کے جنوب میں، تیرھویں صدی عیسوی کے بعد اشاعت اسلام کی رفتار قدرے سست پڑ گئی۔ کیوں کہ یہاں سے گرم گیاہستان کے علاقے شروع ہوتے ہیں۔ جہاں انسانی وسائل نہایت محدود تھے اور آبادی بہت کم وہ بھی غیر مستقل تھی۔

مسلمانوں نے جب کبھی اخوت اسلامیہ کو فراموش کر کے، آپس میں نفاق پیدا کیا، اپنے کمزور دشمنوں کے ہاتھوں زک اٹھائی بغداد فلپائن، ہسپانیہ، ہندو پاکستان، ایشائی ترکستان اور نہ معلوم کتنے ممالک ہیں جہاں مسلمانوں نے اپنی شخصی اور دنیاوی اقتدار کی

خاطر، بے شمار مسلمانوں کا کشت و خون کیا، اور آخر خود بھی فنا ہو کر اسلام کے مُبَرک نام پر ہمیشہ کے لئے داغ رسوائی چھوڑ گئے افریقہ کی سرزمین
اس قسم کے افسوسناک سانحوں سے پاک نہیں ہے، سلطنت مالی تیرھویں صدی عیسوی میں گھانا کی قبر پر بنی۔ جو سولھویں صدی میں سونگھے (   ) کے ہاتھوں خود بھی فنا ہو گئی جس نے مسلمانوں کی ذہنیت، تبلیغی جذبہ، اخوت اسلامیہ پر کافی اثر ڈالا،
وہ اسلام، جو نہایت کروفر، تزک و احتشام کے ساتھ، کافروں اور ملحدوں کی سرزمین میں، توحید الٰہیہ کی تبلیغ کے لئے آیا تھا اس کی ترقی کی راہیں، ایک عرصے تک، آپس کی خانہ جنگی کی وجہ سے مسدود رہیں۔

اسلام نے ۱۵۹۶ء میں چاڈ کے مغرب اور جنوب میں بلیش قدمی کی اور سلطان ابن عبداللہ (۱۵۶۸ء - ۱۶۰۸) کے دور میں باغرمی اور وداعی تک مسلمانوں کی آبادی شروع ہو گئی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں، افریقہ میں اسلامی تبلیغ کی تاریخ بہت مختصر ہے اس دور میں، مسلمان بادشاہ اپنی ذاتی شان و شوکت میں، اور مسلمان عوام اپنے معاشی حالات میں ایسے منہمک رہے کہ جذبۂ ایمان سرد پڑتا چلا گیا
لیکن وہابی تحریک سے کم از کم حبشی قومیں ضرور متاثر ہوئیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں، فُلبے قوم کے ایک مصلح اور مجاہد شیخ عثمان ڈنفودیو نے مکہ معظمہ کی زیارت کے بعد، اشاعت اسلام کا بیڑہ اٹھایا۔ وہابی عقیدہ سے متاثر ہو کر، اس نے فلبے قوم کے منتشر چرواہوں اور خانہ بدوش قبیلوں کو منظم کیا۔ ایک مشہور سیاح جس کو ۱۷۳۱ء میں گیمبا میں ان لوگوں کی آبادی میں جانے کا موقع ملا تھا۔ کہتا ہے کہ "دریا کے کنارے کے تمام ملکوں میں گندمی رنگ کے آدمی رہتے ہیں جن کو فوکی (Phoney) یا پیرا رہ Fulbe کہتے ہیں، عربوں کے مشابہ ہیں۔ ان میں قرآن کی تعلیم عام ہے لوگ عموماً منظم آبادی یا آزاد قبیلوں میں رہتے ہیں، یہ لوگ بہت زیادہ محنتی اور جفاکش ہیں۔ مکئی اور کپاس اپنی ضرورت سے زیادہ اگاتے ہیں یہ وہی قبیلے ہیں جو (Hausa) ہوسا کے مختلف ریاستوں میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۰۲ء میں گوبر (Gobir) کی بیگان حکومت نے ڈنفوڈیو کی سربلندی تسلیم کر لی، اور ۱۸۱۶ء میں اس کے انتقال سے پہلے، ہوسا کے تمام علاقے، اسلامی تسلط میں آ گئے تھے۔ ۱۹۰۰ء تک، انگریزوں کی آمد سے پہلے نائجیریا میں اسلام کا پرچم نہایت شان و شکوہ کے ساتھ سربلند رہا۔
صحرائے اعظم کے جنوب مغرب میں دریائے نائجیریا اور سینیگل کی وادیاں نہایت سرسبز اور شاداب ہیں۔ اس علاقہ میں آبادی گنجان ہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں بڑے بڑے قصبے دریاؤں کے کنارے پائے جاتے تھے آباد علاقوں میں، اسلام نے بڑی تیزی سے جڑ پکڑ لی تھی۔ جہاں سے تاجروں نے دیہی علاقوں میں اسلام کی شمع روشن کی۔ ایک عیسائی پادری کی رپورٹ ہے کہ "جہاں ۱۸۹۸ء میں شہر "عِدّہ" (Ibadan) کے جنوب میں کم مسلمان نظر آتے تھے اب وہ ابو (Ibo) کے جنوبی علاقوں کو چھوڑ کر ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔
اس حساب سے ۱۹۱۰ء تک شاید ہی کوئی ملحدوں کا گاؤں باقی رہ جائے یہ وہ علاقے ہیں جہاں ہزار ہا بے دینوں نے بغیر جنگ و جدل، برضا و رغبت اسلام کو قبول کر لیا۔
مکہ مکرمہ کے احمد بن ادریس قادریہ کے روحانی پیشوا نے ۱۸۲۵ء میں اپنے انتقال سے پہلے، اپنے ایک شاگرد محمد عثمان الامیر غنی کو افریقہ میں، تبلیغ و تلقین کے لئے بھیجا، جو اسوان ہوتے ہوئے ڈنگولا پہنچا۔ اور پھر وہاں سے کردوفان اور سینار کے نواحی خطوں میں، اسلام کی تعلیم دینی شروع کی، جنوبی افریقہ میں، قادریہ اور تجانیہ ہی اسلام کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ اس وقت کالکا، ٹمبو، مسار دو خاص تبلیغی مراکز ہیں۔ جہاں سے ملحد قبیلے جو تاریخی دور میں، غیر منظم اور غیر متمدن تھے، وہ اسلامی اخوت، تمدن، اخلاق، سیرت و کردار، معاشرہ اور ثقافت سے متاثر ہو کر، تہذیب کی دنیا کے علمبردار ہوتے جا رہے

ہیں. اور مستقبل کی "امیدِ نو" ہیں۔

تجانیہ کے سلسلہ میں الحاج عمر کا نام قابل ذکر ہے وہ ۱۷۹۷ء میں جنوبی سینیگال کے پوڈر مقام میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۲ء میں حج بیت اللہ سے تشریف لانے کے بعد اپنے عقیدہ کی اشاعت میں جان کی بازی لگادی۔ ۱۸۴۱ء میں فوطہ جلان پہنچے اور سینیگال اور شمالی نائجیریا کے ہزاروں بیگان قبیلوں کو مسلمان بنایا۔ اس قسم کی تحریک کی ابتدا گیمبیا میں ہوئی۔ امام احمد وصمد و یاموری نے اسلام قبول کیا اور اپنی ذاتی اثر اور کوششوں سے نائجیریا کے شمالی حصے میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی۔ ان کی سلطنت میں بیشمار ملحدوں نے اسلام قبول کیا۔ ۱۸۸۱ء میں وہ اپنے اقتدار کے عروج پر پہنچے اور ۱۸۹۸ء میں فرانسیسیوں نے اس کو گرفتار کرلیا ۱۹۰۰ء میں اُس جانباز شیر اسلام کی وفات کے بعد، اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۸۳۷ء میں الجیریا کے سیدی محمد بن علی السنوسی نے، اسلامی اشاعت کے لئے ایک مذہبی سوسائٹی قائم کی۔ اپنے پیرووں اور مستفیدین کی مدد سے، بہت بڑی طاقت حاصل کرلی، ان کا انتقال ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ سنوسی کا تبلیغی مرکز، لیبیا کے ریگستان "جغابیب" میں تھا جہاں سے ہزاروں مبلغین ٹریننگ حاصل کرکے، شمالی افریقہ کے گاؤں گاؤں میں پھیل گئے۔ انھوں نے تھوڑے عرصہ میں اپنے ہم نسل اور ہم زبان قبیلوں میں کافی کامیابی حاصل کی۔ جغرافیائی ماحول کی سختی کو برداشت کرکے صحرائے اعظم کے تپتی ہوئی دھوپ اور بادسموم کی شدت برداشت کرکے، اپنے فرضِ منصبی اور احکام الٰہی کی تبلیغ میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان میں، کبھی خانہ بدوش اور لامذہب طبقوں میں، کبھی چلتے پھرتے تاجروں اور گمراہ انسانوں میں، پیدل مسافت طے کرکے، دریاؤں، خونخوار جنگلوں، بیابانوں اور کوہستانوں کو عبور کرکے، اللہ تعالےٰ کا پیغامِ حق سُناتے رہے۔ اور انکی یہ کوشش بہت بارآور ہوئی۔

اسلام، تمام جغرافیائی حدبندیوں سے بالاتر ہے۔ جس میں نسل، زبان، طبقہ، یا قبیلہ کا امتیاز نہیں ہے، حقیقت میں سرزمین افریقہ میں، اسلام کی ہردلعزیزی کا یہی راز ہے اسلام افریقہ کے پسماندہ انسانوں کے لئے رحمت ابدی بن کر آیا اور ان کو تمام جاہلانہ قیود اور رسموں سے نجات دلائی اور چند صدیوں میں، غیر مہذب قبیلوں کی روحانی، سماجی، معاشی، ثقافتی نظام کو یکسر تبدیل کرکے، مہذب قوموں کی صف میں کھڑا کردیا۔ قدرتی ماحول کے مطابق زندگی سنوارنے اور وہاں کے معاشی وسائل سے مستفید ہونے کا طریقہ سکھایا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ قومیں جو اپنے کو پسماندہ اور حقیر تصور کرتی تھیں اپنی اصلی حقیقت سے آگاہ ہوکر، اپنے نظامِ معیشت کو بدل ڈالنے میں کامیاب ہوگئیں۔

اب میں آپ کی خدمت میں گنی کے ساحلی ممالک، سیرالیون اور لائبیریا کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جہاں اس وقت مسلمانوں کی آبادی (heathen) یعنی لامذہب باشندوں سے زیادہ ہے۔ اس سلسلہ میں ۱۸۰۲ء میں، برطانیہ کے ہاؤس آف کامنس کا آرڈر پیش خدمت ہے۔ "تقریباً ۷۰ سال پیشتر، چند مسلمان سیرالیون کے تقریباً چالیس شمال میں آباد ہوئے تھے جو (mandingo) میڈنگو علاقے سے آئے تھے۔ انھوں نے عربی مدارس قائم کئے۔ مہلک بیماریوں اور غیر موزوں آب و ہوا کے باوجود، ساحلی خطوں میں آباد ہوگئے جہاں ان کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ یہ لوگ کاشتکاری یا ماہی گیری کا کام کرتے تھے۔ یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ دس پندرہ سال میں، تمام نوآبادیات میں مسلمانوں کا غلبہ ہوجائے گا۔ سیرالیون کے تقریباً ۱۰۰ میل جنوب مینڈی (mande) ملک میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے حال میں قدم رکھا ہے لیکن پھر بھی اس کی اشاعت بڑے زوروں پر ہے۔ مسلمانوں میں عیسائیوں کی مانند کوئی خاص

پادریوں کا طبقہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان مبلغ ہے اور مذہبی اعتقاد اور ایمان میں کامل ہے۔ وہ جہاں چاہتے ہیں ایک معمولی سی مسجد بنا دیتے ہیں۔ گنی کے ساحل پر، اسلام کی اشاعت کے ذمہ دار، ہوسا تاجر ہیں جو عموماً تمام تجارتی شہروں میں پائے جاتے ہیں، جہاں کہیں آباد ہوتے ہیں اپنے مذہب کی گفتگو کرتے ہیں۔ اسلامی اخوت، اخلاقی برتری، جذبہ ایمان اور اعلیٰ ثقافت سے متاثر ہو کر، مقامی باشندے، بغیر کسی دباؤ کے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

اشانتی (جنوبی گھانا) میں مسلمان ۷۰ء ۵۰،۰۰۰ سے آباد ہیں لیکن یہاں اشاعت اسلام کی رفتار بہت سست رہی ہے بقول سی۔ الیس۔ سالمن وہ زمانہ دور نہیں ہے۔ جبکہ چھوٹے بڑے طبقوں کے تمام لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔ وہومی اور گھانا میں اس وقت ملحدوں کی اکثریت ہے لیکن ان کا حلقہ اسلام میں آنا صرف وقت کی بات ہے۔ لے گوس میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً نصف ہے جو زیادہ تر صاحب اقتدار ہیں۔

یہ لوگ اعلیٰ حبشی نسلوں یعنی قلبے، منیڈنگو، ہوسا کے لوگ ہیں۔ جن کو استعماری حکمران نہایت عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسلامی برادری میں حبشیوں کے داخلہ کے سبب وہ عزت انکے لئے بھی ہے جس کے وہ مدت سے خواہاں تھے۔ اس طرح بہت سے حبشی مسلمان ہو کر، اسلامی برادری کو یگانگت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایک مورخ (Banydan) (دبیدان) کا کہنا ہے کہ دریائے سینیگال سے لے گوس تک ساحلی علاقوں میں کوئی ایسا شہر نہیں ملے گا جس میں مسلمان باشندے نہ رہتے ہوں اور ان کی ایک یا دو مسجدیں نہ ملتی ہوں۔ اکثر اوقات عیسائی اساتذہ کے ساتھ بھی کام کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

اب میں آپ کی توجہ مشرقی افریقہ کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جہاں کے باشندے اس علاقے سے مربوط رہے ہیں جہاں سے اسلام کی شمع چہار دانگ عالم میں روشن ہوئی۔ میرا مطلب سرزمین عرب سے ہے۔

مشرقی افریقہ میں عربوں کی آبادی کے متعلق، زیادہ مواد نہیں ہے۔ ایک عربی رسالہ کے مطابق جس کو پرتگالیوں نے شہر کیلاوٗ (Kilwa) کے مقام پر پایا تھا جس کو مشہور پرتگالی قزاق ڈان فرمینسکو ڈی المیڈا نے ۱۵۰۵ء میں تاخت و تاراج کر دیا تھا۔

اس علاقہ میں سب سے پہلے آباد ہونے والے چند اعرابی تھے جو اپنے کو "امۃ زید" کہتے تھے۔ یہ لوگ غالباً ۷۵۰ء سے ۸۰۰ء عیسوی کے درمیان آباد ہوئے تھے لیکن مشرقی افریقہ کے جنگلی قبیلوں اور خونخوار درندوں کے خوف سے زیادہ تر ساحلی علاقوں میں آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ کچھ کاشتکاری، گلہ بانی، ماہی گیری یا ساحلی علاقوں میں تجارت کرتے تھے۔ جنگلوں سے حاصل کئے ہوئے سامان ہاتھی دانت، خام دھات، لکڑیاں، گوند وغیرہ کی تجارت کرتے تھے۔ بحرین اور خلیج فارس کے مغربی ساحلی علاقوں سے جو جزیرہ نما عرب کا حصہ تھا۔ لاتعداد تارک الوطن مسلمان آکر آباد ہوتے رہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں نے پہلا شہر بنام مقدیشو تعمیر کیا۔ چند ہی دنوں میں مقدیشو کی طاقت کافی بڑھ گئی لیکن مقدیشو کے شیعہ حکمرانوں اور نئے تارک الوطن سنیوں کے باہمی تنازعوں نے نازک صورت اختیار کر لی۔ مجبوراً سنیوں نے اندرونی خطوں میں دوبارہ ہجرت کی۔ انھوں نے مقامی باشندوں میں شادیاں کر لیں اور انہی میں ضم ہو گئے اور ان کے طریقے اور رسومات اختیار کر لئے۔ مقدیشوں کی تعمیر دسویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی تھی اور ستر سال تک ساحلی شہروں میں سب سے طاقتور رہا۔

شیراز کے سلطان حسن کے ایک صاحبزادہ نے جس کی ماں حبشن تھی اپنے بھائیوں کی بدسلوکی سے بیزار ہو کر اپنے چند

ساتھیوں کے ہمراہ جزیرہ اُرمز کو خیرباد کہا زنجبار سے ہوتا ہوا، کیلاؤ میں آباد ہوا۔ جہاں ان لوگوں کیلاؤ کا شہر تعمیر کیا۔ اس طرح بہت سے تارکِ لوطن عربوں کے آباد کئے ہوئے شہر، مشرقی افریقہ کے ساحل پر خطِ جدی تک ملتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کے جغرافیہ داں، ان علاقوں کو "زنج" کے نام سے موسوم کرتے تھے نئے آباد ہونے والے مسلمان "زنج" کے پیگانوں کو حلقۂ اسلام میں لانے میں، کہاں تک کامیاب ہوئے تھے اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ پرانی کہانیوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا ذمہ دار خود یہاں کا پیگان حکمراں تھا جو مسلمان ہوگیا تھا۔ ۹۲۲ء میں، ایک عرب جہاز، طوفان کی زد میں آکر زنج ساحل پر پہنچا۔ یہاں کے بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور کئی مہینے رہ کر، یہ مسلمان تاجر، اپنے ملک کو روانہ ہوئے۔ بادشاہ خود چند ملازموں کے ساتھ، ان کو جہاز تک چھوڑنے آیا لیکن یہ لوگ ان کو گرفتار کرکے، بصرہ اور وہاں سے بغداد لے گئے۔ وہ بادشاہ مسلمان ہوگیا۔ بعد ازیں وہ حج کے لئے مکہ معظمہ پہنچا اور بصرہ ہوتا ہوا اپنے ملک کو واپس لوٹا۔ چنانچہ اس علاقہ کو، اسلام کی شمع روشن کرنے کا ذمہ دار خود بادشاہ تھا[1] کثیر تعداد میں عرب تاجروں کے ملاپ کے باوجود، اس علاقہ کے اصل باشندے، اسلام سے متاثر نہ ہوسکے تھے، سولھویں صدی عیسوی میں، پرتگالیوں کی آمد سے پہلے مسلمانوں کی آبادیاں ساحلی پٹیوں تک محدود تھیں۔ پرتگالیوں کے زوال کے بعد بھی جب ان علاقوں میں عمان کے سیّدوں کی حکومت ہوئی تو بیسویں صدی عیسوی تک نغلہ اور شمالی قبائل کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ لامذہب تھے۔ ہوا۔ پانی۔ سورج اور چاند کو پوجتے تھے۔ ان علاقوں میں عرب اپنے تجارت پیشے میں منہمک رہے اور اسلام کی کوئی خاص خدمت نہیں کی۔ البتہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں، یوگانڈا کے قوی الجثہ قبائل یوگانڈا لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔

سلطان مونتیسا کے دور میں، بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔ لیکن ۱۸۷۵ء میں اسٹینلی کے ورود نے حالات کو بدل دیا اس کے دوسرے سال بہت سے عیسائیوں کے تبلیغی وفود کے آنے پر، مسلمانوں کی تعداد رفتہ رفتہ گھٹتی رہی۔ عیسائیوں نے مقامی باشندوں کو، روپیہ اور سامان اور بہتر معیارِ زندگی کا لالچ دے کر، عیسائیت کی جانب راغب کیا۔ انگریزوں نے جب یوگانڈا پر قبضہ کرلیا تو مسلمانوں کو دینِ اسلام پھیلانے کی ممانعت کردی گئی۔ اس کے باوجود، مشرقی حصہ میں، مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ اور اس وقت مسلمانوں کی وہاں اکثریت بتائی جاتی ہے۔ گانڈا کے شمالی حصے میں، جہاں بوسوگو معادن کا زرخیز علاقہ ہے، مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے اور وہ دولت مند بھی ہیں۔ مشرقی استوائی افریقہ میں عربوں نے اسلام پھیلانے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔ ان کی آبادیاں زیادہ تر ساحلی علاقوں تک محدود تھیں۔ وجہ یہ ہے کہ عربوں کے لئے غلاموں کی تجارت، مسلمانوں کی آبادیوں میں ممکن نہ تھی۔ ان کا تجارتی مفاد اسی میں تھا کہ پیگانوں میں اسلام نہ پھیلائیں۔ غلاموں کی تجارت کے خاتمہ کے بعد، اور مشرقی افریقہ میں یوروپی حکومت کے آنے کے بعد جب کہ اندرونی ملک میں سیاسی حالات زیادہ مستحکم ہوگئے، مسلمانوں کو اپنے مذہب کی اشاعت کا عمدہ موقع نصیب ہوا۔ عمدہ ذرائع آمد و رفت، تعمیر و توسیع نے مسلمان تجار کو بلا خوف و خطر، اندرونی خطوں میں جانے کا موقع دیا جہاں وہ خونخوار قبیلوں کے خوف سے داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ جرمن ایسٹ افریقہ کی حکومت نے ہزاروں تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اپنی سیاسی قوت مضبوط کرنے کے لئے، ملازم رکھے، ان لوگوں نے جگہ جگہ جاکر اپنا مذہبی وقار قائم رکھا۔ ہزارہا قبائلی باشندے، ان مسلمانوں کے ملاپ سے مسلمان ہوتے گئے۔ اس

[1] یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس بادشاہ نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا، اور وہ خود اسلام کا پُرجوش مبلغ بن گیا۔ (م۔ ق)

سلسلہ میں ساحلی مسلمانوں کے تبلیغی کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ ان علاقوں میں اسلام کی ترقی کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ مسلمان ہونا ایک فخر کی بات ہے۔ ایک مرتبہ حلقہ اسلام میں آنے کے بعد نسلی امتیاز ختم ہوجاتا ہے دوسرے مذاہب میں ایسا نہیں ہے، دوسرے مسلمان ہونے کے بعد، تمام مسلمان، نومسلم کی مدد کرتے ہیں اور اس کا احساس کمتری ختم ہوجاتا ہے۔ افریقہ میں عیسائیت کی ناکامیابی کی وجہ یہ ہے کہ مقامی کالے باشندے، عیسائیت کو استعماری یا بیرونی قوموں، یا حاکموں کا مذہب تصور کرتے ہیں جن سے افریقی عوام سخت بیزار اور متنفر ہیں، چنانچہ اسلام کو اپنے بھائیوں کا دین سمجھ کر اپنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ۱۸۹۱ء تک مغربی "یوسامبارا" میں لوگ مسلمانوں کو، غلاموں کے تاجر سمجھ کر، نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے یا ان سے خوف کھاتے تھے لیکن غلاموں کی تجارت ختم ہونے پر، بہت سے مسلمان حاکموں نے عوام کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جس کی وجہ سے بہت سے قبائلی سردار اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہوگئے۔ مسلمانوں کی تبلیغی کوششوں سے بہت سے حبشی جو عیسائی ہوگئے تھے وہ بھی مسلمان ہوگئے۔

نیاسالینڈ میں، اسلام کی اشاعت کے ذمہ دار، عرب تاجر اور انکے اتحادی "یاؤس" ہیں جو عرصہ دراز سے ساحلی علاقوں میں رہتے تھے اور مسلمان ہوچکے تھے۔

نیاسالینڈ میں یاؤس قبیلہ، مقامی قبیلوں میں نہایت طاقتور سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ اسلام کو اپنا قومی مذہب سمجھتے ہیں۔ کیپ کالونی میں، مسلمان زیادہ تر ملایا سے آئے ہوئے مسلمانوں کی اولاد ہیں جن کو سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں ڈچوں نے لاکر آباد کیا تھا۔ ان میں بہت سے ڈچ بھی ہیں۔ بہت سے مقامی ہوٹینٹاٹ بھی مسلمان ہوگئے ہیں۔

۱۸۱۹ء میں کرنل برگ نے اسلام کی ترقی کے متعلق توجہ دلائی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بہت سے غلام اور آزاد حبشی عیسائی ہونے کے بجائے مسلمان ہوتے جارہے ہیں۔ عیسائی حکومت کی موجودگی، عیسائی آقاؤں کا تشدد، غلاموں کو مسلمان ہونے سے باز نہ رکھ سکا۔ اسلام کو زیادہ کامیابی کیپ کالونی کے مغربی حصوں میں ہورہی ہے۔ حال ہی میں کلیرمانٹ میں ایک تبلیغی ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ بہت سے ہندو پاکستان سے آئے ہوئے قلی جو مستقل طور پر آباد ہوگئے ہیں۔ اسلام کی نمایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

جزیرہ مدغاسکر میں، مسلمان عموماً جنوبی مشرقی حصہ میں پائے جاتے ہیں جس میں عموماً "انٹے مورونا" قبیلہ کے لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ بھی عرب سوداگروں کی تبلیغی کوششوں سے مسلمان ہوئے ہیں۔ ابھی تک یہ بات پایہ تحقیق کو نہیں پہنچ سکی ہے کہ یہاں اسلام کب آیا لیکن سولہویں صدی کے کئی اطالوی اور پرتگیزی جغرافیہ دانوں نے تذکرہ کیا ہے کہ اس جزیرہ میں مسلمانوں کی تعداد کافی تھی۔

افریقہ کے حبشیوں میں، اسلام کی سب سے بڑی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام تمام جغرافیائی، نسلی، سیاسی امتیازات سے بالاتر ہے۔ اخوت مسلمانوں کا جزو ایمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاہ قومیں، اسلام کے حلقہ میں اپنے کو صاحب عزت، محفوظ اور اپنے ہم رنگ اور ہم زبان بھائیوں کا مذہب سمجھتی ہیں، علاوہ ازیں ہر مسلمان مبلغ ہوتا ہے اور وہ جہاں جاتا ہے اسلام کی اشاعت کو اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس عیسائیت کی اشاعت صرف پادریوں تک محدود ہے جو زیادہ تر سفید اقوام سے ہیں۔ جن کا کردار اور اخلاق قابل تقلید نہیں سمجھا جاتا ان پر سیاہ فام قومیں کم بھروسہ رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کی بے نیازی، سادگی، انکساری، انسانیت سے محبت، جذبہ اور خلوص، افریقہ میں اسلام کی نمایاں کامیابی کے راز ہیں جن کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ انشاءاللہ وہ دن دور نہیں ہے جب کہ تمام براعظم افریقہ میں اسلام کا اثر غالب ہوجائیگا۔

مولانا عبدالرشید نعمانی

”ناصبیت“ تحقیق کے بھیس میں!

اُمتِ مسلمہ کا اس پر اجماع رہا ہے کہ جمل و صفین کی جنگوں میں حق حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔ جنگِ جمل میں حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا موقف جو غبار آلود ہو گیا تھا، ام المومنین کے افسوس و ندامت نے اس غبار کو دُور کر دیا۔ مگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آخر دم تک اپنے موقف پر جمے رہے۔ اس لئے حضرت علی خلیفہ راشد کے پاک و صاف موقف کے مقابلہ میں امیر معاویہ ”کسرائے عرب“ کا موقف غبار آلود ہی رہا۔

ایک طرف خلافتِ راشدہ ہے اور دوسری طرف شام کی امارت ہے۔ اُمت نے امارتِ شام کے مقابلہ میں خلافتِ راشدہ ہی کو محبوب و پسندیدہ سمجھا ہے! اُمت، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کی خلافت کے احیاء کے لئے ہمیشہ تمنا اور دُعائیں کرتی رہی ہے۔ ”امارتِ شام“ کی تجدید و احیاء کے لئے امت نے کبھی تمنا نہیں کی! یہ ایسی سامنے کی باتیں ہیں کہ جن سے حضرت علی مرتضیٰ اور امیر معاویہ کے موقف کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

امیر معاویہ برسوں شام کے گورنر رہے تھے، اُن کی طرزِ معاشرت میں عرب کی سادگی کی جگہ عجمی تکلفات جھلکنے لگے تھے۔ اسی لئے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن کو ”کسرائے عرب“ کے لقب سے نوازا ہے۔ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو شام کی گورنری سے معزول فرمایا تھا۔ تو اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ اس میں امیر معاویہ کے ”تزکیۂ نفس“ کی خیر خواہی بھی شریک تھی۔ تو یہ اس واقعہ کی نفسیاتی تحلیل ہو گی! ——— یزید کی ولی عہدی کا قضیہ نامرضیہ اس ”نفسیاتی تحلیل“ کی توثیق و تائید کرتا ہے کہ جناب ابوتراب کی نگاہِ حقیقت بیں، امیر معاویہ کی نفسیات کا جائزہ لے چکی تھی، یہی سبب تھا کہ جب امیر معاویہؓ، یزید کی ولی عہدی کے لئے اصرار کر رہے تھے، تو ایک سعید روح بے اختیار پکار اٹھی تھی:-

> ”---- کیا یہ چاہتے ہو کہ ایک کسریٰ مرے، تو دُوسرا کسریٰ اُس کا جانشین ہو“۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ”خلافت“ اور ”ملوکیت“ میں تقویٰ اور نفسیاتی کیفیات کا جو بُعد اور فرق ہے، وہی بُعد و فرق علی اور معاویہ کے درمیان پیش آئے ہوئے معاملات میں پایا جاتا ہے! ملوکیت چاہے وہ صحابیٔ رسول ہی کی قائم کی ہوئی کیوں نہ ہو۔ دوسرے بادشاہوں کی بادشاہت سے یقیناً بدرجہا بہتر ہو سکتی ہے، مگر وہ ”خلافتِ راشدہ“ سے فروتر ہی سمجھی جائے گی! اور جب وہ ”خلافتِ راشدہ“ کے توڑ پر قائم ہو۔ تو اُس کا موقف اور زیادہ قابلِ غور اور محلِ نظر ہو جاتا ہے۔

تاریخی روایات بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے موقف کی تائید اور تصویب کرتی ہیں، اور دینی نقطۂ نگاہ سے بھی ہمیں معاویہ کے مقابلہ میں علی سے زیادہ عقیدت اور حسنِ ظن رکھنا چاہیے

کہ وہ سابقون الاولون میں، بدریین میں، عشرہ مبشرہ میں اور خلفائے راشدین میں شامل ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل رفاقت میں، حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں! وہ ممتاز صحابہ جو امت کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے "مثالی کردار" رکھتے ہیں، ان میں حضرت علیؓ کا شمار ہوتا ہے امیر معاویہؓ کے موقف کی مدافعت میں جو کوئی اس "مثالی کردار" کو مجروح کرنے کی کوشش کرتا ہے، دینی نقطۂ نگاہ سے اس کی یہ حرکت ناپسندیدہ ہے!

امیر معاویہ کا شرفِ صحابیت اپنی جگہ مسلّم ہے (رضی اللہ عنہ) جو کوئی ان کے ایمان اور اسلام کے بارے میں شک کرتا ہے، اس بدبخت سے ہم اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، ہم امیر معاویہ کی خاکِ پا کی بھی برابری نہیں کر سکتے کہ نبوت کے بعد دین و دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی خوبی بھی شرفِ صحابیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی! اس احترام کے ساتھ امت کا اس پر اجماع ہے کہ علی و معاویہ کے معاملات میں حق علی کے ساتھ ہے!

امت نے ہر دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کردار کو محبوب و پسندیدہ اور یزید کے کردار کو مبغوض و ناپسندیدہ سمجھا ہے کربلا کے المناک حادثہ کے علاوہ مدینہ اور مکہ میں یزید کے دورِ حکومت میں جو مظالم ہوئے ہیں، ان کے پیشِ نظر کوئی حق پسند یزید سے دلچسپی نہیں رکھ سکتا!

امت کے اس فیصلہ اور اجماع کے خلاف محمود عباسی نے اپنی بدنام کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں حضرت امیر معاویہ کے مقابلہ میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو گرانے اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے اور یزید کے مقابلہ میں حضرت حسین اور حضرت عبداللہ ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) کو غلط کار ٹھیرایا ہے اور ان مقدس شخصیتوں کے معائب و مثالب بیان کئے ہیں (معاذ اللہ)

"خلافتِ معاویہ یزید" کی بنیاد ہی حضرت علی و فاطمہؓ اور انکے مقدس خاندان کی دشمنی پر رکھی گئی ہے، جس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف نے جو درود (صلوٰۃ) درج کیا ہے، اس میں "آلہٖ" حذف کر دیا ہے! اس کتاب میں تاریخی حوالوں میں قطع و برید کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب علمی و تاریخی اعتبار سے بھی بے حیثیت اور گری ہوئی کتاب ہے! اس بددیانت مورخ نے ایک طرف کتابوں کے اصل اقتباسات میں کانٹ چھانٹ کی ہے اور دوسری طرف حدیث و تاریخ کے اساطین کو مجروح کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں یورپ کے مورخین کو معتبر اور مستند ٹھیرایا ہے، جو شخص کتاب الاغانی جیسی قصہ کہانیوں کی کتاب سے سند لیتا اور استفادہ کرتا ہو، اس کی ثقاہت معلوم!

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی مظلومیت سب کے نزدیک مسلّم ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عمرو ابن سعد اور ابن زیاد اس ظلم میں صریحی طور پر شریک تھے، حد ہو گئی اہلِ بیت کرام کی دشمنی کی کہ "خلافتِ معاویہ یزید" میں عمرو ابن سعد اور ابن زیاد جیسے ظالموں کو جن کو پوری امت سفاک سمجھتی ہے ....

.... "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا گیا ہے، اور ان کے کردار کو سراہا گیا ہے (استغفر اللہ)

اس بدنام و ناپسندیدہ کتاب نے یہ کارنامہ البتہ انجام دیا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر کچھ "ناصبی" پیدا ہو گئے ہیں جو حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد سے کد رکھتے ہیں اور اپنی محفلوں میں ان نفوس قدسیہ پر طنز و استہزا

کیا جاتا ہے!

مولانا عبدالرشید نعمانی "صاحب لغات القرآن" ایک ثقہ اور سنجیدہ عالم ہیں، علمی تبحر کے ساتھ ان کی زندگی میں پاکبازی اور تقویٰ جھلکتے ہیں، مولانا موصوف نے "خلافتِ معاویہ یزید" کے رد میں ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، اس کتاب کا ایک مختصر جزو "فاران" کی زینت بن رہا ہے، ہم نے خاص طور سے اس "باب" کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کے ایک اقتباس کو محمود عباسی صاحب نے بڑی شد و مد کے ساتھ پلیش کیا ہے، مولانا نعمانی کا یہ مقالہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ "نواصب" کا یہ "پائے چوبیں" بھی کس قدر "بے تمکیں" ہے اور اُن کا یہ بزعم خویش مضبوط موقف بھی کس درجہ کمزور اور بے اساس ہے (م۔ق)

✖

حال کا تازہ ترین "سنہ کا جیت" جس کی داغ بیل محمود احمد صاحب عباسی کے قلم نے "خلافت معاویہ و یزید" لکھ کر ڈالی ہے وہ تمامتر انہی مستشرقین کی زہر آلود معلومات پر مبنی ہے مؤلف نے ان معلومات کو ایک مدت کی ریسرچ کے بعد حاصل کیا جی جان سے انہیں قبول کیا اور اپنے دل و دماغ میں بسایا ہے، مستشرقین کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کرنے اور ان کے نظریات و افکار کو پوری طرح اپنے اندر ہضم کر لینے سے مؤلف کی نظریں اب اس درجہ خیرہ ہو چکی ہیں کہ ان کو ان مستشرقین کے علاوہ کوئی آزاد اور بے لاگ محقق ہی نظر نہیں آتا اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو بالکل ان ہی کے رنگ میں رنگ لیا ہے وہ بالکل انہی کی طرح سوچتے انہی کی طرح پڑھتے اور انہی ہی کی طرح لکھتے ہیں اس افسوسناک صورت حال کا پس منظر یہ ہے کہ انہیں اپنے وطن امروہہ میں وہاں کے متشدد اہل عناد سے سابقہ پڑا، موصوف کو علوم اسلامیہ میں دسترس نہ تھی کہ اہل سنت کے جادۂ مستقیم پر قائم رہتے اور اعتدال کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے آخر جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ مثالب صحابہ کی ناگوار بحث نے تاریخی مباحث کا دروازہ کھولا، روافض کے غلو بیجا سب و شتم اور تبرا بازی کے مقابلہ میں متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جواب ترکی بہ ترکی کے جذبہ نے ردِ عمل کی صورت اختیار کی جو اپنے حدود سے تجاوز کر کے ناصبیت میں تبدیل ہو گیا اب مؤلف اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کی مدد سے مایوسی تھی ناچار غیر مسلموں کو پکارا اور وہ مدد پر آموجود ہوئے۔ ڈوزی نے فوراً ڈوز پلائے۔ دے خوئے نے خوراک بہم پہنچائی اور حتی نے ان کی حمایت کی، دوران تالیف میں ہر گام پر مؤلف انہی کی انگلی پکڑ کر چلے ہیں اور انہی کی حمایت و رہنمائی میں انھوں نے یہ منزل ہفت خواں طے کی ہے اور اس طرح جیسے ہزار دقت و خرابی ان آزاد اور بے لاگ مستشرقین کی مدد سے "ناصبیت کا یہ خوانِ سفاہت تیار ہو گیا تو بے چارے سادہ لوح عوام کی ضیافتِ طبع کے لئے اس کو شائع کر دیا۔"

اہل سنت کا شعار گالی کا جواب گالی سے نہیں ہے ان کی توصفت یہ ہے وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (جب لغویات پر گذرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ نکل جاتے ہیں) اور وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (اور جب ان سے جاہل مخاطب ہونے لگتے ہیں تو یہ صاحب سلامت کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں) جس طرح ایک یہودی نصرانی کے مقابلہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طوفان باندھنے لگے ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جذبات سے مشتعل ہو کر خدانخواستہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض کرنے لگ جائیں، اسی طرح سب صحابہ کا جواب اہل بیت کی تخفیف مرتبت سے دینا کسی طرح ایک مسلمان کے شایان شان نہیں

ہاں اس حیثیت سے یہ بالکل نیا کارنامہ ہے کہ رفض کے تو مختلف مکاتب فکر یہاں پہلے سے موجود تھے مگر ناصبیت کا کوئی ترجمان نہ تھا انھوں نے اپنی دانست میں اس کتاب کو لکھ کر ایک بہت بڑی کمی کو پورا کر دیا۔ پھر جو کچھ کیا، نہایت سلیقہ سے کیا، رائی کا پربت. تل کا پہاڑ

بنایا، حقیقت کو فسانہ، فسانہ کو حقیقت کر دکھایا اور یہ سب کچھ اس خوب صورتی کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والے کو حقیقت کا گمان ہونے لگے اور جو سادہ دل ایک دفعہ اس طلسم کی سیر کرے پھر نہ نکل سکے۔ مگر مولف نے جو بزم اس سرد سامان سے سجائی ہے اس کا تمام تر میٹر دساور سے آیا ہے جس کے بنانے اور تیار کرنے میں، یورپ کے بہترین دماغوں نے ایک مدت تک اپنی ذہنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو صرف کیا ہے، جابجا قیاسات بیجا کے پیوند لگائے ہیں حقائق تاریخی پر پردہ ڈالا ہے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا ہے۔ تب کہیں جاکر یہ خاص الخاص انوکھے اور نادر معلومات وضع ہوئے ہیں ورنہ اسلام کے تاریخی خزانہ میں اس زرِ قلب کو کون پوچھتا ہے۔ تعجب نہ کیجیے "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔" خود مولف سے پوچھیے یہ مال مسالہ کس سے مستعار لیا ہے وہ آپ کو بتائیں گے۔

"دے خوئے نے اپنے مقالہ بعنوان "خلافت" میں ..... کہا ہے کہ:-

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن معاملہ فہم لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمانؓ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علیؓ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، گیارھواں ایڈیشن ج ۵ ص ۳۰)[1]

(خلافت معاویہ و یزید طبع سوم ص ۶)

---

[1] دے خوئے یا اس کا کوئی پرستار اگر اس جھوٹ کو سچ کر دکھائے اور مستند تاریخی حوالوں سے ان معاملہ فہم لوگوں کی نشاندہی کر دے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کے ساتھ ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے تو یہ ایک تاریخی کارنامہ ہوگا مولف تو شاید یہ نہ کر سکیں کیوں کہ ان کو یہ تسلیم ہے کہ:-

"تاریخ کی کھلی شہادت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں۔" (ص ۳۲۳ طبع دوم و ص ۲۶۰ طبع سوم)

اس لئے خود ان کی تحقیق و ریسرچ کے مطابق تو ان معاملہ فہم لوگوں کا سرے سے تاریخی وجود ہی نہیں کہ "تین خلافتیں متفق علیہ طور سے گذریں"۔ پھر معاملہ فہم لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کیسے کر سکتے تھے، یہ بھی انہی کے الفاظ ہیں کہ:-

"اس زمانہ کی برکات خلیفہ سوئم حضرت عثمان ذی النورینؓ کے عہدِ خلافت تک باقی رہیں۔
(ص ۳۲۷ طبع دوم) اور نشوونمائے ملت اسی منہاج پر جاری رہا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معین فرمایا تھا۔"

آنحضرتؐ برائے نشوونمائے ملت اسلامیہ صورتے معین فرمودند کہ تا آخر عہد حضرت عثمان متحقق شد۔
(ازالۃ الخفاء ۔ ۱ ص ۱۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتِ اسلامیہ کے نشوونما کے لئے ایک صورت معین فرمائی تھی جو آخر عہد حضرت عثمانؓ تک یقیناً رہی۔

ظاہر ہے کہ اس تصریح کے بعد اب دے خوئے کی اتباع میں ان لوگوں کو معاملہ فہم کہنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرتے تھے۔

یہ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ دے خوئے کی اس خرافات پر مولف نے بغض علیؓ کے جذبہ میں دھیان نہیں کیا۔ ان کا مقصود تو صرف حضرت علیؓ پر طعن تھا اس میں ضمناً ایک بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی آگئی جو اگرچہ خود ان کے ضمیر کے خلاف تھی مگر بہرحال حضرت علیؓ کی مخالفت میں وہ ایک "آزاد نگار مستشرق" کی زوردار شہادت تھی اس لئے وہ اس کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ مولف کی ساری کتاب

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حضرت علیؓ پر طعن "دشمنانِ دین اور کفار سے تیغ آزمائی کرنے کی بجائے طلب وحصول خلافت کی غرض سے تلوار اٹھائی گئی تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

مقاتلات وے (علی) رضی اللہ عنہ برائے طلب خلافت بود نہ بجہت اسلام	علی رضی اللہ عنہ کی لڑائیاں (مقاتلات) تو (بعد شہادتِ عثمان) اپنی خلافت کی طلب وحصول کے لئے تھیں، نہ باغراضِ اسلام۔¹
(ازالۃ الخفاء ج۔ ۱ ص ۲۷۷ سطر ۲۰)	

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ناصبیت کی آئینہ دار ہے خروج کی نہیں، خروج میں بغض علیؓ کے ساتھ بغض عثمانؓ بھی شامل ہے، بغض عثمانؓ پر خوارج وروافض دونوں کا اتفاق ہے، بغض علیؓ نواصب کی خصوصیت ہے اور بغض شیخینؓ روافض کی۔

۱؎ مولف نے احتیاط کے پیش نظر سطر تک کا یہاں حوالہ دیدیا ہے تاکہ کسی کو حوالہ کی صحت میں پس وپیش نہ ہو۔ بے شک مولف نے الفاظ کی نقل میں قطع وبرید سے کام نہیں لیا مگر بیانِ مطلب میں جو تحریف کی گئی ہے اس کا کیا علاج۔ شاہ صاحب نے یہ جملہ اپنی کتاب میں اس مقام پر لکھا ہے جہاں اس آیت پر بحث کی ہے۔

قُلْ لِلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (الفتح)	کہہ دیجئے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے آئندہ تم کو بلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم ان سے لڑوگے یا وہ مسلمان ہونگے

وہ فرماتے ہیں یہ آیت خلافتِ شیخینؓ کی دلیل ہے کہ "اولی باس شدید" (سخت جنگجو لوگ یعنی فارس وروم) سے جنگ کی دعوت "اعرابِ حجاز" (بادیہ نشینانِ عرب) کو شیخین رضی اللہ عنہما ہی نے دی تھی نہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کیوں کہ ان کی جنگیں مطالبہ خلافت کی بنا پر تھیں نہ دعوتِ اسلام کی خاطر۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے میدان میں آئے تھے ان کے حریف کافر نہ تھے کہ جن کو دعوتِ اسلام دی جاتی۔

مولف نے اپنے پیش رو مستشرقین یہود ونصاریٰ کی اتباع میں جن کی خاص صفت ہے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ	پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانہ سے۔

یہاں تحریفِ معنوی کی ہے اور عبارت کا مطلب بدل دیا ہے۔ "نہ بجہتِ اسلام" کا ترجمہ ہے "نہ اسلام کی غرض سے" مولف نے غرض کی جمع اغراض لکھ کر اس حیثیت سے "مقاتلاتِ علیؓ" کو اسلامی جنگوں میں شمار کرنے سے خارج کردیا ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب مرحوم نے اس کتاب کی جلد اول کے خاتمہ پر مولف جیسے خوش فہم حضرات کو پہلے ہی تنبیہ کردی تھی کہ:۔

غرض من آں نیست کہ حضرت مرتضےٰ خلیفہ نبود یا در حکم شرع خلافت او منعقد نگشت۔ یا سعی او در حروبے کہ پیش آمدند للہ فی اللہ نبود۔ اعوذ باللہ من جمیع ما کرہ اللہ	میرا مطلب یہ نہیں کہ حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) خلیفہ تھے یا حکم شرع میں ان کی خلافت منعقد نہ ہوئی یا ان کی کوشش ان جنگوں میں جو انہیں پیش آئیں للہ فی اللہ نہ تھی۔ میں اللہ سے ایسی تمام باتوں سے پناہ مانگتا ہوں جو اس کو ناپسند ہوں۔
(ازالۃ الخفاء ج۔ ۱ ص ۲۲۵)	

محمود عباسی صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگوں کو محض دنیوی جنگ سمجھتے ہیں جو حصولِ اقتدار کے لئے لڑی گئی تھیں، لیکن شاہ صاحب موصوف اس بات کو زبان پر لانے سے بھی اللہ کی پناہ مانگ رہے ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے شاہ صاحب کا منشاء

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

شاہ صاحب کے اس خیال کی تائید ایک آزاد نگار مستشرق کے بیان سے ہوتی ہے۔ دے خوے نے اپنے مقالہ بعنوان "خلافت" میں یہ لکھتے ہوئے کہ "بلوائیوں کے جم غفیر نے حضرت علیؓ کو زمام خلافت ہاتھ میں لے لینے کے لئے بلایا ہے اور طلحہؓ و زبیرؓ کو ان کی بیعت کے لئے مجبور کیا" کہا ہے کہ :-

---

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اس جملے جو مولف نے نقل کیا ہے صرف اتنا ہے کہ ان کی جنگیں اس آیت کے تحت نہیں آتیں کیونکہ ان کی لڑائی اسلام و کفر کی لڑائی نہیں بلکہ خلیفۂ راشد کی باغیوں سے جنگ تھی۔ شاہ صاحب ممدوح کے نزدیک "مقاتلاتِ علیؓ" جس آیت کا مصداق ہیں وہ یہ ہے :-

وکلمۂ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ منطبق است بر علی مرتضیٰ زیرا کہ در ایام خلافتِ او آنچہ کہ واقع شد و وے بدان متفرد بود قتالِ بغاۃ است (ازالۃ الخفا ج- اص ۲۳۱)

اور آیہ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ (اور وہ لوگ کہ جب ان کو بغاوت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ انتقام لے لیتے ہیں) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر منطبق ہے کیونکہ ان کے ایام خلافت میں جو خاص بات کہ واقع ہوئی اور جس میں وہ متفرد تھے وہ قتال بغاۃ ہی ہے۔

مولف کو چونکہ دے خوے کی زبانی حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر طعن کرنا تھا اور شاہ صاحب کا حوالہ اس کے لئے بطور تمہید پیش کرنا اس لئے انہیں اس تحریف کے بغیر چارہ نہ تھا۔ ورنہ شاہ صاحب کی جو قدر ان کے دل میں ہے وہ ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ :-

"شاہ صاحب اپنی جلالتِ قدر کے باوجود سبائی حضرات سے گلو خلاصی نہ پا سکے سیدنا معاویہؓ کے سوابق ان کی سمجھ میں نہ آئے" (ص ۴۸۵ طبع سوم)

بھلا جو شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں شاہ صاحب کی رائے کو حرف غلط سمجھتا ہو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے کو کیا وقعت دے گا۔

مولف کی اس تصریح سے یہ تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ ان کو مستشرقین کی جناب میں جس درجہ عقیدت ہے مسلمان علمائے اس کا عشر عشیر بھی نہیں، حد ہو گئی بے لاگ ریسرچ کی کہ دے خوے تو آزاد نگار ٹھیرا اور شاہ ولی اللہ صاحب سبائی حضرات سے اپنی گلو خلاصی تک نہ کرا سکے۔ جب بایں ہمہ اعتراف جلالتِ قدر شاہ صاحب ممدوح کے متعلق مولف کی یہ رائے ہے تو اور کس عالم کو اب وہ آزاد نگار مان سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مولف نے اپنی ساری کتاب میں ایک جگہ بھی کسی مسلمان عالم کو آزاد اور بے لاگ محقق نہیں لکھا ہے غالباً انکے نزدیک کوئی مسلمان آزاد نگار نہیں کہ یہ بات تو صرف مستشرقین ہی کا حصہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق اس ہرزہ سرائی کے باوجود جس معصومانہ انداز سے مولف اپنے آپ کو ان کی بدگوئی سے بری کرتے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے :-

"حضرت علیؓ عشرۂ مبشرہ میں ہیں سیاسی معاملات میں ان سے جو لغزشیں ہوئیں ان کے باوجود وہ ہمارے امام واجب الاحترام ہیں اور نسبی تعلق سے بھی ہمیں ان سے محبت ہے۔

جو شخص بدگوئی کرتا ہے اس سے وہی کہوں گا جو میرے ایک دادا امیر عبد اللہ المعتز عباسی (جو کہ حسب تصریح حافظ زین الدین ابن

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

"حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو (خلیفہ شہید کی) جانشینی کا استحقاق واقعاً حاصل نہ تھا، علاوہ ازیں یہ بھی واضح ہو کہ تقدس و پارسائی کا جذبہ توان کے (طلب خلافت) میں کارفرما نہ تھا۔ بلکہ حصولِ اقتدار وحب جاہ کی ترغیب تھی۔ اس لئے معاملہ فہم

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) عراقی ناصبی تھا۔ ملاحظہ ہو التقیید الایضاح ص ۲٦٧ ۔ نعمانی) نے ایسے ہی کسی بدگو کے جواب میں کہا تھا۔

زعمت بانی یا مبغض مبغض علیا فما فخری اذا فی المحافل

(اے دشمن تو مجھے علیؓ کا دشمن بتاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کے سامنے میں کیا منہ دکھا سکتا)

أآکل من لحمی واشرب من دمی کذبت لحاک الله یا شر واغل

(علی رضی اللہ عنہ کی برائی کرکے کیا میں اپنا ہی گوشت نوچ کھاؤں اور اپنا ہی خون پیوں۔ اے بدذات جھوٹے تجھ پر خدا کی مار)

علی وعباس یدان کلاهما یمین سواء فی العلی والفضائل

(علیؓ وعباسؓ دونوں یکساں ہیں۔ فضائل وشرافت میں اونچی چوٹی پر ہیں)۔

فهذا ابو هذا وهذا اکرابن ذا فهل بین هذین التساع لداخل

(یہ (عباس) ان کے باپ ہیں اور وہ (علی) انکے بیٹے ہیں۔ سو ان دونوں کے درمیان تیسرے کا کیا دخل)

ستسمع ما یخزیک فی کل محفل وتمسح رأس التعارف المتغافل

(سوائے مخاطب تو جو ہر محفل میں ہمیں بدنام کرتا ہے اور تجاہل عارفانہ کرنے والے کو دھوکہ دیتا ہے عنقریب تجھے نتیجہ معلوم ہوگا) (عرض مؤلف طبع سویم ص ۳۳)

قربان جایئے اس ریسرچ کے جس میں عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی بزرگ کے لئے یہ کہہ دینا کہ :-

"حقیقت نفس الامر یہ ہے کہ ان کو اپنے پیش رو کی جانشینی کا استحقاق واقعاً حاصل نہ تھا اور تقدس و پارسائی کا جذبہ توان کے طلب خلافت میں کارفرما نہ تھا بلکہ حصولِ اقتدار وحب جاہ کی ترغیب تھی اور معاملہ فہم لوگوں نے ان کو جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا"

بدگوئی نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے، مؤلف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق جس امر کے مدعی ہیں روافض خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق وہی بات کہتے ہیں، مؤلف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور انکی شہادت کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو (کہ یہی دو بزرگ عشرہ مبشرہ میں سے اس وقت زندہ موجود تھے) مستحقِ خلافت نہیں سمجھتے چنانچہ ان کے الفاظ ہیں۔

"اس زمانہ میں عشرہ مبشرہ میں کے بعض حضرات، اصحاب بدر، اصحابِ بیعت الرضوان اور دیگر صحابہ کرام کی کثیر تعداد بقید حیات تھی لیکن امت کو اختلال وانتشار سے نکالنے، دشمن اسلام قوتوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور خلافت کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحلِ مراد تک سلامتی کے ساتھ پہنچانے کی اہلیت اگر کسی میں بدرجہ اتم تھی تو وہ حضرت معاویہؓ کی ذات میں تھی"

(ص ۱۴ طبع دوم وص ۱۸ طبع سوم)

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

لوگوں نے اگرچہ وہ (حضرت) عثمانؓ کے طرزِ حکمرانی کی مذمت کرتے تھے مگر علیؓ کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"
(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا گیارھواں اڈیشن ج - ۵ - ص - ۲۰)

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) اور ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو میں کچھ کہتا ہے حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں اس درجہ فروتر نہ تھے جتنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی، حضرت سعد اور حضرت سعید رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں تھے یہی وجہ ہے کہ حضرات اہل سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو خلیفہ راشد مانتے ہیں مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ راشد نہیں کہتے۔ مؤلف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جس حقیقت کا انکشاف کیا ہے اگر وہ صحیح ہوتی تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان کو اپنا جانشین بناتے ورنہ کم از کم عشرہ مبشرہ میں سے جن چھ حضرات کی مجلس شوریٰ انھوں نے اپنی وفات پر انتخاب خلافت کے لئے بنائی تھی اس میں ان کو بھی نامزد کرتے اور اگر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کسی وجہ سے ان کو نظر انداز کر دیا تھا تو ارباب شوریٰ ضرور ان کا خیال کرتے۔

آغا مہدی لکھنوی

یادش بخیر — حقّہ

مشرقی تہذیب اور ذوقِ رفتہ میں حقہ پیامِ اتحاد تھا جو زینتِ محفل ہونے کے ساتھ ساتھ باہمی تعلقات کو مضبوط کرتا تھا اور ظاہر میں اگر وہ دوستوں میں تواضع کی مستحکم بنیاد تھا تو باطن میں اس کا ہر جزو خدمتِ خلق کا پہلو لئے ہوئے اور کوئی حصہ بیکار نہیں یہی ر[ا]ز ہے کہ تاریخ نے اپنے معزز صفحات میں حقہ کو سراہا شعر و سخن نے دل میں جگہ دی افسانہ نگار دم بھرتے رہے اور طویل مدت تک تمدن و صنعت کی عمر دراز رہی یہاں تک کہ انگریزوں کا دیس میں دست تزویر چلا اور ہمارے عادات و اطوار میں تبدیلی شروع ہوئی پہنا وا اور خورد و نوش نے نئی کیفیتیں اختیار کیں اور زمانہ کا ورق پلٹنے کے ساتھ حقہ سے بھی منہ موڑنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ سگرٹ نے جگہ ضبط کی اور جدت پسند انسان اگلے سبق بھولتے ہوئے نئی تعلیم میں آگے بڑھا اور زمانہ اس قدر قدیم تہذیب سے دور ہو گیا کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے کہ ہمارے نونہال حقہ کا نام بھی بھول جائیں گے حقہ کا ساز و سامان تو کب کا طاقِ نسیان پر پہونچا مختلف عناصر تھے جن کو یکجا کر کے حقہ کی ایجاد ہوئی اور اگر کسی سلیقہ شعار اور شوقین کے روبرو سجا ہوا حقہ دیکھا تو وہ ایک مجموعہ نظر آیا اور تحت سے فوق تک — پیندا، کٹا، نیچہ، چلم، توا، گل گیر۔ چنبر قفلی مہنال وہ اعضاء ترکیبی تھے جس میں آب و آتش سے جان پیدا ہوتی تھی، اور نفاست پسند لوگ پھول کے تھال میں حقہ رکھتے تھے تاکہ فرش پر انگارہ یا چنگاری نہ گرے۔

بیرونِ لکھنؤ کے لوگ پیندے کو فرشی کہتے تھے جو لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے حکیم عموماً پیٹ کی بیماریوں میں مریض کو حقہ پینے کا مشورہ دیتے تھے اور حقہ کا ہر جزو دکھ درد کی دوا تھا گل پسا ہوا دانتوں کی صفائی میں منجن اور ٹوتھ پاوڈر کیٹ مرہم کے نسخوں میں جراح شامل کرتے۔ آبِ قلیان کہنہ یعنی بہت دن کے بھرے ہوئے حقہ کا پانی جو بدلا نہ جاتا ہو مار گزیدہ کو پلا و سانپ کے کاٹے کا اثر متواتر استفراغ سے جاتا رہے گا تندرست آدمی کے لئے حقہ کا مضر اثر پھیپھڑوں پر نہیں پڑتا فسانہ آزاد میں برات کی دھوم کے سلسلہ میں یہ شعر پڑھو ؎

قلیان پیئے مشکبو دھواں دھا
بیڑے چکھے پان کے مزیدار

شیخ امام بخش ناسخ نصیر الدین حیدر بہادر کے دربار میں حاضر تھے شاہ کے روبرو حقہ تھا حکم ہوا کہ شیخ صاحب حقہ پر کچھ کہیے ناسخ نے باادب عرض کیا ؎

حقہ جو ہے حضور معلیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

یہ واقعہ دورِ ادب کے آغاز کا تھا اور جب قدیم تہذیب کا چراغ گل ہو رہا تھا اور اس وقت ایک دل جلے شاعر کی تاریخ اچانک چلم ٹوٹ جانے پر لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں زبان زد تھی ۶ ٹوٹی ہے مثلِ دل یہ چلم آہ آہ ۱۳۳۳ھ

حقہ کی مختلف صورتیں اور طرح طرح کے اقسام تھے ڈیر خمہ۔ بہجمان، گڑگڑی، مسک، قفلی دار، ککڑ، مدریہ جو حسب مراتب اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ میں استعمال ہوتا تھا اور ماہ رمضان میں حقہ کی سجاوٹ اور بڑھ جاتی تھی روزہ دار خس کا پنجہ بنواتے اور کبھی پیلے چنبیلی پھولوں کے ہار میں بساتے اور سورج ڈوب جانے کا انتظار کرتے پست طبقہ کہار، سنار، دھوبی،

عموماً ناریل پیتے کبھی شرفار کو منھ لگاتے نہ دیکھا نجابت حسین خاں عظیم پٹنہ عظیم آباد کے ایک رئیس اعظم محمد امجد علیشاہ ہیں گھوڑے پر سوار ہو کے شوق سفر میں لکھنؤ پہونچے اور عہد شاہی کے شہر پر اپنا روزنامچہ لکھا جو ادبی اور تاریخی لحاظ سے آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور پٹنہ یونیورسٹی کے مخطوطات میں ہے اس سرگزشت میں بھی چوک میں حقہ بردار کی گشت کے سلسلے میں ککڑ کا ذکر ہے (دیکھو نیا دور لکھنؤ بابت مئی سنہ ۱۹۶۰ء) مگر فاضل سیاح لفظ کی تشریح نہیں کر سکے اس لئے کہ اس وقت لفظ اور معانی میں چولی دامن کا ساتھ تھا ککڑ پینے والے موجود رہتے اون کو وہم بھی نہ تھا کہ صدی گذر جانے پر معانی کا سوال ہوگا مدت دراز تک اس لفظ کی تحقیق میں میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ لکھنؤ میں چوک سے چالیس برس پہلے گذرتے ہوئے حقہ پلانے والے کی یہ شان تھی سر پر صافہ جسم میں اونچی چولی کی اچکن گلے میں مولویوں کا ایسا نین سکھ کا دوپٹہ پشت پر جھولا ہاتھ میں گڑگڑی شام کو گول دروازہ سے اکبری دروازہ تک گشت میں پورا چوک انکی جاگیر معلوم ہوتا تھا چند قدم چلا اور راہ گیر نے کچھ رقم دے کر حقہ پیا اور رخصت جس نے دو کش پیئے کچھ دیا امراء اور رؤسا بخشش میں رومالی شالی اور دوشالہ اتار کر دیدیتے یہ انکے مقدر کی پرواز تھی کہ اور اگر ہوس نے ابھارا اور کسی بالاخانہ سے اشارہ ہوا تو حقہ والے نے ایک تکالی جوڑ کر اسی دستی گڑگڑی کو کوٹھوں تک پہونچا دیا اور دھواں آسمان کی خبر لینے لگا خواجہ حیدر علی آتش سرا معالیجاں کے رہنے والے تھے چوک انکی گذرگاہ تھا یوں بھی سہ پہر کو تفریح کے لئے بازار میں خلائق کا ہجوم ہوتا تھا لکھنؤ کا تمدن اون کی نظروں کے سامنے اور تہذیب شہر ان کی ساختہ پرداختہ تھی پٹنہ یونیورسٹی کے فارسی روزنامچہ اور آتش جن کی وفات سنہ ۱۲۶۳ھ میں ہوئی۔ دیوان کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ شعر ککڑ کی تصویر کشی کرتا ہے ؎

سبک سمجھو نہ آہِ عاشقِ شیدا کو بیدردو اگر کی بو دھواں دیتا ہے اک کھونٹے ککڑ کا

کلیات آتش کے علاوہ ایک دوسرے مقام پر بھی ککڑ کا ذکر ہے میاں رنگین اپنے ہمعصر ایک کمال شاعر کے حال میں لکھتے ہیں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار رزائی پہنے سر پر ایک پھینٹا۔ گھٹنا پاؤں میں گلے میں بیکوں کا توبڑا ڈالے ایک ککڑ کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا اور مشاعرہ میں سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا کسی نے اس سے مزاج پرسی بھی کی تو اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمبا کو نکالا اور اپنی چلم پر سلفہ جما کر کہا بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھدینا اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑگڑی سٹک بیچوان سے حاضرین تواضع کرنے لگے (اردو سلکشن پنجاب یونیورسٹی سنہ ۱۹۱۷ء صفحہ ۴۷) یہ خودداری تھی کہ پہلو نشین سے حقہ مانگنا پسند نہ کیا اور عادت کی یہ بیتابی تھی کہ تواریکھنے میں دیر ہوئی سلفہ جمایا جو غزل پڑھی اس کا مطلع یہ تھا ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مدرسہ حقہ

اس حقہ کا ذکر بھی تاریخ میں جا بجا ہے اور مقبولیت نے یہ دن دکھایا تھا کہ بڑی محفلوں مجلسوں میلاد میں صرف یہی حقہ نظر آتا تھا کہہ چکا ہوں کہ موسم اور وقت کے لحاظ سے حقہ کے تکلفات میں اضافہ ہوتا تھا چنانچہ نواب میر مہدی آہر کی مجلسوں میں ان کے بیدطی کے ذوق سلیم سے یہ رنگ نظر آیا کہ سیاہ نیچہ اور پیندوں پر سیاہ کپڑا چڑھا ہوا حقے لانے والے نوکر چاکر اوس حکم کے پابند جو ایک چوبی تختی پر خوشخط لکھا ہوا سامنے دیوار پر جس میں اچھے کاتب کا لکھا ہوا جلی قلم سے یہ کتبہ "حقے لاؤ" مجلس شروع ہونے کا وقت آنے پر دفعتاً لڑ خود بخود گر جائے اور دوسری تختی "حقہ بڑھاؤ" یاد رہے اس وقت تک الکٹرک عمارتوں میں نہ تھی حسن تدبیر پر کام ہوتا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی نوکر کسی شخص سے اس کے حقہ پینے کے زبردستی حقہ اٹھالے، ادب سے ٹھہر کر عرض کرتا سرکار مجلس شروع ہونے کا وقت آگیا اجازت ہے؟ جب زبان سے یا سر سے اشارہ ہوتا

اس وقت حقہ اٹھتا۔ یہاں کے برخلاف ۹ محرم کو جنت مآب کے امام بارہ میں ہر سو مدریہ حقہ وہاں مجمع کی یہ کثرت اور سامعین کا وہ اژدہام ہوتا تھا کہ ڈیرخمہ حقہ رکھنے کی جگہ نہ تھی لوگ زانو پر مدریہ حقہ رکھ کر بیٹھتے تھے ہدایت علی ولد موسیٰ رضا داروغہ مونڈھے پر بیٹھے ہوئے انتظام میں مصروف قدیم تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ شہر میں عہد شاہی سے یہ رواج تھا کہ مشاعرہ میں چند حقے جنہیں شمع کی طرح صاحبان ذوق کے روبرو پیش کئے جاتے تھے مرزا حیدر صاحب ایک رئیس اعظم نے یہ دریا دلی اختیار کی کہ وہ جس مجلس یا مشاعرہ میں مدعو ہوں اور تشریف لیجائیں ان کے ساتھ ان کا حقہ آئے اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی حقہ ہمراہ ہوں رفتہ رفتہ ان کی شہرت ہوئی اور اوسط طبقہ ان کو صرف اسی لئے مدعو کرتا تھا کہ وہ حقہ کے انتظام سے سبکدوش ہوجاتے۔ مدریہ حقہ عظیم اللہ خاں کی یادگار ہے جو بادشاہ کا باربرتھا۔ حسین آباد کا خوب صورت امام باڑہ لکھنؤ میں ان کے ذوق انجنیری کا نمونہ ہے چولکھی کی عمارت قیصرباغ میں انقلابات کی زد میں آکر ختم ہوگئی کربلا نیم انہدام کی صورت میں اب بھی ہے اور کچھ اس کے خاندان کے ممبر ہیں جو وثیقہ پارہے ہیں مدریہ حقہ کی ایجاد کے بعد سے محفل میں جتنے حاضرین ہوتے اتنے ہی حقے اس کی صورت یہ تھی کہ قد و قامت میں چھوٹے بڑے مجمع میں جگہ کم گھیرنے والا افقط دو نرکل سیدھے جڑے ہوئے۔ چلم بھی سادی اور چھوٹی یعنی روغنی نہیں۔ قیمت کے لحاظ سے بھی بہت ہی کم اکبری دروازہ کے مسقف دوکانوں میں مع چلم اور تنباکو بھرا ہوا دو موٹے پیسہ کو ملتا تھا موٹا پیسہ ملکہ وکٹوریہ کے پیسہ سے پہلے جاری تھا اس حقہ کی نظری تصویر یہ ہے

اسد اللہ خاں غالب مرحوم نے منشی ہرگوبند سہائے کو جو خط لکھا ہے اس تحریر میں مدریہ حقہ کا ذکر کر

دیکھو خطوط غالب

وہ قادر الکلام ادیب لکھنؤ کی یاد میں رقمطراز ہے۔ "ہم تو آپ کو سکندر آباد

قانون گویوں کے

محلہ میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی مطبع اودھ اخبار میں

بیٹھے ہوئے مدار چہچہ

لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نول کشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔"

پرانی تصویروں میں جو عہد قدیم کی یادگار ہیں مشاہیر قوم کے سامنے حقہ بھی ہوتا تھا مشکور الدولہ لکھنو کے پہلے، فوٹوگرافر کے تیار کردہ کئی فوٹو حقہ کے ساتھ میرے سامنے ہیں۔ پر تکلف صحبتوں اور ہنسی مذاق میں انسان پر پھبتی میں بھی حقہ کی یاد تھی چنانچہ لکھنؤ کے ایک کہنہ مشق حکیم پر ریشمی نیچہ کی پھبتی تھی۔

میں حقہ نہیں پیتا اس لئے میری یہ ناقص تحریر تحفظ آثار قدیمہ کے جذبہ میں کافی نہیں ہے بھارت سے حقہ رخصت ہوگیا پنجاب میں یہ ذوق باقی ہے امید کہ کوئی دوسرا محقق جو باتیں موضوع میں رہ گئی ہیں ان پر قلم اٹھائے گا۔

عبدالمجید حیرت

بہارِ تغزل

محبت سے دنیا کو کد ہو گئی! ؏ خیالاتِ فاسد کی حد ہو گئی

تعجب تو یہ ہے کہ اس دور میں ؏ خرد اس قدر بے خرد ہو گئی

جہالت نے جس نے بھی جو کہہ دیا ؏ روایت وہی مستند ہو گئی

ہماری وفا بھی عجب چیز ہے ؏ جہاں لے گئے مستند ہو گئی!

قبول آپ کی التجا ہو تو ہو ؏ ہماری گزارش تو رد ہو گئی

ہمیں جب نہ ہونگے تو کیا اس کا غم ؏ کہ برباد خاکِ لحد ہو گئی

زمیں بھی تو دشوار، حیرت، مگر
غزل یہ بہ یادِ اسد[1] ہو گئی

امید ڈبائوی

یہ غم دل کے لئے کچھ کم نہیں ہے
کہ دل ہے اور دل میں غم نہیں ہے

شکستہ ہو کے قیمت کم نہیں ہے
یہ میرا دل ہے جامِ جم نہیں ہے

میری توبہ کا غم کچھ کم نہیں ہے
بظاہر چشمِ ساقی نم نہیں ہے

محبت اصلِ دو عالم ہے لیکن
محبت کا کوئی عالم نہیں ہے

نہ دے دُنیا مجھے مژدہ خوشی کا
خوشی سب کچھ ہے لیکن غم نہیں ہے

خدا کی شان اب وہ ناخدا ہیں
سرِ دامن بھی جن کا نم نہیں ہے

ہنسی کے ساتھ آجاتے ہیں آنسو
خوشی بھی پردہ دارِ غم نہیں ہے

اُمید اُس پر نوازش کیوں ہو غم کی
جسے توفیقِ ضبطِ غم نہیں ہے!

ماہر القادری

حسن والو تمہاری بھی کیا بات ہے
ہر ملاقات پہلی ملاقات ہے

میرے اشکوں سے بھیگی ہوئی رات ہے
دِل کی دھڑکن نہیں ہے مناجات ہے

حسن اپنی جگہ چاہے کچھ بھی سہی
عشق کو بھی تو پاسِ روایات ہے

ہر طرف لغزشیں ہر طرف شورشیں
سیرِ دنیا کہ سیرِ خرابات ہے

ہے تغافل مگر جورِ نا آشنا
ہے توجہ مگر بے مدارات ہے

رُوئے روشن پہ گیسو ہیں بکھرے ہوئے
دوپہر کا سماں اور برسات ہے

بے ارادہ مرے گھر جو آپ آ گئے
یہ مرے جذبِ دل کی کرامات ہے

پرسشِ غم وہ کرتے ہیں اس شان سے
جیسے یہ بھی کوئی راز کی بات ہے

دل تھا بہار پر یہ ہے اگلے برس کی بات
اب آشیانے میں بھی نہیں ہے قفس کی بات

کیوں میرا ذکر آئے کسی بزمِ ناز میں!
پھولوں کی انجمن میں ہو کیا خار و خس کی بات

بیمارِ شامِ غم کو ہو مژدہ سکون کا
اب رہ گئی ہے صرف نفس دو نفس کی بات

ممکن نہیں کہ عشق میں رُسوا نہ ہو کوئی
مجنوں کے بس کی بات، نہ لیلیٰ کے بس کی بات

[1] حضرت اسد ملتانی مرحوم

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

روحِ انتخاب

ہر زمانے میں کچھ ایسے لوگ رہے ہیں جو قرآن مجید کو اپنی کتاب اور ایک زندہ کتاب سمجھ کر پڑھتے تھے اور اس میں اپنے کو تلاش کرتے تھے اور تھوڑی کوشش سے پا لیتے تھے، آیئے ہم آپ کو ایک ایسے ہی بزرگ اور ان کی تلاش کا قصہ سنائیں۔

احنف بن قیس ایک بہت بڑے عرب سردار تھے، مشہور تھا کہ اگر احنف کو غصہ آتا ہے تو ایک لاکھ تلواروں کا غصہ آجاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تو انھوں نے نہیں کی مگر آپ کی زیارت کرنے والوں کی زیارت کی اور ان کے ساتھ رہے خاص طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہ کے بڑے معتمد اور مخلص تھے۔

...... ایک دن کسی قاری نے یہ آیت تلاوت کی :-

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔　　(سورہ انبیاء ع ۵)

"ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے۔ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔"

عربی ان کی زبان تھی۔ سن کر چونک پڑے۔ گویا نئی بات سنی، کہنے لگے ہمارا تذکرہ؟ ذرا قرآن تو لاؤ۔ دیکھوں میرا کیا تذکرہ ہے اور میں کن لوگوں کے ساتھ ہوں؟

قرآن مجید آیا اور لوگوں کی صورتیں ان کے سامنے سے گزرنے لگیں ایک گروہ آیا جس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور آخر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور اُن کے مال میں سائل اور محروم کا حق تھا۔

پھر کچھ ایسے لوگ آئے کہ جن کا حال یہ تھا :-

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (الم سجدہ ع ۲)

"اُن کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں، وہ لوگ اپنے رب کو امید اور خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں سے خرچ کرتے ہیں۔"

پھر کچھ ایسے کہ :-

يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۔　　(الفرقان ع ۶)

"راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدے اور قیام میں لگے رہتے ہیں۔"

پھر ایک ایسا قافلہ گزرا جس کی شان یہ تھی کہ :-

يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران)

"خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ کو ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے"۔

ابھی نظر بھر کر ان کو دیکھ نہیں سکے تھے کہ کچھ ایسے جواں مرد آگئے جن کا عالم یہ تھا:۔

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ كَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ ۔ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِكَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان کو تنگی و فاقہ ہو اور (واقعی) جو اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے وہ بڑا کامیاب ہے"۔

یہ ابھی یہیں تھے کہ ایک دوسرا نمونہ سامنے آیا۔

یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ہُمْ یَغْفِرُوْنَ ہ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ (الشوریٰ ۴۲)

"جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز کے پابند ہیں اور اُن کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔

حضرت احنف اپنے کو پہچانتے تھے، کہنے لگے خدایا میں تو ان میں کہیں نظر آتا۔

اب انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، اس راستے میں ان کو اور طرح طرح کے آدمی نظر آنے لگے۔ ایک بھیڑ ملی جس کا حال یہ تھا۔

اِذَا قِیْلَ لَہُمْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَسْتَكْبِرُوْنَ ہ وَیَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ۔

"جب اُن سے کہا جاتا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو تکبر کیا کرتے اور کہتے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ کی وجہ سے چھوڑ دیں گے۔

اور آگے بڑھے تو کچھ لوگ ایسے ملے کہ:۔

اِذَا ذُكِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِذَا ہُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ہ

جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن لوگوں کے دل مُنقبض ہو جاتے ہیں جو کہ آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے علاوہ اوروں کا ذکر آتا ہے تو اسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

دیکھو ایسے بدقسمت بھی کہ جب اُن سے کہا جائے گا۔

مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ ہ —————— (مدثر رکوع ۲)

"تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا"۔ تو وہ جواب دیں گے:۔

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ہ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ ہ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ ہ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ہ حَتّٰٓی اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ ہ (المدثر ۲)

"ہم نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ غریب کو کھلایا کرتے تھے اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ خود بھی مشغول ہوجاتے تھے اور ہم آخرت کا انکار کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو موت آگئی۔"

احنف یہ صورتیں دیکھ کر گھبرا گئے، کہنے لگے خدایا ایسے لوگوں سے تیری پناہ! میں ان سے بیزار ہوں اور مجھے ان سے کوئی تعلق نہیں ۔

وہ اپنے متعلق نہ تو دھوکے میں تھے اور نہ ایسے بدگمان کہ اپنے کو مشرکوں اور باغیوں میں سمجھ لیں، وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی دولت دی ہے، ان کا مقام بہت بلند نہ سہی مگر ان کی جگہ مسلمانوں ہی میں ہے ان کو ایسی صورت کی تلاش تھی جس کو وہ اپنی کہہ سکیں۔ ان کو اپنے ایمان کا یقین بھی تھا اور اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا علم بھی۔ اور اللہ کی رحمت اور مغفرت پر بھروسہ بھی۔ نہ ان کو اعمال پر غرہ تھا نہ خدا کی رحمت سے مایوسی ان کو اس ملی جلی صورت کی تلاش تھی اور اس کا یقین کہ وہ صورت اس جامع و مکمل اس زندہ و تازہ کتاب میں ضرور ملے گی۔ کیا ایسے خدا کے بندے نہیں ہیں جو ایمان کی دولت بھی رکھتے ہیں، اپنے گناہوں اور تقصیروں پر شرمندہ بھی ہیں۔ کیا خدا کی رحمت ان کو محروم رکھے گی، کیا اس کتاب میں جو سارے انسانوں کے لئے ہے ان کی صورت اور ان کا تذکرہ نہیں ملے گا ایسا نہیں ہوسکتا! جویندہ یابندہ! احنف کو اپنی تلاش میں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے اللہ کی اس کتاب میں اپنے کو ڈھونڈ نکالا۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ٥ (التوبۃ ۱۳)

"اور کچھ اور لوگ ہیں جن کو اپنی خطاؤں کا اقرار ہے، انھوں نے ملے جلے عمل کئے تھے، کچھ بھلے کچھ بُرے، اللہ سے اُمید ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے، بلاشبہ اللہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والا ہے۔"

اُنھوں نے کہا بس بس میں مل گیا، میں نے اپنے کو پالیا، مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے، مجھے خدا کی توفیق کر جو کچھ نیک اعمال ہوئے ان کا انکار نہیں، ان کی ناقدری نہیں، ناشکری نہیں، مجھے خدا کی رحمت سے ناامیدی نہیں۔

وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ "اللہ کی رحمت سے وہی مایوس ہوسکتے ہیں جو گمراہ ہیں۔"

اِن سب سے مِل جُل کر جو صورت تیار ہو وہ میری صورت ہے۔ اس آیت میں میرا اور میرے جیسوں کا حال بیان کیا گیا ہے اور ان کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قربان اپنے رب کے جس نے اپنے گناہگار بندوں کو فراموش نہیں فرمایا۔

حضرت احنف کی تلاش کا یہ قصہ ختم ہوگیا حضرت احنف دنیا سے چلے گئے اور اپنے پیدا کرنے والے کے پاس پہنچ گئے، مگر یہ کتاب موجود ہے اور قیامت تک رہے گی، تو ہم اگر اپنے کو اس میں تلاش کریں تو پالیں گی جماعتیں اور مختلف طبقے اگر اپنے کو اس آئینے میں دیکھنا چاہیں گے تو دیکھ لیں گے، افراد، ہم اور آپ اگر اپنے کو تلاش کرنے نکلیں گے تو انشاء اللہ ناکام واپس نہیں ہوں گے۔ حضرت احنف ہم کو سچی تلاش کا ایک نمونہ دکھلا گئے، اور قرآن پڑھنے اور اس پر غور کرنے کا صحیح طریقہ سکھا گئے ہمیں اس نمونہ اور تعلیم سے فائدہ اٹھا کر قرآن مجید کا مطالعہ شروع کرنا چاہیے۔

ہماری نظر میں!

الادب المفرد تالیف عربی :- محدث اعظم امام بخاریؒ - ترجمہ اردو :- مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی
پیش لفظ :- مولانا مفتی محمد شفیع، ضخامت ۵۶۸ صفحات، مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت :- بارہ روپے
ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت، مولوی مسافر خانہ، بندر روڈ، کراچی ۱
لاھور میں :- ادارۂ اسلامیات، نمبر ۱۹۰ انارکلی، (لاہور)

"الادب المفرد" حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۴ھ - ۲۵۶ھ) کی مشہور و مقبول تالیف ہے جس میں امام موصوف نے اخلاق و معاشرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث جمع کی ہیں، اس کتاب میں ایسی روایات بھی ملتی ہیں، جو احادیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ہیں، مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی (مظاہری) نے "الادب المفرد" کا ترجمہ سلیس اور عام فہم اردو میں کیا ہے!

"الادب المفرد" مسلمانوں کی زندگی کا وہ نظام العمل ہے، جس کے نتیجے میں انہیں دنیا کی سربلندی اور آخرت کی نجات و فلاح میسر آسکتی ہے، دین نام ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہے جس راہ میں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہی صراطِ مستقیم ہے جناب محمد رضی عثمانی نے اس کتاب کو شائع کرکے، دین کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے اللہ تعالیٰ مؤلف، مترجم اور ناشر کو آخرت میں اجرِ جزیل عطا فرمائے گا! کتاب کے شروع میں مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کا رسالہ "خیر الاصول فی حدیث الرسول" علم حدیث پر مختصر ہے مگر بہت مفید اور کارآمد ہے!

سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ مرتبہ :- وحید احمد مسعود، مجلد (گرد پوش کے ساتھ) ضخامت ۳۲۰ صفحات
قیمت چار روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ :- سلمان اکیڈیمی، حق نشان ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی غالباً یہ پہلی سوانح عمری ہے جو اس قدر تحقیق و تدقیق کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، جناب وحید مسعود نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی درجنوں کتابوں سے استفادہ کرنے کے بعد، اس کتاب کو ترتیب دیا ہے! صاحب موصوف نے حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہ کے قیام وغیرہ کے بارے میں، مورخین کی تحریروں کے مابین محاکمہ فرماکر، اپنی تحقیق کو پیش کیا ہے، کرامات اور بعض دوسرے احوال و کوائف کی تشریح و تفصیل میں کہیں کہیں ان کا انداز فقیہانہ ہوگیا ہے! مگر مجموعی طور پر ان کے افکار پر تصوف کا غلبہ ہے!

اس حقیقت سے انکار کرنے کی کون بدنصیب اور جاہل جرأت کرسکتا ہے کہ حضرت خواجہ اجمیری نے ہندوستان کے ظلمت کدے میں ایمان و اسلام کے چراغ روشن کئے، اور آپ کے انفاسِ قدسیہ نے بھارت کی فضا کو اخلاق کی خوشبو سے معطر کردیا (رحمۃ اللہ علیہ و برد اللہ مضجعہ)

اس اعتراف کے بعد ہم آخرت کی پوری ذمہ داری کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ انسانیت کے لئے معیار کامل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے اور ہمیں اسی اسوۂ مقدسہ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صحابۂ کرام کی زندگیاں ہیں جن میں اسوۂ رسول ؐ پوری طرح درخشاں نظر آتا ہے! اب وہ کوئی فقیہ ہو، محدث ہو، صوفی ہو، عارف ہو، ولی ہو، اس کی زندگی اور اس کے قول و عمل کو ہم اسی معیار پر جانچ کر اور پرکھ کر دیکھتے ہیں اور دیکھنا چاہیے جس کا بھی کوئی عمل اس معیار پر پورا نہ اترے گا تو اُسے رد کر دیا جائے گا، اگر ایسا کرنے میں کسی بڑے سے بڑے ولی کا قول و عمل بھی متروک قرار پا جائے، تو یہ بدنصیبی نہیں، سعادت کی علامت اور جہالت نہیں تفقہ فی الدین اور غیرتِ دینی کی نشانی ہے۔ بزرگوں کے احترام و عقیدت کے بھی حدود ہیں، اُن کے کسی قول و عمل کو کتاب و سُنّت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، ہم اُن کا احترام ہی اس وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ اللہ اور رسول ؐ کے فرماں بردار تھے! اس لئے جہاں کسی کی کوئی بات اور عمل کتاب و سُنّت کے مطابق نظر نہ آئے اور اس کی کوئی تاویل بھی نہ کی جاسکے، تو اُسے بے دریغ رد کر دینا چاہیے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ بزرگانِ دین کی عقیدت میں خاصہ غلو کیا گیا ہے، مثلاً حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کو "مشکل کشا" کہا جاتا ہے، یہ خالص فارسی ترکیب ہے، حضرت ابوتراب علی مرتضیٰ کو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکل کشا کا لقب عطا فرمایا، نہ خود حضرت علی ؓ نے اپنے بارے میں ایسا کوئی دعویٰ کیا اور نہ صحابۂ کرام، تابعین اور محدثین و فقہا اُن کو "مشکل کشا" کہا کرتے تھے، اسی طرح خواجہ اجمیری نے یہ نہیں فرمایا کہ میں "غریب نواز" ہوں، مشکل کشا اور داتا کی طرح عقیدت مندوں نے یہ لقب (غریب نواز) خواجہ صاحب کے لئے تراشا ہے، جسے اس کتاب میں بھی فاضل مصنف نے بار بار دہرایا ہے! مشکل کشا دست گیر، داتا، غریب نواز، اور فریاد رس —— یہ لقب اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو زیب دیتے ہیں!

> "اب جب علمی و تاریخی حیثیت سے اس مسئلہ پر تنقید کی جاتی ہے تو وحدت الوجود بھی علوم حدیث، اصولِ فقہ، ضوابطِ عقائد اور قواعدِ کلام کی طرح بعد کی تفصیلوں میں شامل ہو جاتا ہے" (ص ۴۹)

وحدت الوجود کو ایک حد تک "علمِ کلام" سے تو مشابہت دی جاسکتی ہے مگر "حدیث" و "فقہ" کے علوم جس دینی ضرورت کے تحت مدون کئے گئے ہیں، "وحدت الوجود" کو اس قبیل (CATEGORY) میں شامل نہیں کیا جاسکتا، حدیث و فقہ امت کے خواص و عوام سب کے لئے ہیں مگر "وحدت الوجود" ایک خاص مزاج اور ذوق و وجدان کے افراد سے تعلق رکھتا ہے، اس کے فلسفہ میں بڑی اُلجھنیں ہیں، جس "وحدت الوجود" نے "انا الحق" جیسا نعرہ لگانے والے شخص (منصور حلاج) کو اولیاء اللہ اور عارفوں کی صف میں شامل کر دیا ہو، اُس علم کو حدیث و فقہ کی طرح دینی ضرورت قرار نہیں دیا جاسکتا! محی الدین ابن عربی انتہائی ذہین اور نکتہ شناس صوفی تھے، مگر اُن کی کتابوں میں گل و لالہ کے ساتھ سانپ بچھو بھی لپٹے ہوئے ہیں! وحدت الوجود کا غموض اور اس کی باریکیاں بڑی خطرناک ہیں۔

> "اس لئے کہ مشائخ کے یہاں سلاطین کی طرح وراثت نہیں چلا کرتی" (ص ۵۵)

حالانکہ بغداد، ملتان، گنگوہ، پیرانِ کلیر، اوچھ، ردولی، بانسہ، مارہرہ، بدایوں، گولڑہ، تونسہ، ساڈھورہ، گلبرگہ، بریلی وغیرہ مقامات پر خانقاہوں، درگاہوں اور طریقت کے سلسلوں میں خاندانی وراثت ہی کا رواج ہے۔ اور بادشاہوں کی طرح اُن کے ناموں کے ساتھ "شاہ" لکھا جاتا ہے اور ایک شیخ جب وفات پا جاتا ہے، تو اُس کے بیٹے، بھائی اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں

کسی قریبی عزیز کی گدی نشینی کی باقاعدہ رسم ادا کی جاتی ہے۔

"داراشکوہ حضرت میاں میر کے خلیفہ ملا بدخشانی کا سلسلہ قادریہ میں مُرید تھا، اس کا ذوق تصوف اس کی تصنیف سفینۃ الاولیا اور مجمع البحرین وغیرہ سے ظاہر و ثابت ہوتا ہے اور یہی ذوق وراثت سے محروم کئے جانے کا باعث ٹھیرا۔" (ص۶۶)

تصوف اور وحدت الوجود اگر "داراشکوہ" جیسے انسان پیدا کرتے ہیں، تو یہ علوم دینی اعتبار سے گریز و اجتناب کے مستحق ہیں "داراشکوہ" ہندو ویدانت سے بہت کچھ متاثر تھا۔ محی الدین عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی بجائے اگر خدانخواستہ وہ تخت نشین ہو جاتا، تو جلال الدین اکبر کا گمراہ کن دور واپس آجاتا، اور اسلامی عقائد کو بُرے دن دیکھنے پڑتے۔

صفحہ ۸۲ پر مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "نفحات الانس" سے ایک مجذوب (ابراہیم قندوزی) کا واقعہ نقل کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجذوب صاحب کتب خانہ کی جلدوں کے پٹھے رات کی تنہائی میں توڑ کر کھا گئے! اس مزاج و فہم کے آدمی بھلا کہیں تحسین کے مستحق ہیں!

"مجذوب چونکہ مغلوب الحال ہوتا ہے، اس لئے ذمہ داری نہیں لیتا، وہ محض دست گیری کر دیا کرتا ہے۔"

جن لوگوں کو خود ہی سر پیر کا ہوش نہ ہو وہ کسی کی رہنمائی کیا کریں گے!!

"چشتیوں کا اصول ہے کہ جس کا خود ہاتھ پکڑتے ہیں، اس کو اسی وقت اپنی روحانیت سے اس کا آخری مقام دکھا دیتے ہیں۔۔۔" (ص۹۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے ایسی کوئی روایت سننے میں نہیں آئی کہ کسی سے بیعت لیتے وقت اس کا آخری مقام اسے دکھا دیا گیا ہو! کیا مشائخ چشت "عالم الغیب" ہوتے ہیں، جو انہیں اپنے مریدین کے آنے والے احوال و واقعات کی خبر ہوتی ہے اور ہر شخص کا مستقبل اُن کے سامنے ہوتا ہے۔

"تو سب لوگ سات شب و روز وجد و رقص میں رہے اور برابر یہی اشعار پڑھواتے رہے، ایک درویش زمین پر گر کر ایسے بے ہوش ہوئے کہ درمیان سے غائب اور لاپتہ ہو گئے" (ص۱۰۲ بحوالہ دلیل العارفین)

سات دن برابر وجد و رقص کے یہ معنیٰ ہوئے کہ ان صاحبانِ وجد و حال نے نماز ادا نہیں کی، نماز ادا کرتے تو "وجد و رقص" کے تسلسل میں فرق آجاتا! کیا ایسی باتیں کتاب و سنت کی تعلیمات سے مطابقت کرتی ہیں؟ حیرت و افسوس ہے کہ پچھلی کتابوں کے لکھے ہوئے واقعات کو اُن کی مضرتوں کا احساس کئے بغیر، بلاتکلف نقل کر دیا جاتا ہے۔

"جب حضرت عمر فاروق رضی ایران کے مالِ غنیمت کو تقسیم کرتے وقت گریہ فرما رہے تھے کہ دولت ایمان کی کمزوری کا باعث ہو گی، تو اس وقت قوم و ملت حصولِ دولت پر آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی" (ص۱۳۳)

مصنف کے قلم سے یہ بڑی غلط بات نکل گئی ہے۔ اس عبارت کا آخری جملہ صحابہ اور تابعین پر طنز ہے۔ توبہ! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا گریہ اس لئے تھا کہ مال و دولت میں الجھ کر، ایمان و اسلام کے تقاضوں سے مسلمان غافل ہو جاتا ہے!

اپنے دور کے مسلمانوں کے ایمان کو آپ نے کمزور نہیں کہا۔

"حضرت ابن عربی کا بیان ہے کہ متعدد جہان پیدا کئے گئے ہیں ہر جہان اور دنیا کا آدم اور خضر جدا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ روحانی طور پر مختلف زبانوں کے باوا آدموں اور خضروں سے انھوں نے خود ملاقات کی ہے۔" (ص ۱۵۵)

ابن عربی کے فلسفۂ تصوف کی طرح اُن کے سیر و مشاہدہ بھی عجیب ہیں! کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟!

"ان آنکھوں میں نیند کا گزر نہیں تھا، بینیٔ مبارک عرشِ عظم کا دم بھرتی تھی، بھنوئیں تیغ اصفہانی بن کر ان میخانوں کی پاسبانی کرتی تھیں، کشادہ پیشانی میں دشتِ حیراں کی وسعت تھی۔" (ص ۱۶۲)

حضرت خواجہ اجمیر کا یہ حلیہ بیان کیا گیا ہے! اس میں کس قدر تکلف اور آورد پائی جاتی ہے!! خواجہ صاحب یقیناً شب بیداری فرماتے ہونگے مگر کچھ دیر سوتے بھی ہونگے اس لئے یہ کہنا کہ "ان آنکھوں میں نیند کا گزر نہیں تھا" مبالغہ ہے

"بُت پرستی کو تصورِ شیخ عطا کرکے روحانی بنا دینا، اور شرک سے بچا لینا معمولی بات نہیں۔" (ص ۱۵۰)

"تصورِ شیخ" کو بت پرستی کا بدل، اُس کی ترقی یافتہ صورت یا اُس کی بدلی ہوئی ہیئت تسلیم کرکے، مصنف نے "تصورِ شیخ" کی کمزوری کا اعتراف کرلیا!

"تعلیم چشتیہ اور خواجہ بزرگ" جس باب کا عنوان ہے، اُس کے تحت فارسی کا یہ شعر۔

عشق را بوحنیفہ درس نہ کرد   شافعی را در و روایت نیست

درج کیا گیا ہے! اس میں حضرت ابوحنیفہ اور حضرت شافعی (رحمہما اللہ تعالیٰ) کی ذم اور منقصت کا پہلو نکلتا ہے! اگر "عشق" سے مراد "محبت الٰہی" ہے تو امام ابوحنیفہ نے اُس کی تعلیم دی ہے اور امام شافعی بھی اُس کے مبلغ ہیں! اور اگر "عشق" سے مراد منصور حلاج جیسے مجہول لوگوں کا جذب اور غلبۂ حال ہے، تو ابوحنیفہ اور شافعی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان تہمتوں سے مبرا ہیں!

"خلوص کی معراج یہ ہے کہ عقبیٰ بھی محو ہو جائے، یہی شیوۂ تسلیم و رضا ہے۔" (ص ۱۸۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام عقبیٰ کو یاد رکھتے تھے اور اللہ سے دعا کیا کرتے تھے کہ دنیا اور عقبیٰ میں انہیں بھلائی (جنت) میسر آئے۔ قرآنِ پاک میں اس دعا کی تعلیم دی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے بڑھ کر کس مسخرے کو خلوص کی معراج حاصل ہو سکتی ہے کہ "عقبیٰ" کا تصور ہی سرے سے محو ہو جائے! جس استغراق کا مآخرت فراموشی نتیجہ ہو وہ خدا اور رسول کے نزدیک مردود ہے!

"چتوڑ کے بعد اکبر نے پیادہ پا سفر کرکے سوا سو من چاول کی بڑی دیگ نذر کی۔" (ص ۳۰)

شہنشاہ اکبر کا پیادہ پا خواجہ صاحب کی قبر کی زیارت کے لئے اجمیر کا سفر کرنا غلو عقیدت کی بڑی مثال ہے! قبر پرستی کو بعض بادشاہوں نے بھی خاصہ فروغ دیا ہے اور "سُنّتِ ملوک" کو یار لوگوں نے دین سمجھ لیا۔

اس کتاب میں حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور گنبد کی تفصیل دی گئی ہے کہ کس نے مزار کے تعویذ

پر صندل کی مسہری چڑھائی، کس نے سونے کا کلس نذر کیا اور کس صاحبِ دولت نے چاندی کا مجحر بنوایا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے تک سے منع فرمایا ہے، ان عاشقانِ رسولؐ اور صاحبانِ عرفان کو کیا کہیے جنھوں نے قبروں اور گنبدوں کو سونے اور چاندی سے منڈھ دیا ہے۔ مصنف چونکہ تصوف کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے اس قسم کی تمام خلافِ شریعت باتوں میں برائی کی جگہ حسن محسوس کرتے ہیں۔

اولیائے کبار کی اس کتاب میں پیدائش و وفات کے سنین کے ساتھ جو فہرست دی گئی ہے، اُس میں بریلی کے ننھے میاں کا بھی نام درج ہے! اگر یہ صاحب بھی "عارف باللہ" تھے تو پھر۔۔۔۔؟؟

صفحہ ۴۸ پر جو ایک روایت کا ترجمہ درج کیا گیا ہے:۔

"ابوبکرؓ کو جو فضیلت ہے وہ زیادہ نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی وجہ سے نہیں
بلکہ اس راز کی وجہ سے ہے جو اُس کے سینہ میں امانت ہے۔"

یہ حدیث ثابت نہیں ہے (ملاحظہ ہو ملا علی قاری کی کتاب موضوعات)

سماع کے جواز میں جناب وحید احمد مسعود نے بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں! جہاں تک خوش الحانی اور لہجہ کے ترنم کا سوال ہے اس کے جواز میں کوئی شک و شبہ نہیں، مگر مزامیر کے ساتھ غنا بالاتفاق جائز نہیں! معالم التنزیل میں ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، عکرمہؓ اور ابن جبیرؓ سے جو روایت نقل کی گئی ہے اُس میں صاف طور سے "لہو الحدیث" سے مُراد غنا، مزامیر اور معازف ہیں، مغنی، کشاف، مدارک اور ثعلبی وغیرہ تفاسیر میں بھی ان چیزوں کی حرمت مذکور ہے

فتاویٰ عالمگیری میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "سماع رقص جو آجکل کی ہمارے صوفیا کا معمول ہے حرام ہے، اس کا انسان کو نہ ارادہ کرنا چاہیے نہ (ایسی محفل میں) بیٹھنا چاہیے۔" (فارسی سے اُردو ترجمہ)

"الغناء ینبت النفاق کما ینبت ماء الزرع (شعب الایمان، بیہقی)

"لیکن بھان متی کی طرح رشتہ جوڑا ہے۔" (ص۱۷) کہاوت یوں ہے "کہیں کی اینٹ۔ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا"۔ "حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کی لغویات کو نہ سمجھا۔" (ص۳۴) کمزور اور ناپختہ اندازِ بیان۔ "مولانا اور مولوی اشرف علی تھانوی نے اپنی ناخدائی ثابت کر کے دکھا دی" (ص۶۷) "ناخدائی کا ثابت کرنا" یہ آخر بات کیا ہوئی! "امیر علی نے اسپرٹ آف اسلام میں سالِ وصال ۶۲۳ھ کیسے لکھدی ہے (ص۷۵) "سال" مذکر ہے۔ "خواجگانِ چشت کا دستور ہے کہ اڑتی چڑیا کے پر کتر لیا کرتے ہیں۔" (ص۸۹) روزمرہ "اڑتی چڑیا کے پر گننا" ہے!

شکستِ شب

از:۔ محسن بھوپالی، ضخامت ۱۱۲ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:۔ فن کدہ، کھنڈی سڑک حیدرآباد (چوک)

جناب محسن بھوپالی جواں سال شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں زندگی کا ولولہ اور جذبات کی گرمی پائی جاتی ہے! محسن کا لہجہ اور آہنگ جوانی کی طرح تند و تیز ہے، اُن کا تغزل دل نشین ہے اور اُن کی نظموں میں تنوع ملتا ہے! چند منتخب اشعار:۔

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھئے — منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے
بخش کر راہزن کو راہبری — محو ہیں انتظارِ منزل میں

موت ارزاں ہوئی ہے جن کے طفیل
ہم اُنہیں زندہ باد کہتے ہیں

ہیں ستم خوردہ بہت عدل کی زنجیر نہیں
قصرِ انصاف تو ہے کوئی جہانگیر نہیں

چاکِ داماں نہ ہوا جشنِ بہاراں نہ ہوا
کیا تعجب ہے اگر کوئی غزل خواں نہ ہوا

بنا لیا ہے اُنہیں پھر سے ناخدا ہم نے
جو چھوڑ آئے تھے گرداب میں سفینوں کو

چمن کو مژدۂ فصلِ بہار دے تو دیا
یہ کیا ضرور کہ غنچوں پہ بھی نکھار آئے

فریبِ کار زمانے سے ڈر رہے ہیں ہم
وگرنہ آپ کہیں اور نہ اعتبار آئے

زمانہ ثبوتِ عمل چاہتا ہے
ہیں بے سود قول و قسم بندہ پرور!

تہمت گمرہی سے بچنے کو!
راہبر راستے بدلتے ہیں

ہزاروں دیپ جلا کر جو آپ بجھ جائے
ہم اس چراغ کے بجھنے کا غم نہیں کرتے

ترانے گائے جو مانگی ہوئی بہاروں کے
اسی کو طائرِ شیریں مقال کہتے ہیں

پاکبازانِ خرابات کا یہ طرفہ چلن
مے سے پرہیز بھی ہے مے کے طلبگار بھی ہیں

فن حقیقت ہے اور اظہارِ حقیقت ہے گناہ
سوچتا ہوں کہ گنہگار بنوں یا نہ بنوں

باتوں کے پیچ، زلف کے خم یاد آگئے
ہم شیخ سے ملے تھے صنم یاد آگئے

غیروں کے ظلم کا جو کبھی تذکرہ ہوا
یاروں کے بے شمار کرم یاد آگئے

پا ہی لیں گے منزلیں دشواریوں کے باوجود
کوئی شے راہِ طلب میں کوششِ پیہم بھی ہے

صرف اندازِ بیاں، طرزِ ادا کی بات ہے
داستانِ زندگی واضح بھی ہے، مبہم بھی ہے

گریۂ فرقت میں بھی حسنِ سلیقہ چاہیے
درد کا رشتہ بہت نازک بھی ہے، محکم بھی ہے

میرے سکوتِ لب پہ بھی الزام آگئے
میری طرح چمن میں کوئی بے زباں نہ ہو

کیوں ہو خاموش رفیقانِ چمن کچھ تو کہو
صبحِ گلشن بھی نہ گزرے شبِ زنداں کی طرح

لذتِ درد کو اربابِ ہوس کیا جانیں
لذتِ درد کہ ارزاں نہیں، درماں کی طرح

ان جفاؤں میں اک اندازِ دل آرائی تھا
اتنے محروم تو نہ تھے، تیرے کرم سے پہلے

دستِ ساقی سے سبو ہم نے ہی بڑھ کر چھینا
تشنہ لب اور بھی تھے بزم میں ہم سے پہلے

انہی سے سلسلۂ صبح تو بھی ملتا ہے
سیاہ بخت سہی، روشنی کے دیوانے

یوں بھی آتی ہے، کبھی دل کے دھڑکنے کی صدا
دیر کا بچھڑا ہوا دوست پکارے جیسے

سوچا تھا کہ اس بزم میں خاموش رہیں گے
موضوعِ سخن بن کے رہی کم سخنی بھی

چلے تھے وادیٔ گلپوش کی تمنا میں
ہمارے ذہن میں کانٹوں کا سلسلہ تو نہ تھا

یہ ایک شب کا چراغاں، یہ ایک دن کی بہار
خطا معاف ہمارا یہ ۔ تو نہ تھا

کاکلِ گیتیٔ دوراں کی خبر لے اے دوست
زلفِ جاناں تو بہر حال سنور سکتی ہے

پہونچ کے یوں سرِ منزل بھلا دیا تم نے
میں ہم سفر تھا، تمہارا غبارِ راہ نہ تھا

میرے سکوتِ لب پہ بھی الزام آ گئے !　　　میری طرح چمن میں کوئی بے زباں نہ ہو

دوسرا رُخ :-　مژدۂ عام ہے تکمیلِ تمنا کر لو　　　تشنگیٔ نگہہ شوق کا چارا کر لو　(ص۱۲)

پہلا مصرعہ بھی کمزور ہے اور "تشنگیٔ نگہِ شوق کا چارہ کرنا" ناپختہ اندازِ بیان ہے

منتظر تھے تو سینک لو آنکھیں　　　لے کے حسن و شباب آئے ہیں　(ص۱۴)

فکر و خیال بھی نارسیدہ اور "اظہار" بھی نومشقوں کا سا!

جو کہیں اُس پہ کاربند رہیں　　　ہو نہ شکوہ زبان کٹوا دو　(ص۱۶)

دوسرا مصرعہ کتنا بچکانہ ہے۔

علم کے بیوپاریو! نکتہ رسو! دانش ورو　　　عارضی فرمانروا، محلاتی رہبرو!　(ص۲۰)

پہلا مصرعہ خاصہ جاندار ہے، مگر مصرعہ ثانی میں "محلاتی رہبرو" شعر کی نزاکت پہ بار ہے!

چند تنکوں سے بھلا طوفان رُکتا ہے کہیں　　　عزم مستحکم بروئے جبر جھکتا ہے کہیں

کاش! مصرعہ ثانی، پہلے مصرعہ کے جوڑ کا ہوتا۔

جو قدم راہِ طلب میں بڑھ گئے رکتے نہیں　　　کٹ تو سکتے ہیں، مگر منزل بدل سکتے نہیں

حیرت ہے کہ اس شعر میں "رُکتے" اور "سکتے" کو ہم قافیہ قرار دیا گیا ہے۔

زرد رُخسار، چشمِ نم دیکھو　　　خشک بالوں کی برہمی دیکھو
دیکھ کر قصرِ مرمریں اپنے　　　کہنہ قبروں میں زندگی دیکھو
جن سے بنی ہے دولت و عشرت　　　ایسے پیمانے توڑ بھی ڈالو　(ص۲۴)

ایسے بھرتی کے شعر نظموں سے یکسر خارج کر دینے چاہئیں تھے۔

× کتنے غنچوں کے تبسم کو چرایا تم نے　　　کتنے پھولوں کو سرِ دار سلایا تم نے　(ص۳۳)

پھولوں کو "دار و رسن" سے کیا تعلق؟

دامن و گریباں میں امتیاز باقی ہے　　　فصلِ گل نہیں آئی، یا جنوں میں کاہش ہے　(ص۴۰)

"جنوں میں کاہش ہے" یہ کیا اندازِ بیان ہے!

جو اہلِ ہوس کے تصرف میں لالہ زار آئے　　　بتاؤ اہلِ چمن کیسے پھر بہار آئے　(ص۴۴)

اگر لالہ زاروں پر اہلِ ہوس کا قبضہ ہو جائے، تو ایسا ہو جانے سے کیا بہار کا آنا رُک جاتا ہے؟

کہاں کہاں نہ پھرے ہم بہار کی خاطر!　　　ملی جہاں پہ بھی کر کے اسیر لائے ہیں　(ص۵۷)

یہ محسن بھوپالی کی نظم (تردید) کا دوسرا شعر ہے۔ اس کے مقابلہ میں پہلا شعر کتنا اچھا ہے۔

ہمارا عزم و یقیں قابلِ ستائش ہے　　　پہاڑ کاٹ کے ہم جوئے شیر لائے ہیں

شاعری میں سارا لطف مفہوم کے اظہار میں حسن و خوبی سے وابستہ ہے۔

رہروانِ رہِ مقصود کی تن آسانی　　　کتنی اُلجھی ہوئی راہوں کو جنم دیتی ہے　(ص۶۴)

شعر میں کس قدر ابہام پایا جاتا ہے؟

اپنی کم مانگی عزم کا بخشا ہوا سم　　　　میں نے لوٹا دیا مانگا ہوا احساسِ الم　　(ص۷۶)

پہلے مصرعہ میں "آورد" کے سوا اور کیا ہے!

جہاں دو کوڑی کے مول بکے ہیں اشکوں کے یاقوت و گہر

وہاں لفظوں کا بیوپار کرو، کیا حاصل چپ چپ رہنے سے　(ص۱۰۰)

"جہاں" اور " وہاں " نے شعر کا سارا حسن خاک میں ملا دیا۔

ہونے ہی والا ہے مکروہ تقدس نیلام　　　　ہو سکے تم سے تو اک آخری بولی دیدو　　(ص۱۰۶)

نیلام کی بولی 'بولی جاتی ہے' بولی دی نہیں جاتی!

صعوبتیں نہ ہوں گر خار زارِ ہستی میں　　　　مہکنے گاتے نظاروں کو کون پہچانے　(ص۱۱۰)

نظاروں کی صفت "مہکنا اور گانا" نام نہاد "ترقی پسندوں" کا ناپسندیدہ اندازِ بیان! اس خامی کے علاوہ شعر میں یوں بھی کچھ نہیں ہے۔

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیباریٹریز لمیٹڈ - کراچی

پاکستان میں تعلیمی نظام کے انقلاب نے علم کی دولت کو غریب و امیر
دونوں کے لیے عام کر دیا ہے
کھلنا نیوز پرنٹ کے تیار کردہ میکینیکل پرنٹنگ اور کریم لیڈ
— کاغذ سازی کی صنعت میں انقلاب کا مظہر ہیں۔
یہ کاغذ سستے ہونے کے علاوہ کثرت سے دستیاب ہیں
چاہے وہ اسکول یا یونیورسٹی کی کتابیں ہوں یا
تفریحی رسائل یہ ہر ضرورت کے لئے بہترین ہیں
کھلنا میکینیکل اور کریم لیڈ ہر قسم کی سستی مطبوعات
کتابوں اور کاپیوں کے لئے نہایت موزوں ہیں
کھلنا نیوز پرنٹ اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے لئے پاکستان بھر میں
کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔
علم
بڑی دولت ہے
کھلنا نیوز پرنٹ مل۔ کھلنا
(مشرقی پاکستان)
زیر انتظام -
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

آدم جی پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
OF QUALITY
آدم جی کاٹن ملز
لانڈھی کراچی

کارمینا

یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہاضمہ اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے، اور جزو بدن ہوکر، خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بے کار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا مشکل ہوجاتا ہے اور جینا دوبھر۔

ہمدرد کی لیباریٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چیدہ جڑی بوٹیوں، اور ان کے قدرتی نمکیات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا 'کارمینا' تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ 'کارمینا' معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔
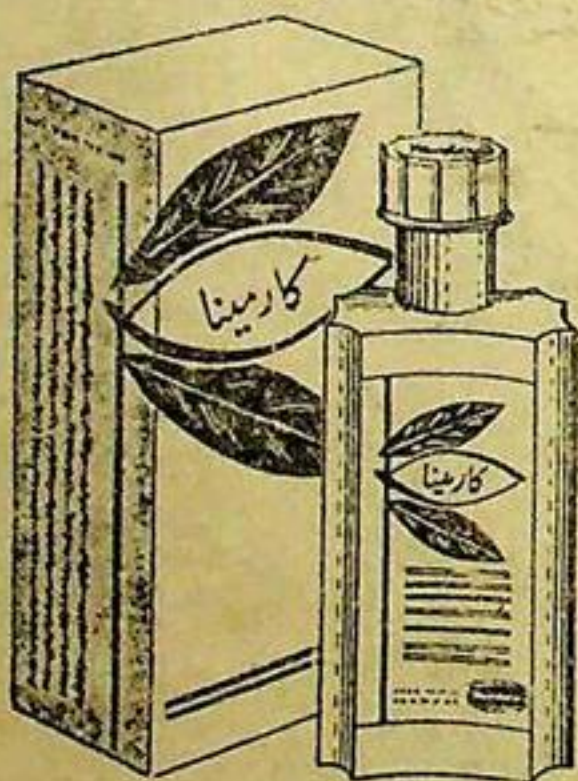
سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، درد شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں کارمینا کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔

'کارمینا' نظام ہضم کو درست اور قدرتی کرنے کی یقینی دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش اور مؤثر ہے۔ بلاخطر استعمال کی جا سکتی ہے۔

کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام